اُلّو ہمارے بھائی ہیں

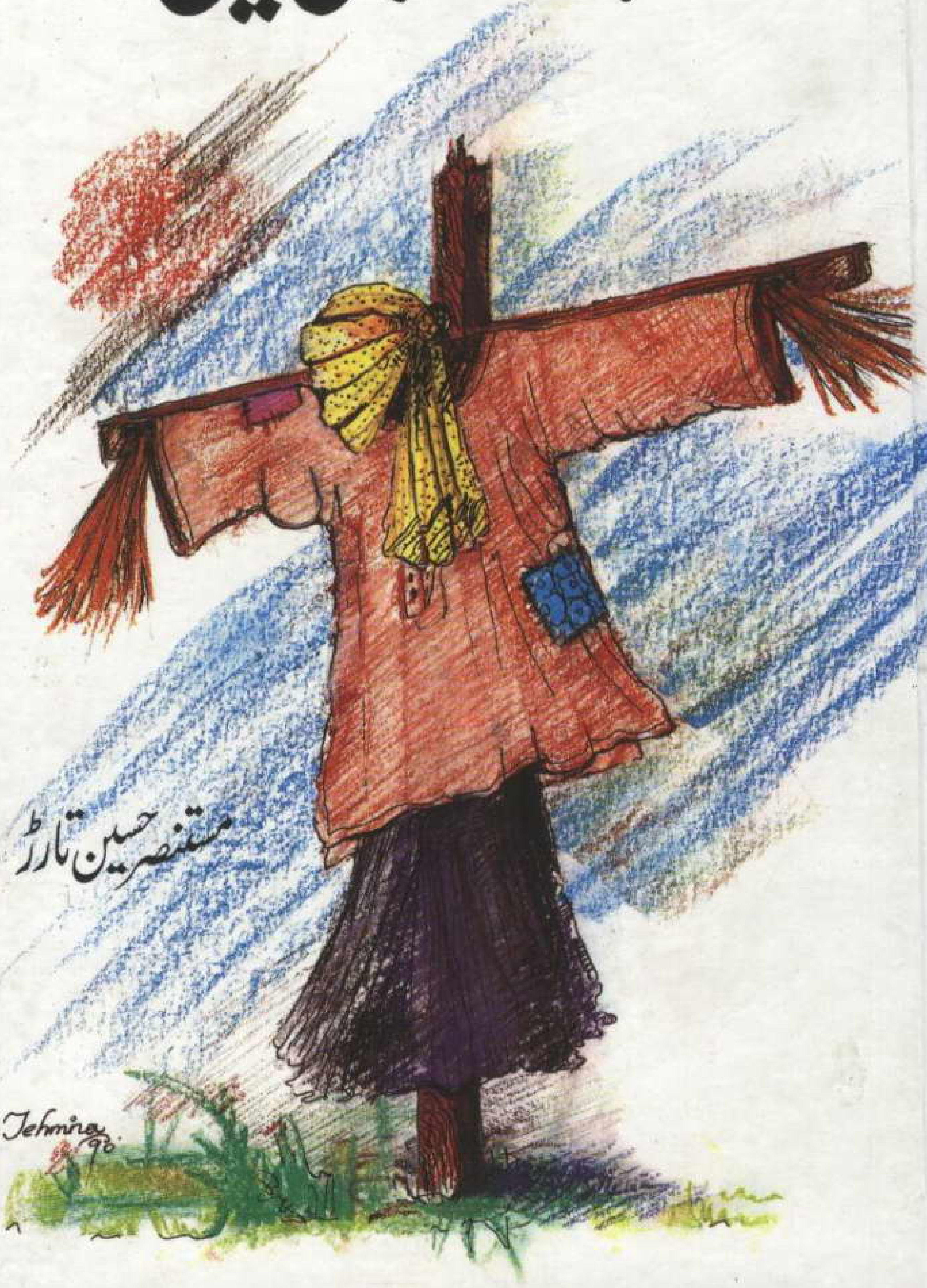

مستنصر حسین تارڑ

فہرست

۱۔ اُلّو ہمارے بھائی ہیں ۹
۲۔ جو بھی تیرے فقیر ہوتے ہیں ۱۴
۳۔ آستینوں میں بُت ۲۰
۴۔ شہر میں کیوں آ گئے ہو راجہ جی ۲۴
۵۔ شکریہ تو ادا کرنا چاہیئے ۲۷
۶۔ پاکستانی رابنسن کروزو ۳۰
۷۔ استنبول کا اکبر خان ۳۸
۸۔ کالا جادو، کھوپڑیاں، سیاہ بچھو اور آفریدی ۴۲
۹۔ دریائی گھوڑوں کو شرم نہیں آتی ۴۷
۱۰۔ ہم سب پیٹو ہیں ۵۲
۱۱۔ الیکشن کہانی ۵۵
۱۲۔ بیس کاروں کا سوال ہے بابا ۶۰
۱۳۔ نیا سال مبارک ۶۳
۱۴۔ خریدا ہوا جن واپس نہیں ہوگا ۶۷

۱۵۔ شیر چاہیئے شیر ۷۱
۱۶۔ پائلٹ اور پلیٹ ۷۵
۱۷۔ تلاش گمشدہ کتا، بلی و نیولاجات ۷۹
۱۸۔ گڈ مارننگ سر عید مبارک ۸۴
۱۹۔ میں نے سگریٹ چھوڑ رکھے ہیں ۸۷
۲۰۔ نباتاتی مریض اور گلا بازی ۹۲
۲۱۔ مایس ہوگی آپ کے پاس ۹۶
۲۲۔ میں بھی انٹرنیشنل ہونا چاہتا ہوں ۹۹
۲۳۔ ماؤنٹ ایورسٹ پر یادیں ۱۰۲
۲۴۔ ہائے میری مرغابیاں ۱۰۵
۲۵۔ پاکی باسٹرڈ ۱۱۰
۲۶۔ بازار حسن یا بازار مجبوری ۱۱۴
۲۷۔ ہم پاکستان کے یار ہیں ۱۱۷
۲۸۔ مائی پھیرے باز ۱۲۲
۲۹۔ کاٹے گھوڑا بیکار رہے جی! ۱۲۸
۳۰۔ لاہور سٹیشن اور سکھ برادران ۱۳۵
۳۱۔ جہاز اور ہوائی جہاز ۱۳۹
۳۲۔ کالی الاؤنس ۱۴۳
۳۳۔ پھول اگانے والے اور پھول بیچنے والے ۱۴۷
۳۴۔ آدھے مسلمانوں کا ملک ۱۵۰

۳۵۔ پبلک جاسوس کھا رہی ہے ۱۵۳
۳۶۔ چڑیا گھر میں رہائش کا مسئلہ ۱۵۶
۳۷۔ مہاتما بدھ کا برگد اور آبشار ۱۵۹
۳۸۔ سکھ شہزادی کا مرتبان اور پاندان ۱۶۳
۳۹۔ عید کرسمس کے نزدیک آرہی ہے ۱۶۷
۴۰۔ مہتاب راشدی، موٹر سائیکل اور سرفراز سید ۱۷۴
۴۱۔ بھولا ہچی اور لپک کھیلیں ۱۷۸
۴۲۔ آجا چھن دے میوے اور لپک کھیلیں ۱۸۴
۴۳۔ موچی دروازے کا مارکو پولو ۱۸۹
۴۴۔ نقاد اور چارپائی ۱۹۵
۴۵۔ باغ بہاراں ۲۰۳
۴۶۔ ابابیلیں گوالمنڈی میں ۲۰۸
۴۷۔ سکھ آئے ہوئے ہیں ۲۱۱
۴۸۔ لوٹ مار سیل ۲۱۶
۴۹۔ بولی بے ایمان ہے ۲۱۹
۵۰۔ جاتی جوکر اور پاکستان ۲۲۳
۵۱۔ تاوان فرنگی اور جنگلی بھینیں ۲۲۷
۵۲۔ بیچ ہائکنگ ۲۳۰
۵۳۔ "آئی لو پاکستان" کا چیچو ۲۳۳
۵۴۔ ہرن مینار اور پیاسے ہرن ۲۳۷

دنیا بھر کے اُلوؤں کے نام

۵۵- قوموں کی ترقی کا پنکچر شدہ ٹائر ۲۴۰
۵۶- اس پلیٹ فارم اور اُس پلیٹ فارم میں فرق ۲۴۳
۵۷- چوٹی گُم ہو گئی ہے ۲۴۹
۵۸- عاشق اور انشورنس ایجنٹ ۲۵۱
۵۹- فینسی ڈریس ۲۵۵
۶۰- ننجا خاکروب ۲۵۹
۶۱- بیگمات اور سیلاب ۲۶۳
۶۲- ایک لنگوری کالم ۲۶۸

"اُلّو ہمارے بھائی ہیں، باقی سب نائی ہیں"

الوؤں میں دلچسپی رکھنے والے باذوق حضرات کے لئے یہ خبر باعث صد مسرت ہوگی کہ یورپ میں ایک ماہر جانوراں نے الوؤں کے بارے میں بے شمار حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔ جب پردہ اُٹھایا گیا تو پردے کے پیچھے بھی الو تھے۔ جو ایک اطلاع کے مطابق، بہ پردے کے پیچھے کیا ہو رہا ہے ..... گا رہے تھے۔ بہر حال ان صاحب نے برسوں کی اُلّو ریسرچ کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اُلّو بس اُلّو ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ الوؤں کے بھی طبقے ہوتے ہیں اور ان میں کچھ کام کرنے والے ہوتے ہیں اور کچھ بس اُلّو کے پٹھے ہوتے ہیں اور کوئی کام نہیں کرتے۔ اسی طرح ان کی تحقیق کے مطابق اُلّو آپس میں گفتگو بھی کرتے ہیں۔

بس ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اُلّو تحقیق پر مناسب توجہ نہیں دی گئی ورنہ ہمارے ہاں اُلّوؤں کی کیا کمی ہے۔ ایک سے ایک بڑھ کر الّو ہے اور بڑا بڑا اُلّو ہے بلکہ ہر شاخ پر اُلّو بیٹھا ہے۔ اگرچہ میں نے الوؤں پر زیادہ تحقیق نہیں کی لیکن کچھ حقائق ایسے ہیں جو خود بخود آشکارا ہوتے گئے ہیں ..... مثلاً یہ کہ الوؤں کی بلکہ پاکستانی اُلّوؤں کی چار قسمیں ہیں ..... پہلے تو دو قسم کے ابتدائی اُلّو ہوتے ہیں۔ یعنی بڑے اُلّو اور چھوٹے اُلّو ..... پھر بڑے اُلّوؤں میں ایک ذرا چھوٹے ہوتے ہیں اور اسی طرح چھوٹے اُلّوؤں میں بھی ذرا چھوٹے اُلّو اور بہت ہی چھوٹے اُلّو ..... ان چار اقسام کے اُلّوؤں میں ایک قدر مشترک پائی جاتی ہے اور وہ ہے اُلّو ہونا۔ ویسے محاورے کے لحاظ سے بڑے الو کا زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً یار وہ تو بڑا اُلّو ہے ..... یاد رہے کہ یہ کبھی نہیں کہا جاتا کہ یار وہ تو چھوٹا اُلّو ہے۔

اُلّو انسانی حماقت کا آنکھیں جھپکتا ثبوت ہے..... اہلِ یورپ اسے عقل و دانش کی علامت کے طور پر اپنی درسگاہوں کی نشانی بناتے ہیں۔ اکثر یونیورسٹیوں کے لیٹر پیڈ پر اُلّو کی شکل بنی ہوتی ہے..... اور ادھر مشرق میں اُلّو کو حماقت کی علامت سمجھا جاتا ہے اور اُلّو اور بے وقوف کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس میں اُلّو کا کوئی قصور نہیں۔ یہ انسان ہے جو ایک پرندے کو بیک وقت عالم اور احمق سمجھتا ہے۔

شفیق الرحمٰن نے "تزکِ نادری" میں ایک اُلّو شناس کا ذکر کیا ہے جو اُلّوؤں کی بولی سمجھتا تھا..... یعنی یہ اُلّو تحقیق جو ہے مشرق میں بہت پہلے ہو چکی ہے اور یہ جواب کہا جا رہا ہے کہ اُلّو آپس میں گفتگو کر رہے ہیں تو یہ نادر شاہ کے زمانے سے چلا آ رہا ہے ظاہر ہے اُلّو شناس اسی لئے اُلّوؤں کی بولی سمجھتا تھا کہ اُلّو بولتے تھے..... نہ بولتے تو بولی کیا خاک سمجھتا...

یوں بھی پاکستان میں بولنے والے اُلّو کثرت سے پائے جاتے ہیں..... مثالیں دے کر واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آپ اپنے آس پاس نگاہ ڈالیں تو آپ کو منہ بولتا ثبوت مل جائے گا۔

ویسے میں نے آج تک اُلّو نہیں دیکھا..... اس پر آپ یہ مت کہئے گا کہ نیچے کیا دیکھ رہے ہو میری طرف دیکھو۔

اُلّو کی آنکھیں بڑی بڑی ہوتی ہیں اور وہ انہیں متواتر جھپکتا رہتا ہے..... اُلّو بنیادی طور پر ایک غیر جذباتی پرندہ ہے اور اسی لئے وہ کبھی بھی اپنی مادہ کے ساتھ چہلیں کرتا نہیں دیکھا گیا جس طرح کہ دیگر پرندے کبوتر اور مرغ وغیرہ کرتے ہیں اور یوں بر سرِ عام کرتے ہیں کہ ان پر فحاشی کے الزام میں مقدمہ درج ہو سکتا ہے..... اُلّو ایسا نہیں کرتا وہ جو کچھ کرتا ہے چھپ کر کرتا ہے۔ ظاہر ہے اگر اُلّوؤں کی نسل جاری ہے تو وہ اس لئے کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ تو کرتا ہے.....

بعض لوگ اُلّوؤں سے شدید محبت کرتے ہیں..... کیوں کرتے ہیں؟ اس لئے کہ وہ

اُلّوؤں سے شدید محبت کرتے ہیں .....

میں ذاتی طور پر اُلّوؤں کے بارے میں غیر جانبدار ہوں..... کیونکہ اگر میں اُلّوؤں کے حق میں بات کروں گا تو مجھ پر اُلّو نواز ہونے کا الزام لگے گا۔ اگر ان کے خلاف بیان دوں گا تو کہا جائے گا کہ لو غریب اُلّوؤں نے اس کا کیا بگاڑا ہے جو ان کے خلاف ہو گیا ہے۔ حالانکہ اُلّو میری نشریات کی میزبانی تو نہیں کر سکتے..... غیر جانبداری میں یوں بھی بڑے مزے ہیں یعنی "رند کے رند رہے اور ہاتھ سے اُلّو نہ گیا"..... اور اگر ہاتھ میں دو اُلّو ہوں تو پھر یہ کہا جائے گا کہ "رند کے رند رہے اور ہاتھ سے اُلّو نہ گئے" اگر اُلّو دو کی بجائے تین ہوں تب بھی یہی فارمولا استعمال ہوگا بلکہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ "رند کے رند رہے اور ہاتھ سے تین اُلّو نہ گئے۔"

اگر اُلّو آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو کس قسم کی گفتگو کرتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اپنی زندگی اپنے نظام اور رہن سہن کے بارے میں ہی بات چیت کرتے ہوں گے۔ اور یہ بھی خیال ہے کہ ایسے باشعور پرندوں کے ہاں الیکشن بھی ہوتے ہوں گے۔ یہ الیکشن جماعتی ہوتے ہیں یا غیر جماعتی اس کے بارے میں کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر الیکشن ہوتے ہیں تو پھر ان میں پسندیدہ امیدوار کے حوالے سے نعرہ زنی تو ہوتی ہوگی..... مثلاً .....

"ساڈا اُلّو آوے ای آوے....."

"ہمارا اُلّو بہترین اُلّو....."

"اُلّو مت بیچئے اور صرف ہمارے اُلّو کو ووٹ دیں۔"

"ووٹ اُلّو کی امانت ہے۔"

"اُلّو ساڈا شیر اے باقی ہیر پھیر اے۔"

"اُلّو ہمارے بھائی ہیں باقی سب نائی ہیں۔"

ان ایمنی نعروں کے علاوہ اُلّو کے انٹرویو بھی اس سلسلے میں اخباروں کی زینت بنتے ہوں گے۔ چنانچہ ایک مختصر اُلّو انٹرویو پیشِ خدمت ہے.....

"آپ کیا ہیں؟

"کیا آپ کو نظر نہیں آرہا کہ میں ایک اعلیٰ کوالٹی کا اُلّو ہوں....."

"آپ اُلّو کیوں ہیں!

"اس لئے کہ میں شتر مرغ نہیں ہوں۔"

"بہت خوب..... یہ فرمائیے کہ آپ کب سے اُلّو ہیں؟"

"کچھ ٹھیک طرح سے یاد نہیں لیکن جب سے ہوش سنبھالا۔ اپنے آپ کو اُلّو پایا....."

"آپ بنائے گئے تھے یا بنے بنائے تھے؟

"ویسے تو میں بنا بنایا تھا لیکن تھوڑی سی کسر رہ گئی تھی اس لئے میں نے اپنے آپ کو تھوڑا سا خود بھی بنا لیا تھا"

"اور آپ عوام کو کیا بنائیں گے؟"

"وہی جو کہ میں خود ہوں..... اُلّو"

"اور کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ سیدھے ہیں.....؟

"میں بالکل سیدھا ہوں اور عوام کو مجھے سیدھا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

"یعنی عوام اپنا اُلّو..... سیدھا نہیں کر سکیں گے.....؟

"جی بالکل....."

"یہ فرمائیں کہ کیا عوام اُلّو بن جائیں گے؟"

"بن جائیں گے کا کیا مطلب.....؟"

"اگر آپ الیکشن جیت گئے تو آپ اس ملک کے لئے کیا کریں گے؟"

"میں نے اس ملک کے لئے کیا کرنا ہے۔ یہ ملک میرے لئے کچھ کرے گا؟..... ویسے

میرا ارادہ ہے کہ جیتنے کے بعد اگر کوئی شاخ خالی نظر آئی تو اس پر بھی اُلّو بٹھا دوں گا.....

"کہیں آپ کو عقلمند سمجھا جاتا ہے اور کہیں آپ حماقت کی علامت ہیں۔ آخر آپ ہیں کیا؟"

"میں صرف اُلّو ہوں اور مجھے اس پر فخر ہے..... اور میرا نعرہ یہ ہے کہ دنیا بھر کے اُلّوؤ ایک ہو جاؤ..... یا کم از کم دو ہو جاؤ"

"شکریہ اُلّو جی..... آپ نے بے حد اُلّوؤں والی باتیں کیں جس کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں....."

"میں آپ کا بھی شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھ ایسے اُلّو کی عزت افزائی کی..... امید ہے آپ ووٹ بھی مجھ کو دیں گے....."

"جی بالکل..... میرا نعرہ یہی ہے کہ "ساڈا اُلّو آوے ای آوے"....

"جو بھی تیرے فقیر ہوتے ہیں"

شہر میں ان دنوں عبدالستار ایدھی کے ان محلات کا بڑا چرچا ہے جن میں فقیر رہتے ہیں..... جی ہاں یہی فقیر اللہ کے نام پر بابا اور دس روزے سے بھوکا ہوں بابا اور اللہ ہی اللہ اور سخی داتا تیرے بچے جیئیں..... والے فقیر حضرات..... ان محلوں میں رہتے ہیں جو کسی گمنام شخص نے ایدھی صاحب کو عنایت کر دیئے کہ انہیں خدمت خلق کے کام میں لایئے..... کوئی ایسا گمنام شخص جو یہ جان گیا کہ بنجارہ لاد چلے گا اور یہ سب کچھ یہیں رہ جائے گا۔ یہ فانوس اور سنگ مرمر کے فرش اور ٹیک ووڈ کا فرنیچر اور ہاتھی دانت کے میز کرسیاں..... تو ان محلات اور فقیروں کے ساتھ ساتھ شہر میں سماجی بہبود کے کاموں پر بڑا زور ہے۔ ہر کوئی اپنی عاقبت سنوارنے کی فکر میں نظر آتا ہے یہ الگ بات ہے کہ عاقبت سنورے نہ سنورے ان کی دنیا سنور جاتی ہے۔ کیونکہ سوشل ویلفیئر یعنی سماجی بہبود کے کاموں میں کمائی بھی بہت ہے۔ بلکہ ایک دوست کا کہنا ہے کہ ہیروئن کی سمگلنگ سے زیادہ منافع بخش کاروبار ہے..... کوئی ٹرسٹ بنایئے حکومت سے امداد لیجئے اور پھر اس میں اپنی مدد آپ کیجئے..... رند کے رند رہے اور ہاتھ سے جنت نہ گئی اور جائے گی کہاں جب تک ہمارے معاشرے میں ایسے ایسے ذہین لوگ موجود ہیں جو انسانوں کو بھی بیچ کھاتے ہیں۔ صرف چند لوگ ہیں جو خدمت کے جذبے سے سرشار ہیں اور باقی لوگ دولت جمع کرنے کے جذبے سے سرشار ہیں۔

بہرحال ان دنوں سماجی بہبود کا کام بہت "ان" ہے۔ ہر کوئی اس فکر میں ہے کہ انسانوں کی خدمت کی جائے۔ چونکہ ہمارے ہاں جب کوئی چیز ٹیلی ویژن پر آجائے تو وہ فیشن بن جاتی ہے۔ اس لیے ادھر عبدالستار ایدھی اور انصار برنی ٹیلی ویژن پر آئے اور ادھر سماجی بہبود کا فیشن چل نکلا..... میرے ایک واقف کار ہیں کوئی

گمنام سا کاروبار کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں کیونکہ مالدار بہت ہیں لیکن مجھے کبھی بھی ان کے کاروبار کی تفصیل یاد نہیں رہتی..... اس لیے گمنام کہہ دیا چنانچہ مالدار ہیں اور نت نئے فیشنوں کی تلاش میں رہتے ہیں تاکہ اپنا مال خرچ کر سکیں۔ اس مرتبہ ملاقات ہوئی تو کہنے لگے۔ "گرمیاں سوئٹزرلینڈ میں گزارنے کا رواج ہوا تو میں وہاں چلا گیا۔ بال بچوں سمیت مری جانے سے تو بہت بہتر ہے اور خرچ بھی دو چار لاکھ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ بھلا ایک بھلے مانس کو اور کیا چاہیئے؟"

"ہاں دو لاکھ کیا شے ہے۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔ "ایک بھلے مانس کو اور کیا چاہیئے!"

"پھر امریکہ جانے کا رواج آگیا..... پچھلے برس لوگ عمرہ کرنے جاتے تھے اور ساتھ میں مصر بھی ہو آتے تھے میں بھی ہو آیا۔ بچارہ کا شوق تو پورا کر چکا۔ ان دنوں مرسڈیز کا فیشن ہے۔ اس لیے اس کا تازہ ترین ماڈل آرڈر کر رکھا ہے..... ویسے آج کل کس چیز کا فیشن ہے؟"

"آج کل؟" میں نے فوراً جواب دیا۔ "آج کل خدمت خلق کا رواج ہے۔"

"کتنے کی ملتی ہے؟" انہوں نے بھی فوراً کہا اور پھر فوراً حیران ہوئے۔ "کس چیز کا فیشن ہے؟"

"خدمت خلق کا۔ انسانوں کی خدمت کرنا ان دنوں فیشن میں شامل ہے..... اسے سماجی بہبود بھی کہا جاتا ہے۔"

"سماجی بہبود" وہ چونک گئے۔ "نہ جی نہ۔ میں باز آیا سماجی بہبود سے۔ یہ تم مجھے کیا مشورہ دے رہے ہو۔ تم دوست ہو کر مجھے سماجی بہبود کی طرف لگا رہے ہو۔ نہ نہ....."

"حرج ہی کیا ہے؟"

"حرج؟" وہ چمک کر بولے "سماجی بہبود نے میری زندگی برباد کر دی..... تم جانتے ہو کہ کاروبار میں آنے سے پہلے میں کون سے محکمے میں ملازم تھا؟ سماجی بہبود کے محکمے میں۔"

"پھر تو تجربہ بھی ہوگا۔"

"خوب تجربہ ہے۔ میں تو ساری زندگی کسی انسان کی مدد نہیں کروں گا۔ مجھے تو انسانوں نے ذلیل کر دیا تھا..... وہ تو قسمت اچھی تھی کہ کاروبار چل نکلا ورنہ میں تو بھوکا مر جاتا۔"

"لیکن قصہ کیا ہے؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"قصہ یہ ہے۔" وہ ذرا کھانس کر بولے اور بولنے سے پیشتر مسکرائے۔ "میں کئی برس پیشتر محکمہ سماجی بہبود میں کام کرتا تھا۔ انسانوں کی خدمت بھی کی جائے اور اس کا معاوضہ بھی مل جائے۔ اس سے بہتر کام اور کیا ہو سکتا ہے۔ ان دنوں حکومت نے مختلف شہروں میں "بیگر ہوم" یعنی فقیروں کے گھر بنائے تاکہ معاشرے سے گداگری کی لعنت کا خاتمہ کیا جائے۔ ان گھروں کے ساتھ زمین تھی اور ہم شہر کے فقیروں کو وہاں لاتے تھے تاکہ وہ خود کام کریں اور حق حلال کی روزی کمائیں۔ ہم بڑی مشکل سے فقیروں کو پکڑ کر لاتے لیکن فقیر اگلی صبح چپت ہو جاتے تھے۔ میں بھی ایک بیگر ہوم کا انچارج تھا ایک روز ہمارے محکمے کے انچارج نے میرا بیگر ہوم دیکھا اور چونکہ وہاں کوئی بھی بیگر نہیں تھا۔ اس نے خوب ڈانٹ ڈپٹ کی کہ کیا بیگر ہوم چلا رہے ہو کہ یہاں ایک بیگر بھی نہیں اور میں ہر ہفتے یہاں آکر چیک کروں گا اور دیکھوں گا کہ تم کتنے فقیر لاتے ہو..... ورنہ نوکری سے چھٹی کروا دوں گا..... اب جناب مجھے تو نوکری کے لالے پڑ گئے..... ادھر کوئی بھی فقیر میرے ساتھ بیگر ہوم آنے کو تیار ہی نہیں ہوتا تھا۔ سارا دن سڑکوں پر فقیروں کی منتیں کرتا رہتا کہ میرے بھائی مجھ پر احسان کرو۔ خدا کے واسطے میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں کھلاؤں گا پلاؤں گا نئے کپڑے لے کر دوں گا لیکن جناب فقیروں کا تو دماغ خراب ہے۔ روزانہ سینکڑوں روپے کماتے ہیں اور عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ کہاں آتے؟ تب میں نے ایک ترکیب سوچی..... میں فقیر کو کہتا۔ بابا جی آج میرے والد کا چالیسواں ہے۔ دیگیں چڑھائی ہیں فقیروں کو کھلانی ہیں اور خیرات بھی ساتھ ملے گی۔ یا یہ کہ آج میرے بچے کا عقیقہ ہے۔ فقیروں کے لیے کھانا اور پیسے بھی ملیں گے۔ فقیر راضی ہو جاتے۔ میں اسے ٹیکسی میں بٹھا کر لاتا اور بیگر ہوم میں بند کر کے باہر تالا۔ جب صاحب نے انسپکشن کی تو صاحب بہت خوش ہوئے کہ ہر طرف فقیر ہی فقیر نظر آ رہے ہیں۔

"تو ان فقیر حضرات نے شور نہیں مچایا کہ ہمیں یہاں زبردستی لایا گیا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"بالکل مچایا بلکہ بہت زیادہ مچایا۔ لیکن فقیروں کی کون سنتا ہے..... یوں بھی فقیر پنجابی بولتے ہیں اور صاحب کو اگر پنجابی سمجھ میں آ جائے تو اس کی صاحبی میں فرق آ جاتا ہے۔"

"تو یہ فقیر تمہارے بیگر ہوم سے بھاگتے نہیں تھے؟"

"بھاگ جاتے تھے کبھی کبھی..... لیکن میں ان کی تعداد پھر سے پوری کر دیتا تھا..... پھر آہستہ آہستہ میں فقیروں کو اغوا کرنے کا ماہر ہو گیا اور مجھ سے ہی دیگر افسران میری خدمات طلب کرنے لگے دراصل انہیں بھی یہی مسئلہ تھا۔ فقیر ملتے نہیں تھے اور حکومت کہتی تھی کہ بیگر ہوم آباد کرو اور جس کا بیگر ہوم آباد نہیں ہوتا تھا اس کی نوکری برباد ہو جاتی تھی۔ چنانچہ میں فقیر سپلائی کرنے لگا۔"

"نہیں" میں نے حیران ہو کر کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"بالکل ہو سکتا ہے اور میں کرتا رہا ہوں..... میں ان دنوں سو روپیہ فی فقیر کے حساب سے چارج کرتا تھا اور فقیر سپلائی کرتا تھا....."

"تو فقیر پکڑنے کے اور کیا طریقے تھے؟"

"طریقے تو مختلف تھے لیکن ان کی بنیاد لالچ تھی..... کیونکہ ہوا یہ کہ آہستہ آہستہ مقامی فقیروں کو میرے ہتھکنڈوں کا علم ہو گیا بلکہ جہاں کہیں بھی انہیں کھانے کے لیے بلایا جاتا وہ وہاں سے غائب ہو جاتے بلکہ ایک دوست کے والد صاحب کی فوتیدگی ہوئی تو انہوں نے شکایت کی کہ جی تم نے قورمے اور پلاؤ کی اتنی دیگیں مزار اور مساکین کے لیے چڑھائیں اور جس غریب یا مسکین کو کہتے تھے کہ آؤ کھانا کھلائیں تو اس کا رنگ پیلا پڑ جاتا تھا اور وہ اچھل کر بھاگ جاتا تھا۔ چنانچہ میں نے شہر سے باہر چھوٹے قصبوں اور گاؤں تک اپنا جال پھیلا دیا۔ اس طرح میرے اخراجات میں اضافہ ہو گیا۔"

"اور تمہارے افسران خوش تھے۔"

"اور نہیں تو کیا..... انہیں اور کیا چاہیے تھا۔ ان کی فائلیں فقیروں سے بھری ہوتی تھیں کہ اتنے فقیر لائے گئے۔ شہر کو گداگروں کی لعنت سے پاک کر دیا جائے گا اور حکومت کا آئندہ منصوبہ وغیرہ وغیرہ۔"

"اچھا ان فقیروں کی تجارت کا انجام کیا ہوا؟"

"انجام بہت برا ہوا۔" وہ سر ہلا کر بولے۔ اور خاصی دیر تک کف افسوس ملتے رہے۔

"فقیر بھاگ گئے؟"

"وہ تو جاگتے ہی رہتے تھے اور میں انہیں اغوا کر کے وقتاً رہتا تھا۔ لیکن ایک ٹریجڈی ہو گئی۔"

"کس قسم کی ٹریجڈی؟"

"ایک صبح میں اپنے دفتر گیا کیا دیکھتا ہوں کہ برآمدے کے قریب ایک فقیر کھڑا ہے..... اسے دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ سچ مچ کا جیتا جاگتا ایک فقیر..... میں اسے اپنے بیگر ہوم میں لے جا کر نمبر بنا سکتا تھا۔ چنانچہ میں اس کے قریب گیا۔ لیکن قریب جانے سے پیشتر ایک ٹیکسی روکی اور اسے ہدایات دے دیں تو میں اس فقیر کے پاس گیا۔ "السلام علیکم"

"جی وعلیکم۔" فقیر نے انتہائی عاجزی سے کہا۔

"باباجی آپ سے ایک بات کرنی ہے۔" میں نے بھی عاجزی سے کہا۔

"مجھ غریب سے....." اس نے حیران ہو کر کہا..... بھلا مجھ غریب سے ہی تو میں نے بات کرنی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

"ہاں آپ سے ایک ضروری کام ہے..... ایک منٹ کے لیے ادھر تشریف لے آیئے..... یہ ادھر ٹیکسی میں آجائیں تو آرام سے گفتگو ہو جائے گی۔ آپ کی بڑی مہربانی میں ہمیشہ آپ کا شکر گزار رہوں گا۔ آپ کا تو بچہ ہوں۔ بچے کی بات سن لیجئے۔"

یہ باتیں کرتا کرتا میں اسے ٹیکسی تک لے آیا۔ وہ میرے کہنے پر اندر بیٹھ گیا اور میں نے ڈرائیور کو اشارہ کیا اور ٹیکسی سٹارٹ..... اس نے بہت شور مچایا کہ یہ کہاں لے جا رہے ہو..... میں شریف آدمی ہوں..... لیکن یہ تو ہر فقیر کہتا تھا..... میں نے اسے بیگر ہوم میں بند کر دیا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر یہ ہوا کہ اگلے ہفتے جب صاحب انسپکشن کے لیے بیگر ہوم میں گیا تو اس فقیر نے صاحب کی طرف دیکھا اور روتے ہوئے گلے لگا کر کہا۔ "بیٹا یہ شخص زبردستی مجھے یہاں لے آیا ہے۔" یہ فقیر صاحب کا باپ تھا۔"

"لیکن تم اتنا بھی نہ جان سکے کہ....."

"صاحب کا باپ گاؤں سے آیا تھا۔ ہم شہری لوگ تمام دیہاتیوں کو فقیر سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ان کا باس جو ہم سے مختلف ہوتا ہے۔ تو بس غلطی ہو گئی۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر میں نوکری سے نکالا گیا۔ اس لیے میرے سامنے سماجی بہبود کا نام مت لو..... میں افسانوں کی خدمت نہیں کروں گا....."

"لیکن نوکری سے نکل کر تم نے جو کاروبار کیا تو تم بہت دولت مند ہو گئے....."

"ہاں....." اس نے ایک پاکیزہ آہ بھری۔ "یہ ان تمام فقیروں کی دعاؤں کا اثر ہے۔ جنہیں میں زبردستی بیگر ہوم میں لے آیا کرتا تھا۔"

"آستینوں میں بُت"

سرکپ کے قدیم کھنڈروں میں گھومنے کے بعد ایک غیر ملکی جوڑا باہر آیا تو ایک کمبل پوش مقامی نوجوان ان کی جانب بڑھا۔ اس نے ایک چور کی طرح ارد گرد احتیاط کی نگاہ ڈالی اور پھر اپنے کمبل میں سے ایک چھوٹا سا مہاتما بدھ برآمد کر کے غیر ملکی جوڑے کے سامنے پیش کر دیا۔ وہ متاثر ہوئے بغیر آگے چلتے رہے۔ نوجوان نے دوسرے ہاتھ سے ایک اور مجسمہ کمبل میں سے نکالا اور انہیں دکھایا مگر وہ اپنے تانگے کی جانب بڑھتے رہے۔ اس نے کم از کم چھ سات مجسمے کمبل میں سے برآمد کر کے انہیں فروخت کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ غیر ملکی جوڑا شاید جانتا تھا کہ یہ ہزاروں سال قدیم مجسمے دراصل مقامی نوجوان کی مہارت سے ابھی دو چار روز پیشتر ہی وجود میں آئے تھے۔ اس لئے وہ اطمینان سے اپنے تانگے میں سوار ہو گئے اور قدیم درسگاہ جولیاں کی طرف روانہ ہو گئے۔

میں اپنے چھوٹے بھائی میجر مبشر اور بال بچوں کے ہمراہ اسلام آباد سے ٹیکسلا اور ان کے قرب و جوار میں پھیلے کھنڈرات دیکھنے کے لئے آیا ہوا تھا۔ پہلا پڑاؤ ٹیکسلا کا عجائب گھر تھا جس کی عمارت پر کسی انگلش کنٹری ہاؤس کا گمان ہوتا تھا لیکن مقامی پتھر سے تعمیر شدہ دیدہ زیب عمارت میں داخل ہونے پر کسی انگلش لارڈ سے ملاقات ہونے کی بجائے لارڈ بدھا سے سامنا ہو گیا۔ گندھارا عہد کے مجسمے، برتن، زیور، اوزار، غرضیکہ ایک مکمل تہذیب کی مکمل زندگی۔ عجائب گھر کے کیوریٹر گلزار صاحب ہر آنے والے کو ایک مہمان کی طرح خوش آمدید کہتے اور خوش اخلاق گائیڈوں کے سپرد کر دیتے۔ زیورات کا کمرہ چونکہ بند ہونے کو تھا اس لئے

میری بیوی کا اصرار تھا کہ پہلے انہیں دیکھ لیا جائے۔ کیونکہ بقول اس کے باقی تو ٹوٹے ہوئے برتن اور نقوش سے بت وغیرہ ہیں۔ گندھارا عہد کے زیورات کی چکاچوند نے مستورات کو بے حد متاثر کیا۔ بلکہ کلائیوں کے بھاری کنگن کا ڈیزائن بالکل وہی تھا جسے آج کل "شیر منہ کنگن" کہا جاتا ہے ان کنگنوں کا منہ شیر کی شباہت کا تھا اور تمام زیورات خالص سونے کے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس زمانے میں خاوند حضرات اپنی بیگمات کو پتھر یا ہڈی کے کنگن یا نیکلس وغیرہ کے تحائف دے کر ٹرخا دیتے ہوں گے اور چین کی زندگی بسر کرتے ہوں گے لیکن اب معلوم ہوا کہ اس عہد میں بھی خواتین اپنے خاوندوں کو طعنے دیتی ہوں گی کہ ہائے ادھر تو دیکھو اس کلموئی پجارن کو جس کی کلائیاں سونے کے کنگنوں سے بھری ہوئی ہیں اور ذرا میرے ننگے بازو دیکھو..... میری بیٹی عینی ایک شوکیس پر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا بیٹے کیا دیکھ رہے ہو۔ ابو دیکھئے کتنی پیاری بالیاں ہیں اور اتنی سادہ سی ہیں۔ مجھے ایک لے دیجئے۔ عینی نے سال ہی میں بڑے شوق سے اپنے کان چھدوائے اور میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ تم بالیاں پسند کر لینا میں خرید دوں گا..... میں نے اسے بتایا کہ بیٹے کئی ہزار سال پہلے چھوٹی بچیاں یہ بالیاں پہنتی تھیں اس لئے یہ صرف دیکھنے کے لئے ہیں۔ وہ بولی ابو اگر بالیاں ہیں تو انہیں پہننا چاہئے۔ خواہ مخواہ یہاں پڑی ہیں اور ان بچیوں کے نام کیا تھے جو یہ بالیاں پہنتی تھیں..... میں نے بڑی مشکل سے اسے سمجھایا کہ میں یہ بالیاں تمہیں لے کر نہیں دے سکتا۔ ٹیکسلا عجائب گھر سے جولیاں درسگاہ کے کھنڈروں کی جانب سفر شروع ہوا۔ چھوٹے چھوٹے کھیت، نیم پتھریلی زمین اور ٹیلوں کے کوہان..... کہاوت ہے کہ چندر گپت موریہ کو جب مگدھ سے نکال دیا گیا تو وہ عقل و دانش کی تلاش میں ٹیکسلا پہنچا۔ ایک روز اس نے دیکھا کہ ایک شخص آیا۔ اس نے ایک درخت کو پانی دیا اور چلا گیا۔ دوسرے روز وہی شخص لوٹا اور کلہاڑی سے اسی درخت کی چند جڑیں کاٹ ڈالیں..... چندر گپت نے سبب پوچھا تو وہ بولا کہ ایک روز میں اس درخت کے نیچے سے گزرا تو اس کی شاخوں سے میری پگڑی نیچے اتر گئی۔ اب میں اسے زندہ بھی رکھتا ہوں اور انتقام بھی لیتا

ہوں..... چندر گپت اُسے اپنے ہمراہ گھر لے گیا اور اس کے مشوروں کے مطابق اپنا کھویا ہوا تخت دوبارہ حاصل کر لیا..... اس کا نام چانکیہ تھا۔ جسے چانک بھی کہا جاتا ہے اور جو آداب حکمرانی میں عیاری اور چالاکی کے باب میں پہلا نام ہے۔ جانے کس درخت تلے چندر گپت موریہ اور چانکیہ کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

جولین درسگاہ کے کھنڈرات ایک بلند ٹیلے پر واقع ہیں اور وہاں تک پہنچنے کے لئے ایک کوہ پیما کا حوصلہ اور ایک سیاح کی ڈھٹائی درکار ہوتی ہے۔ خاص طور پر جب بچے لوگ ہر قدم پر چلنے سے انکار کر دیں اور کہیں کہ ابو اگر اُوپر جا کر آئس کریم ملے گی تو چلتے ہیں ورنہ آپ جا کر اپنے کھنڈر دیکھ آئیں..... جس طور کسی بلند چوٹی پر پہنچ کر انسان حیرت سے دوچار ہوتا ہے اسی طرح جولین کے کھنڈرات میں داخل ہو کر میں چند لمحوں کے لئے سناٹے میں آ گیا۔ میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ کھنڈرات اتنے وسیع اور بارعب ہوں گے۔ پٹھان گائیڈ آگے چلتا رہا۔ صاحب یہ اس وقت پورے برصغیر کی سب سے بڑی درسگاہ تھی۔ یہاں بدھ بھکشو مذہب کا علم حاصل کرنے آتے تھے۔ افغانستان، چین اور ایسے ملکوں سے جن کے نام اب مٹ چکے ہیں ان ستونوں پر کھدے مجسموں کے ذریعے انہیں بدھ کی تعلیمات سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ یہ اسمبلی ہال ہے جہاں لیکچر ہوتے تھے اور یہ وہ کمرے ہیں جن میں طالب علم رہائش پذیر ہوتے تھے۔

"آس کے پاس کے ان بلند ٹیلوں کو کھودا جائے تو اس درسگاہ کے مختلف حصے برآمد کئے جا سکتے ہیں میں مارشل صاحب اور وہیلر صاحب (معروف ماہر آثار قدیمہ) سے ملا ہوں۔ وہ یہاں آتے رہتے ہیں....."

"ابو۔ ابو....." میرا بیٹا سمیر ایک بُت کے پاس کھڑا تھا۔ "دیکھئے اس کی ناف میں ایک سوراخ ہے۔ اور بورڈ پر لکھا ہے کہ اگر آدمی اس سوراخ میں انگلی ڈال کر اپنی کسی خواہش کے بارے میں سوچے تو وہ پوری ہو جاتی ہے....." وہ سوراخ میں انگلی گھمانے لگا۔

"بیٹے بُتوں کو تنگ نہیں کرتے..... انگلی نکالو..... لیکن تم نے کس خواہش کے بارے میں سوچا ہے!"

"مجھے بھوک لگی ہے"..... وہ بولا۔ "اور ابّو ان کھنڈروں میں ایک جگہ بورڈ لگا ہے جس پر لکھا ہے۔ "کھانے کا کمرہ"..... وہاں چلیں!"

ہم ایک مختصر کھنڈر میں آئے جو کبھی بدھ بھکشوؤں کا کھانے کا کمرہ ہوتا تھا، اور پتھروں پر بیٹھ کر برگر۔ سینڈوچ اور چپس کھانے لگے..... بدھ بھکشو پتہ نہیں کیا کھاتے ہوں گے!

"شہر میں کیوں آ گئے ہو راجہ جی"

خواتین و حضرات السلام و علیکم۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں آج کی یہ تقریب انتہائی اہم ہے۔ اس میں ان شیر دلیر جوانوں کو تمغے دیئے جائیں گے جنہوں نے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر نتائج سے بے پروا ہو کر وطن کے عوام کی زندگیاں بچانے کے لئے وہ کارنامے سرانجام دیئے کہ بس آپ کو کیا بتائیں میرا خیال ہے وہ آپ کو خود ہی بتائیں گے کہ انہوں نے یہ کارنامے کس طرح سرانجام دے ڈالے..... ان سے گفتگو کرتے ہیں۔

"جناب آپ نے یہ عظیم کارنامے کس طرح سرانجام دیئے؟"

"میرا فرض تھا جناب....."

"کل کتنے کارنامے تھے؟"

"کارنامہ تو صرف ایک ہی تھا لیکن وہ کئی کارناموں پر بھاری تھا۔ اتنا خطرناک کہ جناب اب بھی میری نبض تیز چل رہی ہے اور مجھے ہلکا ہلکا بخار ہے۔"

"آپ کا تعلق کس محکمے سے ہے؟"

"میرا تعلق جنگلی جانوروں کے تحفظ کے محکمے سے ہے۔"

"بہت خوب اور اس محکمے کے کیا کیا فرائض ہیں؟"

"ایک تو ہم ہر اس بندے کو پکڑ لیتے ہیں جس کے ہاتھ میں بندوق ہو اور شکار کھیلنے کا لائسنس نہ ہو۔"

"اور اس کے علاوہ؟"

"اور اس کے علاوہ ہم افسروں کو شکار کراتے ہیں۔"

"یہ بھی آپ کے فرائض میں شامل ہوگا۔ اس کے علاوہ؟"

"اس کے علاوہ ہم پاکستان میں آنے والے اور رہنے والے جنگلی جانوروں اور پرندوں وغیرہ کو بچاتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم اس معاملے میں بے حد خوش قسمت واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے ملک میں جانوروں اور پرندوں کی بہتات ہے۔ ہم اس بہتات کو کم..... میرا مطلب ہے زیادہ کرنا چاہتے ہیں..... ان جانوروں کو بچاتے ہیں۔ جن کی نسل ختم ہو رہی ہے۔ یہ تو بین الاقوامی مسئلہ ہے۔"

"بہت خوب تو آپ نے جو یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے تو یقیناً خوب صورت جانور کو ختم ہونے سے بچایا ہوگا۔"

"آپ کہہ سکتے ہیں۔"

"ذرا روشنی ڈالیئے۔"

"ہم نے ایک انتہائی خونخوار آدم خور چیتے کو جان ہتھیلی پر رکھ کر ایک گیراج کے اندر صرف پندرہ بیس گولیوں سے ہلاک کر ڈالا ہے۔"

"بہت خوب..... تو چیتا آدم خور تھا۔"

"یقیناً! تبھی تو انسانوں کی بستی میں آیا تھا۔"

"سنا ہے کہ چھوٹا سا بچہ تھا۔"

"جی ہاں لیکن بڑا ہو کر ضرور آدم خور بن جاتا اس کی آنکھوں سے پتہ چلتا تھا۔"

"یہ بھی سنا ہے کہ تھکا ہوا تھا۔ بھوکا تھا اور گیراج میں مزے سے سو رہا تھا۔"

"بالکل آپ نے خود ہی فرمایا ہے کہ بھوکا تھا۔ ظاہر ہے جب جاگتا تو اسے کھانے کو کیا ملتا!..... صرف انسان....."

"لیکن..... وہ آپ تو جنگلی جانوروں کے تحفظ کے محکمے میں ہیں اور آپ کی اجازت سے اسے ہلاک کیا گیا تو تحفظ کیسے ہوا؟"

"ہاہا..... اس میں بھی ایک راز ہے۔ دیکھئے غلطی اس ماں کی ہے۔ ننھے منے بچوں کو گھر سے باہر نہیں جانے دینا چاہیئے چاہے وہ چیتے کے بچے ہی کیوں نہ ہوں..... اب اسے تو ہم نے

ماردیا..... تو ہو گا یہ کہ اب اس کی ماں اپنے بقیہ بچوں سمیت اسے تلاش کرنے کے لیے شہر آئے گی اور ہم ان سب کو پکڑ کر ان کا تحفظ کر لیں گے..... ایک چیتا مار کر ہم بہت سارے چیتے حاصل کر لیں گے۔"

"یہ واقعی بہت شاندار حکمت عملی ہے....."

"اور مالک مکان صاحب جو چیتے کے بچے کے مارے جانے پر بہت سیخ پا ہیں بالکل جاہل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ بے ضرر تھا۔ انسان کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا اور اسے پکڑ کر چڑیا گھر میں بھیجنا چاہیے تھا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ پاکستان میں اللہ تعالٰے نے کتنے خوبصورت جانور پیدا کیے ہیں..... جناب جنگلی جانوروں کے تحفظ کے محکمے میں تو ہم ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ تحفظ کس طرح کیا جاتا ہے اور بس اسی طرح کیا جاتا ہے۔"

"اور وہ بے حد خطرناک تھا؟"

"جی ہاں جب اسے ہلاک کر دیا گیا تو میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس کے قریب گیا اور یقین جانیے میری گھگھی بندھ گئی اور آپ کہتے ہیں کہ خطرناک تھا۔"

"لیکن صاحب تصویر میں وہ بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے اس نسل کا کوئی اور چیتا موجود نہ ہو۔ ہم اپنی آئندہ نسلوں کو کیا بتائیں گے کہ ہمارے ہاں کیسے کیسے جانور ہوا کرتے تھے۔"

"ہاں اس کا ہم نے انتظام کر لیا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ہم نے اس کی کھال میں بھُس بھرنے کا آرڈر دے دیا ہے..... اب وہ خطرناک بھی نہیں رہے گا اور نہ ہی اسے خوراک وغیرہ کی ضرورت پڑے گی بلکہ میں بھی اسے ہاتھ لگا کر دیکھوں گا کہ اس کی کھال کیسی ہے....."

"بہت بہت شکریہ! تو خواتین و حضرات اب بہادری کے تمغے دینے کی تقریب شروع ہونے کو ہے۔ ہمیں آپ سے صرف یہی کہنا ہے کہ ننھے منے بچوں کو گھر سے باہر نہ جانے دیجئے چاہے وہ چیتے کے بچے ہی کیوں نہ ہوں..... شکریہ!"

"شکریہ تو ادا کرنا چاہیئے"

عارف میاں کو میں کب سے جانتا ہوں؟ جب ہم دونوں چوتھی جماعت میں پڑھا کرتے تھے ہم دونوں دراصل نہیں پڑھتے تھے۔ پڑھتا صرف میں تھا وہ دیگر "عارفانہ حرکات" میں مشغول رہتے..... سگریٹ یا بیڑی ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا جی ہاں اس وقت ان کی عمر تقریباً دس برس کے لگ بھگ ہو گی..... اس کے علاوہ مزاج بھی لڑکپن سے عاشقانہ رکھتے تھے۔ مجھے بھی گھر والوں سے بار بار وارننگ ملتی کہ عارف میاں سے دور رہا کرو ان کے لچھن کچھ ٹھیک نہیں ہیں..... اور یہ حقیقت ہے کہ ان کے لچھن کچھ ایسے نہیں بہت زیادہ ٹھیک نہیں تھے..... چوتھی جماعت کے بعد میں ایک دوسرے سکول میں چلا گیا اور ہماری ملاقاتیں کم ہو گئیں..... پھر صرف خبریں ملتیں کہ عارف میاں مسلسل فیل ہو رہے ہیں۔ ان کے والد نے سکول سے اٹھا لیا ہے۔ اور جب میں کالج پہنچا تو اطلاع آئی کہ موصوف کو ان کی بڑھتی ہوئی "عارفانہ حرکات کی وجہ سے گھر سے نکال دیا گیا ہے۔

اس دوران میں ملک سے باہر چلا گیا اور ان سے رابطہ مکمل طور پر ٹوٹ گیا۔ چھ سات برس بعد جب واپسی ہوئی تو ایک روز عارف میاں ملنے چلے آئے..... ایک بے حد پچکے ہوئے تانگے سے اترے شاید سوٹ میں ملبوس انگلیاں سگریٹ نوشی کے باعث زرد اور دانت پتہ نہیں کیا کیا نوشی سے پیلے۔ معلوم ہوا کہ گھر سے نکلنے کے بعد انہوں نے اپنا ذاتی کاروبار شروع کر لیا۔ اور اب نمبرے لاکھوں میں کھیلتے ہیں اور کوئی بڑی صنعت لگانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ البتہ ان کی حرکات بدستور "عارفانہ" تھیں۔ چند روز ان کے ہمراہ گھومنے کا اتفاق ہوا۔ تو عجیب و غریب تجربے ہوئے..... تانگے پر کاروبار کر کے صرف اتنا کہتے "چل بھئی" اور تانگہ چل پڑتا اور انہیں وہاں لے جاتا جہاں وہ جانا

چاہتے تھے اور جہاں بیشتر شریف آدمی نہیں جانا چاہتے۔ بلکہ ان علاقوں میں دیکھا بھی نہیں جانا چاہتے...... ان علاقوں میں عارف میاں بے حد مقبول تھے۔ اپنے روپے پیسے کی وجہ سے اور اپنی لچے دار گفتگو کی وجہ سے...... گلبرگ کی کسی ویران سی کوٹھی میں مقیم تھے تاکہ پرائیویسی میں خلل نہ پڑے...... میں بچپن کی دوستی کے باوجود ان کا ساتھ اتنی دور تک نہ دے سکا اور ہم دور ہو گئے...... کبھی کبھار کسی بیاہ شادی پر نظر آجاتے اور سلام دعا کے بعد رخصت ہو جاتے۔

یہی عارف میاں اگلے روز میرے ہاں تشریف لے آئے۔ کہنے لگے ہسپتال میں کسی عزیز کی خبر لینے آیا تھا سوچا تم سے ملتا چلوں...... میں نے چائے پلائی اور کہا کہ میں تو صرف یہی پلا سکتا ہوں۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسے اور چائے کے ایک اور گلاس کا مطالبہ کیا...... اس کے بعد وہ حیرت انگیز واقع ہوا جس کے لیے میں نے عارف میاں کی ہسٹری شیٹ بیان کی ہے۔ انہوں نے ہڑبڑا کر وقت دیکھا اور "ابھی آیا" کہہ کر غائب ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئے اور پھر گفتگو وہیں سے شروع کر دی جہاں پر چھوڑ گئے تھے میں نے پوچھا "عارف میاں کہاں گئے تھے؟" کچھ شرمندہ سے ہوئے اور کہنے لگے "کہیں نہیں......" میں نے کہا "کسی چکر میں گئے ہو گے؟......" گھبرا کر بولے "نہیں یار" میں نے پوچھا "پھر کہاں گئے تھے؟"

سر جھکا کر بولے "ذرا نماز پڑھنے گیا تھا مسجد میں۔"

"نماز؟" حیرت سے میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"اور سناؤ بال بچوں کا کیا حال ہے؟"

"وہ تو ماشاءاللہ ٹھیک ہیں لیکن عارف تم اور نماز؟"

"بھئی...... وہ بس ہو جاتا ہے ناں...... کیوں میں نماز نہیں پڑھ سکتا"

"لیکن عارف......"

تب عارف میاں نے مجھے ایک کہانی سنائی کہنے لگے: "ایک مرتبہ کراچی جانا ہوا یہی کوئی دو تین برس پہلے کی بات ہے۔ میری عادتیں وہی تھیں جنہیں تم کیا سارا زمانہ جانتا ہے...... بہرحال

شام کو ایک دوست کے ہمراہ ذرا موڈ ٹھیک کیا اور پھر سوسائٹی میں ایک جگہ ٹیلیفون کیا کہ ہم آرہے ہیں اور وہاں ہم اکثر جایا کرتے تھے۔ رات کے گیارہ بجے ہوٹل سے نکلے، چونکہ ذہنی طور پر نارمل نہیں تھے اس لئے وہ تین گھنٹے ادھر ادھر گھومنے کے باوجود وہ مکان نہ ملا جہاں ہم مدعو تھے...... رات کے دو بجے کے قریب ہم نے ایک مکان کی گھنٹی بجائی۔ صاحب مکان آنکھیں ملتے ہوئے باہر آئے۔ ہم نے کہا کہ جی ایک مریض بیمار ہے اس لئے فون کرنا ہے...... انہوں نے ڈرائنگ روم کھول دیا۔ جتنی دیر میں نے فون پر اس مکان کے مکینوں سے ان کے گھر کا نمبر دوبارہ پوچھا اور بتایا کہ آپ انتظار کریں ہم پہنچ۔ صاحب مکان چائے لے آئے...... اور ان کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں معلوم ہے کہ ہمارا کوئی مریض بیمار نہیں اور ہم کس قسم کے "ڈاکٹر" کو فون کر رہے ہیں۔ لیکن وہ مسکراتے رہے اور بار بار ہماری آمد کا شکریہ ادا کرتے رہے۔ ہم باہر آئے اور بڑی دیر تک ان کی نوازش کا شکریہ ادا کرتے دوہرے ہوتے رہے...... بھلا رات کے دو بجے جو شخص اپنے گھر کا دروازہ کھول دے اور فون کرنے دے، چائے پلائے اس کا شکریہ کس طرح ادا کرتے بلکہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ بہرحال ہم وہاں گئے جہاں جانا تھا...... واپسی پر صبح ہو رہی تھی۔ ہم تھکے ہوئے تھے۔ وہ کسی مسجد میں اذان ہو رہی تھی...... میں اونگھتا ہوا اسے سن رہا اور یکدم میرے ذہن میں ایک خیال آیا...... عارف میاں اس رات ایک اجنبی شخص نے تمہیں ساٹھ پیسے کا فون کرنے دیا اور پچاس پیسے کی چائے پلائی اور تم اس کا شکریہ ادا کرتے کرتے دوہرے ہو گئے ہمیشہ کے لئے اس کے احسان تلے دب گئے...... تو پھر جس نے تمہاری تمام تر قباحتوں کے باوجود لاکھوں روپے دیئے۔ شاندار کوٹھیاں، کاریں اور بال بچے دیئے یار اس کا شکریہ بھی تو ادا کرنا چاہیے...... میں نے کار مسجد کی طرف موڑ دی...... اور بس اس کے بعد اس کا شکریہ ادا کرتا رہتا ہوں اور کسی بات کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا...... شکریہ تو ادا کرنا چاہیے ناں؟"

"ہاں!" میں بول نہ سکا اور بیٹھے ہوئے گلے سے کہا۔

"شکریہ ادا کرنا چاہیے۔"

"پاکستان اور رابنس کروزو"

چھٹی کے روز حسبِ معمول میرے گھر میں ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ بچے شور مچا رہے تھے۔ سکول کا کام کر رہے تھے۔ بلند آواز میں ٹیلیویژن کمرشلز کے گانے گا رہے تھے اور میں پینزی کے ایک پودے کو سامنے رکھ کر سوچ رہا تھا کہ ابھی تک اس میں کلیاں کیوں نہیں آئیں، جبکہ باغوں میں گلزاروں میں پینزی کے پھولوں کے ڈھیر دکھائی دے رہے ہیں۔ شاید میرے ہاں دھوپ کم ہے اس لیے روشنی زیادہ نہیں اس لئے۔ یا یہ کہ میں ہر صبح ان پودوں کو دیکھ کر گھورتا رہتا ہوں۔ ان کا معائنہ کرتا رہتا ہوں اور پودوں کو یہ بات پسند نہیں کہ ان کو ڈسٹرب کیا جائے اس لئے انہوں نے پھول دینے سے انکار کر دیا ہے۔ تب میرے چھوٹے بچے لابروں کی طرح لڑتے ہوئے غصے سے لال بھبوکا باہر آئے اور "ابو دیکھیں اس نے ..... نہیں ابو میں نے کچھ نہیں کہا یہ تو ..... ابو ابو اس نے مجھے پیٹ ڈالا ....." کا شور مچا دیا....

"خاموش" میں نے گرج کر کہا۔

دونوں خاموش ہو گئے۔

"اب بتاؤ کیا ہوا ہے ..... پہلے تم عینی"

"عینی نے اپنے سُرخ گالوں پر لڑھکتے آنسو پونچھے اور کہنے لگی: "دیکھیں ابو سمیر کہتا ہے کہ سرسوں سُرخ رنگ کی ہوتی ہے۔"

"اور آپ کیا کہتی ہیں؟"

"میں کہتی ہوں کہ سبز رنگ کی ہوتی ہے ..... میں ٹھیک ہوں نا ابو ..... ہم جو سرسوں کا

ساگ کھاتے ہیں وہ سبز رنگ کا ہوتا ہے ناں!"

"اور آپ جناب کا خیال ہے کہ سرسوں سُرخ رنگ کی ہوتی ہے کیوں؟" میں نے سمیر سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"ابو اس لئے اس کا نام سرسوں ہے ..... سُرخ رنگ کی چیز کو ہی سرسوں کہتے ہوں گے ....."

"کمال ہے" میں نے غصے سے کہا۔ "تم ایک پینڈو شخص کے بچے ہو جو اپنے کسان پس منظر پر فخر کرتا ہے۔ گاؤں کے حوالے سے ڈرامے لکھتا ہے اور تمہیں یہ پتہ نہیں کہ سرسوں کس رنگ کی ہوتی ہے۔"

"پینڈو تو آپ ہیں ابو" سمیر نے کہا "ہم تو شہر کے رہنے والے ہیں ..... ہم نے کبھی سرسوں دیکھی ہی نہیں ہمیں کیا پتہ کیسی ہوتی ہے۔"

اور بچے درست کہہ رہے تھے۔ پچھلے پورے برس میں میں صرف ایک مرتبہ لاہور سے باہر شرقپور کی جانب گیا تھا اور اس روز بھی مجھے احساس ہوا تھا کہ میں اب صرف نام کا پینڈو اور صرف فیشن کے طور پر کسان ہوں۔ ورنہ میرا رابطہ کھیتوں، درختوں اور کھلی فضاؤں سے کٹ چکا ہے۔ اور اس سفر کے دوران میرے بچے میرے ساتھ نہیں تھے ..... میں اپنے طور پر انہیں پینڈو رکھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا لیکن انہیں کبھی لاہور سے باہر لے کر نہیں گیا تھا ..... بچے اگر سرسوں کو سُرخ یا سبز رنگ کی بتا رہے تھے تو ان کا قصور نہ تھا۔

"آج ہم لاہور سے باہر جائیں گے پکنک منانے کے لئے، چلو تیار ہو جاؤ۔" میں نے اعلان کیا۔

یہ اعلان بچوں کو بے حد پسند آیا جو فوراً اپنے جوگر شوز اور جرابیں ڈھونڈنے لگے لیکن بیگم صاحبہ باورچی خانے میں سے ہاتھ میں ڈوئی پکڑے برآمد ہوئیں اور اسے ایک تلوار کی طرح لہرا کر بولیں: "ایک تو تمہاری زندگی میں ڈسپلن نہیں ہے۔ تمہیں کچھ پتہ نہیں کہ تم کیا

کرنا چاہتے ہو..... اب آرام سے بیٹھے بٹھائے تمہیں پکنک پر جانے کی کیا سوجھی ہے.....؟"

"بیگم!" میں نے نہایت الفت بھرے انداز میں کہا۔ "ہم شہروں میں قید ہو گئے ہیں۔ ہمیں کبھی کبھار کھلی فضاؤں میں بھی سانس لینا چاہیے۔"

"اور دوسرے تم رومانوی ہوئے تو اس عمر میں..... ٹھیک ہے جاؤ جا کر فضا میں سانس لو میں نے تمہیں روکا ہے؟"

"بیگم اگر سانس بھی لوں تو تم مجھے نہیں روکو گی۔ لیکن بہتر جو ہانڈی تم نے پکا رکھی ہے اسے ساتھ لو اور آج میرے ساتھ جوانی کی یادیں تازہ کرتے ہوئے پکنک پر چلو۔"

"جوانی کی یادیں؟" بیگم یکدم چونکی ہو گئیں۔ "میں تو کبھی تمہارے ساتھ پکنک پر نہیں گئی کس کے ساتھ گئے تھے؟"

اس دوران تینوں بچے تیار ہو کر باہر آ گئے اس لئے ہم نے گفتگو یہیں ختم کر دی۔

"لیکن جانا کہاں ہے؟" سلجوق نے پوچھا۔

"بھئی یہاں گھر سے نکلتے ہیں..... راوی کی طرف۔ خوراک ہمارے پاس ہوگی۔ کسی بھی پر فضا مقام پر رکیں گے اور پکنک منائیں گے۔"

"اور وہ تمہارے چیلے چانٹے جشن کے روز چائے پینے آ جاتے ہیں ان کا کیا ہوگا؟" بیگم نے پوچھا۔

"میں آج آزاد ہو جانا چاہتا ہوں۔" میں نے سینہ تان کر ایک لمبی سانس بھری..... "آہ..... تازہ ہوا..... سرسوں کے کھیت اور..... اور..... اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ..... آؤ بچو.....!"

ہم سب موٹر سائیکل پر سوار ہو گئے۔ راستے میں خوراک کی خریداری کی اور راوی کی جانب روانہ ہو گئے۔ پل پار کرنے کے بعد پکنک کے مقام کی تلاش شروع ہوئی.....

مقبرہ جہانگیر کے بارے میں کیا ہے؟"

"دفع کرو۔" بیگم بولیں۔ "زندگی میں ایک بار باہر لائے ہو تو مقبرے میں جاتے ہو....."

"راوی کے کنارے کسی پرسکون ریتلی جگہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"وہاں سرسوں ہوگی؟" بچوں نے پوچھا۔

"سرسوں تو شرقپور روڈ کی طرف ہوگی۔"

"تو پھر وہاں چلتے ہیں۔"

میں نے اپنا موٹر سائیکل شرقپور کی جانب موڑ دیا۔ ٹریکٹر، ٹرالیاں، بسیں اور انسانوں کا ہجوم..... لاہور میں بس ایک ہی خامی ہے کہ یہاں انسان اکیلا نہیں ہو سکتا..... اس کے آس پاس کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں پہنچ کر لاہور پیچھے رہ جائے، آبادی ختم ہو جائے اور آپ کسی گوشے میں بیٹھ کر سکھ کے چند سانس لے سکیں..... لاہور ایک اجتماعی خاندان کی طرح رہتا ہے..... آپ کہیں بھی چلے جائیں..... مقبرہ جہانگیر، جلو پارک، شالیمار..... اور وہاں آپ کو کوئی نہ کوئی واقف کار مل جائے گا..... بھابی کی حال اے؟ بھائی جان آپ کہاں گھوم رہے ہیں؟..... چاچا جی سلاما لیکم..... اس معاملے میں اسلام آباد کے باسی خوش قسمت ہیں..... وسیع میدان اور پہاڑیاں جو ان دنوں دھوپ میں سنہری ہو جاتے ہیں..... سرکنڈے، درخت، جھیلیں..... کسی بھی شاہراہ سے ہٹ جائیں تو جنگل شروع ہو جاتا ہے..... شرقپور روڈ پر متعدد جگہ رکے لیکن کوئی بھی ایسی جگہ نہ ملی جو پکنک منانے کے لئے مناسب ہو..... اکثر جگہ کھیتوں کو پانی دیا ہوا تھا..... ایک مقام پر سڑک سے ذرا دور ہوئے تو موٹر سائیکل کے پیچھے کتے لگ گئے اور بچے لوگ بے حد خوفزدہ ہو گئے۔ ایک جگہ پسند آئی تو وہاں بھینسیں آ گئیں اور بیگم نے وہاں بیٹھنے سے انکار کر دیا..... بچے بھی سرسوں کے کھیت دیکھ دیکھ کر اکتا چکے تھے اور اب انہیں

بھوک لگ رہی تھی۔ چنانچہ سلجوق نے بیزار ہو کر کہا: "ابو ہم نے کھلی فضا میں بہت سارے سانس لے لئے ہیں اور سرسوں کے کھیت دیکھ لئے ہیں۔ اب واپس چل کر اپنی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔" اس تجویز کا سب نے خیر مقدم کیا لیکن بیگم نے ایک اور تجویز پیش کی۔ "تم کبھی کبھار کسی سعید صاحب کا ذکر کرتے ہو جو شرقپور روڈ پر کھیتوں کے درمیان رہتے ہیں اور تمہارے دوست ہیں..... وہ کہاں رہتے ہیں ادھر.....؟"

اب یہ سعید صاحب جو ذرا گم سُم اور کھوئے کھوئے کبھی کبھار میرے پاس آتے تو تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ تارڑ صاحب میں نے دنیا سے الگ ایک اپنی دنیا بسا رکھی ہے کبھی آئیے گا..... لیکن یوں چھٹی کے دن بال بچوں کی فوج کے ساتھ بغیر اطلاع کئے ان پر دھاوا بول دینا بھی تو شرافت نہ تھی..... میں قدرے ہچکچایا تو بیگم کہنے لگیں۔ "نان ہمارے پاس، گوشت ہم نے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ کیک بھی ہے ان کو کوئی تکلیف نہ ہو گی..... زیادہ سے زیادہ چائے کا ایک کپ پی لیں گے..... اور مجھے اس وقت چائے کی شدید طلب ہے..... اگر چائے نہ ملی تو شاید میں موٹر سائیکل سے گر جاؤں.....؟"

اب اگر کوئی سمجھدار خاوند ہوتا تو ایسے سنہری موقع سے فائدہ اٹھاتا اور بیگم کو چائے نہ پلاتا لیکن میں اب تھک چکا تھا چنانچہ ہم نے سعید صاحب کے گھر کی تلاش شروع کر دی..... سڑک کے عین کنارے پر ایک بلند دیوار تھی اور اس دیوار میں لوہے کا ایک بہت بڑا زنگ آلود پھاٹک تھا جو بند تھا..... ہم نے دستک دی پہلے شریفانہ طور پر آہستہ آہستہ اور پھر تمام اہل خاندان اس پر مکے برسانے لگے۔ ایک سوراخ میں سے کسی بچے نے جھانکا "کون ہے؟" میں نے اپنا نام بتایا تو وہ غائب ہو گیا۔ خاصی دیر بعد ایک اور بچے کی آنکھ سوراخ میں نمودار ہوئی "کون ہے؟" میں نے پھر اپنا نام بتایا تو وہ غائب ہو گیا..... تیسری مرتبہ پھاٹک چرچرایا اور کھلنے لگا..... سامنے

سعید صاحب ہاتھ میں لوہے کے چند اوزار لئے کھڑے تھے۔ ان کے آس پاس ان کے بچے بھی ایسے گھور رہے تھے جیسے ہم کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہوں اور ان کے ہمراہ ان کی مسکراتی ہوئی تر و تازہ بیگم ایک مرغی ہاتھ میں لئے کھڑی تھیں..... "ہمارے پاس تو مدتوں کوئی مہمان نہیں آتا..... آیئے آیئے..... بڑا اچھا کیا آپ نے.....؟"

سعید صاحب اور ان کے بال بچوں کے پیچھے ایک عجیب و غریب دنیا تھی..... دو تین ایکڑ میں پھیلی ہوئی ایک دنیا جسے ہم حیرت اور مسرت سے دیکھ رہے تھے..... پھلدار درخت، تالاب اور سبزیوں کے پلاٹ، وسیع میدان اور ان کے درمیان ایک بلند سطح پر سعید صاحب کی رہائش گاہ.....

"ابو! یہ سارا گھر ان کا ہے؟" عینی نے حیرت سے پوچھا۔

"آؤ میں تمہیں مچھلیاں دکھاؤں۔" سمیر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

کامران نے سلجوق اور سمیر کو ساتھ لیا اور جنگل میں گم ہو گئے۔

"تقریباً بارہ برس قبل کچھ خاندانی اختلافات کی وجہ سے میں نے شہر چھوڑا اور یہاں آکر زمین خرید لی..... ان دنوں یہ بے حد سستی تھی۔ پہلے ایک چار دیواری تعمیر کی اور پھر ایک دو کمرے بنائے اور رہائش اختیار کر لی۔"

"آپ کو خوف نہیں آتا تھا یہاں؟" میری بیگم نے پوچھا۔

"آتا تھا۔" بیگم سعید بولیں۔ "یہ علاقہ بالکل ویران تھا اور ہم دونوں نے ایک ایسا پروگرام بنا رکھا تھا کہ میں رات بارہ بجے تک کام میں مشغول رہتی تھی۔ پھر میں سو جاتی تھی اور سعید صاحب صبح تک جاگتے تھے۔ یہ عادت اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ اب بھی ہم اسی طرح پہرہ دیتے ہیں۔ شروع شروع میں چوروں نے کوشش کی لیکن اب ان کو معلوم ہے کہ ہماری تمام دیواروں میں کرنٹ ہے اور ہم کبھی غافل نہیں ہوتے۔"

"یہ دیکھئے یہ تالاب ہے جس میں تقریباً ایک ہزار مچھلیاں ہیں..... امرود، لیموں

اور مالٹوں کے درخت ہیں۔ یہ مرغی خانہ ہے..... یہ میری ورکشاپ ہے جس میں ضرورت کی تمام چیزیں خود تیار کرتا ہوں۔ اس گھر میں کوئی شے ایسی نہیں جو میں نے خود نہ بنائی ہو۔ کرسیاں، میز، ٹیوب ویل اور یہ پرانی کار۔ بچوں کے لئے جھولے..... سب کچھ میں نے خود بنایا ہے..... میری ضروریات محدود ہیں..... چھت میرے پاس ہے، سبزیاں ہم اگاتے ہیں، پھل بھی بے شمار ہے۔ مرغی اور مچھلی کا گوشت بھی اپنا ہے، کیک اور بسکٹ وغیرہ میری بیگم خود بنا لیتی ہیں..... ہم بازار سے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں خریدتے۔"

بیگم سعید نے پکے ہوئے امرود توڑے اور تالاب میں پھینک دیئے۔

"یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟"

"ہم پھل یا تو خود کھاتے ہیں یا مچھلیوں کو کھلاتے ہیں بیچتے نہیں..... آپ بھی کھائیے۔"

میرے بچے اس ماحول میں وحشی ہو رہے تھے۔ جیسے جنگل کے جانور چڑیا گھر میں بند رہنے کے بعد ایک مرتبہ پھر جنگل میں آ گئے ہوں..... ہر شے میں ایک عجیب ذائقہ تھا۔ وہ ذائقہ جو کھیت اور شہر کے درمیان راستے میں کہیں گم ہو جاتا ہے اور ہم صرف گاجر، مولی، مالٹے یا امرود کی کوئی قسم کھاتے ہیں اور ذائقے سے بے خبر رہتے ہیں....

دوپہر کے کھانے پر ہم نے سعید صاحب کے گھر کی مرغی اور سبزی کھائی..... دہی کا ذائقہ بھی مختلف تھا اور مزیدار تھا..... کھلی فضا میں شاید ہر شے زیادہ مزیدار ہو جاتی ہے..... دیوار کے پار گیندے اور گلاب کے کھیت تھے۔ جن کی گرم مہک ہوا کے دوش پر آتی تھی اور ہمارے آس پاس پھیل جاتی تھی۔

"میرے بچے بھی اس آزاد فضا میں بے حد خوش ہیں..... مجھے یقین ہے کہ یہ فطرت کے قریب رہنے کی وجہ سے نسبتاً ایماندار اور معصوم انسان بنیں گے..... ہم نے کوئی کوئی ملازم نہیں رکھا اور سارا کام مشترکہ طور پر کرتے ہیں..... مرغیوں اور مچھلیوں سے

اتنی آمدنی ہو جاتی ہے کہ گزارہ ہو جائے اور باقی ہم خود کھاتے ہیں اور مچھلیوں کو کھلاتے ہیں....."

واپس فطرت کے قریب جانے کی خواہش ہر انسان کے سینے میں پیدا ہوتی ہے جو سڑکوں، کاروں، عمارتوں، شور، دھوئیں اور کثافت سے تنگ آ جاتا ہے۔ چند برس پیشتر امریکہ اور یورپ میں تو باقاعدہ ایک تحریک چلی تھی کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بڑے شہر چھوڑ کر ویرانوں اور جنگلوں میں جا بستے۔ اپنی ضروریات کی سب چیزیں خود بناتے اور خوراک زمین سے حاصل کرتے..... سعید صاحب کسی تحریک کا حصہ نہ تھے..... انہوں نے اپنی ایک الگ اور فطرت کے قریب دنیا بسائی تھی۔ اور وہ انہوں نے کامیابی سے بسائی..... میرے خیال میں وہ ایک ماڈرن رابنسن کروزو ہیں..... ایک پاکستانی رابنسن کروزو۔

گھر واپسی پر سارے بچے بالکل خاموش تھے..... وہ ایک نئی دنیا دیکھنے کی حیرت میں گم تھے۔ ایک ایسی دنیا جس میں ان کا دادا رہا کرتا تھا۔ ان کے باپ نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی اور وہ اس سے محروم کر دیئے گئے تھے۔

"ابو اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ سرسوں کا کیا رنگ ہوتا ہے۔" سمیر نے کہا۔

"کیا رنگ ہوتا ہے؟"

"سرخ۔" وہ شرارت سے بولا۔

"ابو کیا ہم دوبارہ بھی وہاں جائیں گے؟" عینی نے پوچھا۔

"نہیں بیٹے..... اگر ہم دوبارہ وہاں گئے تو تمہارے لئے اس دنیا میں کوئی کشش نہیں ہو گی، وہ دنیا تمہیں گندی اور گنوار لگے گی۔ اس کا رومان ختم ہو جائے گا..... کیونکہ شہر ہم پر غالب آ چکا ہے اور ہم سرسوں کے کھیت دیکھنے کی بجائے وی سی آر زیادہ پسند کرتے ہیں۔"

”استنبول کا اکبر خاں“

استنبول دنیا کے ان چند شہروں میں سے ایک ہے جو بے حد لاپرواہ ہوتے ہیں۔ اپنی خوب صورتی پر نازاں ہوتے ہیں۔ انہیں ملنے کے لیے آپ کو جھکنا پڑتا ہے۔ ان کی تعظیم کرنا پڑتی ہے۔ ورنہ وہ ناراض ہو کر رخ پھیر لیتے ہیں اور آپ ان کی خوب صورتی اور قدامت کو دیکھ نہیں پاتے...... یہ خصوصیت ان تمام شہروں میں ہوتی ہے جو انسانوں نے نہیں بسائے ہوتے بلکہ انسان خواہش کر کے ان کے پاس جاتے ہیں کہ ہمیں اجازت دو ہم تم میں بسنے کو آئے ہیں...... ایسے شہر ایک مقناطیس کی طرح انسان کو اپنی جانب کھینچتے ہیں...... انہیں انسان کی نہیں بلکہ انسان کو ان کی ضرورت ہوتی ہے...... چنانچہ ہر دو چار سال بعد وہ اس شہر کی کشش کے آگے بے بس ہو کر اس کی جانب سفر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں استنبول کی بات کرتا ہوں۔ تقریباً دس بارہ برس پیشتر کی بات...... استنبول کا حیدر پاشا سٹیشن ایشیا میں واقع ہے۔ سٹیشن سے باہر نکلئے تو باسفورس میں کھڑے سٹیمر آپ کو بلند بھونپو بجا بجا کر بلاتے ہیں کہ آؤ یورپ چلیں۔ جیسے لاہور سٹیشن کے باہر تانگے والے بلاتے ہیں کہ آؤ لوہاری چلیں، آؤ بھاٹی چلیں۔ بہر حال میں ایک سٹیمر پر بیٹھا اور دس منٹ کے اندر اندر باسفورس کے دوسرے کنارے پر براعظم یورپ میں تھا...... اور یورپ میں اکبر خان تھا۔ میں سٹیمر سے باہر نکل رہا تھا تو وہ پتہ نہیں کہاں سے نمودار ہو گیا۔ "السلام علیکم۔ یو پاکستانی؟" اس نے دانت نکالتے ہوئے پوچھا۔ "وعلیکم السلام ...... ہاں پاکستانی۔" میں نے جواب دیا۔

"میں اکبر خان ہوں۔" اس نے سینے پر ہاتھ جما کر کہا: "خدا حافظ اکبر خان۔" میں نے اپنا سامان اٹھایا اور پل غلطہ کی جانب چلنے لگا...... وہ میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ جناب میں آپ کا پاکستانی بھائی ہوں۔ یہاں استنبول میں ہالیڈے کر رہا ہوں اور بھائیوں کی مدد کرتا ہوں...... آپ پردیسی ہو۔ میں آپ کو ہوٹل

سے چلوں۔"

"میں کچھ زیادہ پردیسی نہیں ہوں اکبر خان۔" میں نے بیزار ہو کر کہا۔ "ارض روم سے استنبول تک دو دن اور دو رات کا سفر انسان کو شتر مرغ بنا دیتا ہے۔ میں شاید دسویں مرتبہ ادھر آ رہا ہوں۔ خود ہی ہوٹل چلا جاؤں گا۔"

"او جناب آپ بھائی ہو ہمارے۔ یہ جو ترکی ہیں ناں، بڑے چالاک ہیں...... مجھے پتہ ہے ترکی آپ سے بول کر دکھاؤں؟" اس کے بعد پتہ نہیں وہ ترکی زبان میں یا کسی اور زبان میں گانے لگا...... میں جب اس ہوٹل کے کاؤنٹر تک پہنچا جہاں مجھے ٹھہرنا تھا تو اکبر خان بھی میرے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ وہ ہوٹل کے مالک کو پتہ نہیں کیا کہتا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہتا او جی میں نے سفارش کر دی ہے۔ کہتا تھا کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں نے کہا یہ میرے بھائی جان ہیں۔ ان کو کمرہ ضرور ملنا چاہیئے اور جناب دس لیرے کم کروا دیئے ہیں کرائے میں سے۔"

جب تک میں اپنے کمرے میں جا کر منتقل نہ ہو گیا وہ بولتا رہا۔ پچھلے پہر میں ہوٹل سے باہر آیا تو وہ ایک چائے خانے کے باہر بیٹھا ایک سوکھا ہوا نان کھا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیر کی طرح میرے پاس آیا اور پھر شروع ہو گیا۔ اچھا اچھا آرام کر لیا ہے۔ لو بھائی جان نان کھاؤ۔ ترکی نان ہے...... چائے پیو گے...... اس سے پیشتر کہ میں کچھ کہتا اس نے ترکی زبان میں چائے کا آرڈر دے دیا۔ مجھے اس کے پاس بیٹھنا پڑ گیا۔ میں جناب ہالیڈے کر رہا ہوں...... ادھر پاکستان میں بزنس ہے...... میں نے سوچا دفع کرو مال دولت اور کاموں کو ذرا ترکی میں ہالیڈے کرو...... چائے آگئی جو ہم نے پی اور بل میں نے ادا کر دیا جو کچھ زیادہ تھا۔ اکبر خان چائے کے ساتھ اپنا نان کھاتا رہا۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" اس نے پوچھا۔

"حضرت ایوب انصاری کے مزار پر حاضری دینے کا خیال ہے۔" میں نے کہا۔

"اللہ اللہ" اس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔ بہت بڑے بزرگ ہیں جی...... بس یوں سمجھو کہ استنبول کے داتا گنج بخش ہیں...... چلو میں بھی چلتا ہوں، آپ کو دکھا لاؤں۔ میں اس کی رفاقت کا خواہش مند

تو نہیں تھا لیکن مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ اسے سختی سے منع کر دیتا۔

ہم بس پر سوار ہو کر حضرت ایوب انصاری کے مزار پر پہنچ گئے...... یہ مزار فاتح استنبول سلطان محمد فاتح نے تعمیر کروایا تھا۔

"آپ کبوتروں کے لیے دانہ لائے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"کون سے کبوتروں کے لیے؟" میں نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

"حضرت کے مزار کے صحن میں جو کبوتر بیٹھے رہتے ہیں ان کو ہر ترک دانہ کھلاتا ہے اور ثواب کماتا ہے...... اچھے دس لیرے میں دانہ لے کر آتا ہوں۔"

"میں تو صرف زیارت کی خاطر آیا تھا۔" میں نے سختی سے کہا۔

"نہ نہ" وہ سر ہلا کر بولا۔ "کبوتروں کو دانہ اگر نہ کھلایا تو حضرت ایوب ناراض ہو جائیں گے۔ ویسے بھی یہ" میں نے مجبوراً دس لیرے دے دیئے۔ وہ باہر گیا اور دانے کی ایک پوٹلی خرید لایا۔ حضرت ایوب کے مزار سے ملحقہ ایک قبرستان ہے...... مجھے معلوم نہیں وہاں کون کون دفن ہے۔ لیکن اس کی قدامت سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیا کیا لوگ ہوں گے جو اس کی خاک میں سوتے ہیں...... اس قبرستان سے استنبول کا نظارہ بھی سحر انگیز ہے۔ میں اس قبرستان کے آخر تک گیا۔ جہاں سے چٹانوں کے کنارے کے نیچے سمندر تھا۔ اکبر خان میرے ساتھ ساتھ باتیں کرتا چلا جا رہا تھا...... ہوٹل واپسی پر ہم نے ایک ریستوران میں کھانا کھایا۔ کھانے کا بل ظاہر ہے میں نے ادا کیا۔

اگلے روز میں صبح صبح ہوٹل سے نکل کر ایک واقف کار کے ہاں چلا گیا اور سارا دن وہیں گزارا۔ شام کو واپس آیا تو وہ ہوٹل کی سیڑھیوں میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔

"جناب آپ کہاں چلے گئے تھے؟ چپ چاپ...... وہ ناراض ہو کر کہہ رہا تھا۔

"میں نے سوچا پردیس کا معاملہ ہے بھائی جان کا پتہ کر آؤں...... آؤ ایک پیالی کافی کی پلاؤں آپ کو۔"

اکبر خان تقریباً تیس برس کا ہو گا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ لیکن ملک ملک کی خاک چھاننے کی وجہ سے اس میں زندہ رہنے کی جدوجہد بڑی طاقت ور تھی۔ اس شام کافی کا بل ادا کرنے کے بعد میں نے تعارف

کا بہانہ کیا اور کمرے میں واپس آ گیا۔ اگلے روز میں پھر صبح سویرے نکل گیا اور رات گئے واپس آیا۔ اس سے اگلی صبح میں دیر تک سوتا رہا۔ ناشتہ کرنے کے بعد جب واپس آیا تو وہ ہوٹل کی سیڑھیوں پر بیٹھا تھا لیکن کچھ تھکا تھکا سا اور بیمار سا......

"کمال کر دیا ہے آپ نے۔ مجھے بتایا ہی نہیں آپ نے۔ ترکی بڑا خطرناک ملک ہے...... اکیلے گھومتے رہے بھائی جان...... آؤ پھر کسی ہوٹل میں ناشتہ وغیرہ کریں۔"

"ناشتہ تو میں نے کر لیا ہے اکبر خان اور آج شام کی گاڑی سے میں یورپ جا رہا ہوں۔"

"اچھا!" اس کا چہرہ اتر گیا۔ "ناشتہ نہ کریں چلیں چائے تو پی لیں۔"

"نہیں۔" میں نے سختی سے کہا۔ "تم کیا سمجھتے ہو کہ میں بے وقوف ہوں۔" مجھے یکلخت غصہ آ گیا۔ "چائے ناشتہ...... کھانا...... مجھے الو بناتے ہو...... خبردار جو اب میرے ساتھ آئے تو...... دفع ہو جاؤ۔"

اس کا اترا ہوا چہرہ زرد ہو گیا۔ "معاف کر دو بھائی جان۔" اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔

مجھے بھی فوراً ہی اپنے کیے پر ندامت ہونے لگی۔ "آؤ چائے پیتے ہیں۔"

"پر پہلے معاف کر دو۔" وہ اسی طرح ہاتھ جوڑے سیڑھیوں میں بیٹھا رہا۔ "اللہ مجھے معاف کرے۔ میں نے اپنے گھر کو چھوڑا جس میں اللہ کا دیا بہت سارا رزق تھا...... صرف جرمنی جانے کے لالچ میں۔ اب پچھلے چھ مہینے سے یہاں پڑا ہوں...... جس روز سٹیشن پر آپ سے بات چیت ہوئی تھی تو تین روز ہو گئے تھے بغیر کچھ کھائے پیئے۔ پھر آپ نے چائے پلائی۔ کھانا کھلایا۔ میں نے کبوتروں کے دانے میں سے بھی پیسے بچائے۔ آپ معاف کر دیں......"

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو ان میں اس سمندر کی نمی تھی جس کے کنارے وہ بے آسرا اور بے سہارا پڑا ہوا تھا۔

"مجھے یاد آیا اکبر خان۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میں نے تو ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا...... آؤ کسی اچھے سے ریستوران میں چلتے ہیں۔"

کالا جادو - کھوپڑیاں - سیاہ بچھو اور آفریدی

انسان خانہ بدوش ہو تو اللہ کی زمین پر اسے کردار ملتے ہیں۔ اگر ادیب ہو یا ٹیلی ویژن سے تعلق ہو تو کرداروں کے خط آتے ہیں۔ یہ کردار زندگی کی روٹین سے الگ اپنی دُنیا میں رہتے ہیں۔ ہمیں ان سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ ہم ان پر ہنس بھی سکتے ہیں لیکن...... وہ ایک مختلف سطح پر زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ خانہ بدوشی کے دوران کبھی کسی شہر میں اور کبھی کسی صحرا میں۔ اور کبھی جنگل میں ایسے لوگ ملے جو میرے سفرناموں کے کردار بنے۔ میں نے انہیں اس لیے چُنا کہ وہ مختلف تھے۔ وہ زندگی کو کسی اور طرح گزارتے تھے۔ کسی سانچے میں فٹ نہیں ہو سکتے تھے۔ ان میں تہران کا سلحدیپ تھا۔ اشبیلیہ کا وہ امریکی تھا جو رنگین موٹر سائیکل پر سفر کرتا تھا۔ ہرات کا وہ جرمن تھا جو صرف طلوعِ آفتاب دیکھنے کی غرض سے وہاں آتا تھا۔ کوہ آرارات کے دامن میں وہ ترک چرواہا تھا جو بات بے بات پر خنجر نکال لیتا تھا...... اور اسی قسم کے درجنوں کردار جو مجھے یاد رہے مجھے ہزاروں عام لوگ یاد نہیں رہے۔ جو ہماری ڈکشنری میں نارمل کہلاتے ہیں۔ لیکن وہ یاد رہے جو دوسروں سے الگ تھے۔

ادب اور ٹیلی ویژن کے حوالے سے خط آتے ہیں اور ان میں کئی ایسے لوگ ہوتے ہیں جو منفرد شخصیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان میں ایک صاحب ہیں جو مچھلیاں پکڑنے کے شوقین ہیں۔ کراچی میں رہتے ہیں اور مچھلیوں کی باتیں کرتے ہیں۔ صوابی کے قصبے خوز غشتو کے شیری ہیں جو ایک دور افتادہ گاؤں میں رہنے کے باوجود ادب پر نظر رکھتے ہیں اور کڑی تنقید رکھتے ہیں اور بے شمار لوگ ہیں جن سے میری خط و کتابت ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ میں قدرے معروف ہونے کی بنا پر خط و کتابت کر نہیں سکتا۔ ان کی شخصیت مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں ان کے جواب ضرور دوں۔

ایک ایسی ہی شخصیت ریاض آفریدی کی ہے۔

میں اسے صرف خطوں میں ملا ہوں...... موصوف اتنے دلچسپ ہیں کہ میں اپنے قارئین سے ان کا تعارف کروانا چاہتا ہوں، تاکہ لوگ جان جائیں کہ یہاں کیسے کیسے نادر اور بے مثل نمونے پائے جاتے ہیں۔ کیسے نادرالوجود پر پیار اور بے پرواہ لوگ ہیں جن کی اپنی ایک الگ دنیا ہے اور وہ کتنے مطمئن اور کتنے خوش ہیں۔ انہیں دنیا کی کوئی پرواہ نہیں کہ کون کیا کہتا ہے اور اگر ہم یہ کریں گے تو کون کیا کہے گا۔ وہ صرف وہی کچھ کرتے ہیں جو ان کا جی چاہتا ہے۔

ریاض آفریدی کا پہلا خط آیا تو میں اس کے مشاغل کی تفصیل پڑھ کر چونکا۔ یعنی ویڈیو فلمیں بنانا، شکار کرنا، فوٹو گرافی، نوادرات جمع کرنا، اداکاری کرنا اور خاص طور پر بادشاہ کی اداکاری کرنا، پرندے پکڑنا، کہانی، مضمون لکھنا، سانپ پالنا، بچھو پکڑنا، بندر اور کتے رکھنا، کالا جادو کرنا وغیرہ وغیرہ۔ میں نے سوچا یہ شخص مجھے متاثر کرنے کی غرض سے یہ سب کچھ لکھ رہا ہے۔ چنانچہ میں نے چند سطریں جواب میں لکھ دیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ موصوف واقعی یہ سب کچھ کرتے ہیں اور بڑی سنجیدگی سے کرتے ہیں۔ کوئی مسکرائے یا ہنسے انہیں کوئی پرواہ نہیں۔

میں نے لکھا کہ آپ کے سانپوں اور بچھوؤں کا کیا حال ہے؟ جواب میں لکھا کہ میرے سانپ اور بچھو سب مر گئے تھے۔ اب مئی جون میں نئے پکڑوں گا۔ اس کے ساتھ انہوں نے کم از کم ایک پالتو بچھو کی تصویر بھی روانہ کی۔

پھر لکھتے ہیں کہ "اگر ہو سکے تو جو کہانی آپ رسالوں کے لیے لکھتے ہیں وہاں فرضی تصاویر کی جگہ میری تصاویر لگا دیں۔ فرض کیجیے کہ آپ کسی عیاش اور ولن ٹائپ لڑکے کی زندگی پر روشنی ڈالیں وہاں آپ میرا سائیڈ پوز سفید موڑ والا تصویر لگا دیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" خطوں کے ساتھ وہ اپنی زندگی کی تصاویر روانہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ تصاویر بھی بے حد دلچسپ ہیں۔ ان میں سانپ، بچھو، بندر، باز، کتے، پرندے وغیرہ عام پائے جاتے ہیں۔

ایک تصویر کسی شاہانہ ڈرامے کی ہے تخت پر بادشاہ اور ملکہ تشریف رکھتے ہیں۔ غلام حاضر ہیں اور دربار کی

اکڑ کر بیٹھے ہیں۔ ان میں ایک درباری آفریدی صاحب ہیں۔ تصویر کے پیچھے لکھتے ہیں: "یہ ہے احمد ندیم کا لکھا ہوا ڈرامہ "مقتول" میں شہزادہ بین کے روپ میں درباری بیٹھا ہوا ہوں۔ میرے ہاتھ میں اصلی ہیرے کی انگوٹھی چمک رہی ہے۔ مگر افسوس ان حسد کرنے والوں نے مجھے اس ڈرامے میں سوائے درباری کے کوئی شاٹ نہیں دیا۔ کیونکہ میرا لباس بادشاہ سلامت اور دوسرے شہزادوں سے بہتر تھا۔ ہاتھ میں اصل ہیرے کی انگوٹھیاں، گلے میں اصل موتیوں کے ہار اور تاج پر اصل یاقوت لگے ہوئے ہیں۔ جبکہ بادشاہ سلامت کے گلے میں ایک ہار بھی نہیں۔ انہوں نے مجھ سے پہننے کے لیے مانگے تھے میں نے انکار کر دیا۔ بس اس کے بعد تمام اداکار مجھ سے حسد کرنے لگے۔"

ایک تصویر بقول ان کے پانچ سو سال پرانی کھوپڑی کی ہے۔ جس پر ایک سانپ بیٹھا ہے اور دو انسانی ہڈیاں ڈیکوریشن کے لیے برابر میں رکھی گئی ہیں۔ آفریدی صاحب ان کے ساتھ کالا جادو سیکھتے ہیں۔

ایک تصویر میں ایک میلے میں سٹال لگائے بیٹھے ہیں، اور ایک مشین کے ذریعے پچاس روپے فیس لے کر ہیرے اور جواہرات ٹیسٹ کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ بھی ان کا شوق ہے۔ اپنے فوت شدہ بچھوؤں اور سانپوں کی تصویر بھی روانہ کی ہے۔

پھر ان کی وڈیو فلمیں ہیں جو ابھی تک ناظرین تک نہیں پہنچ سکیں۔ ان میں وہ نجانے سائیں ہیرو ہیں۔ کتوں کے ساتھ شکار کر رہے ہیں، ٹارزن کے ساتھ خنجر آزما ہیں۔ فلم "ہیرے کی تلاش میں" ایک عرب سوداگر کے ساتھ۔ پھر جنگل میں جنگلی آدمیوں کے ساتھ لڑائی اور اس طرح کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے مناظر۔

ماچد سالو کے غار میں سے نکل رہے ہیں اور ساتھ میں ایک بندر ہے۔ ایک پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں اور کیا زبردست پوز بنا کر چڑھ رہے ہیں۔ اور ہاں پرانے سکے بھی جمع کرتے ہیں..... ان کے علاوہ گندھارا کے نمونے بھی تلاش کرتے ہیں۔ ہتھیاروں میں بھی دلچسپی ہے۔

اپنی زندگی کے بارے میں تحریر کرتے ہیں: "خاندان میرا آفریدی ہے۔ آفریدی قوم سے مفرور یا دوسرے قبیلوں کے پٹھان سخت ڈرتے ہیں۔ میرا باپ خرست (کابل) کی سرحد کا ایک جاگیردار کا بیٹا تھا،

ان کے چچاؤں نے ان کے باپ کو یعنی میرے دادا کو جائیداد کے لیے قتل کر دیا، اور میرے باپ کو جو اس وقت صرف سترہ برس کا تھا ایک کمرے میں بند کر دیا تاکہ صبح عدالت سے کاغذات لکھوا کر اس پر دستخط کر لے اور پھر اسے بھی قتل کر دیا جائے۔ رات کو کسی طریقے سے یہ کھڑکی توڑ کر وہاں سے بھاگ نکلے۔ اور ڈر کی وجہ سے پیدل ہی بھاگ نکلے اور چلتے ہوئے کوہاٹ پہنچ گئے اور وہیں مقیم ہو گئے۔ محنت مزدوری کی اور پھر ٹرانسپورٹر بن گئے۔ مجھ سے دو بڑے بھائی ہیں۔ ایک ٹرانسپورٹر ہے، دوسرا جنگلوں کی کٹائی کا ٹھیکے دار ہے۔ میں جب پیدا ہوا تو میرا باپ مر گیا......"

"میں سانپوں، ٹکٹوں، پرندوں کے بارے میں اور بچھوؤں کے بارے میں بھی خوب جانتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میرا پڑھائی کی طرف زیادہ دل نہیں لگتا تھا کیونکہ میرا خیال انہیں چیزوں میں اور سیر و سیاحت میں لگا رہتا تھا اور ویسے بھی میری انگلش کمزور ہے۔"

آفریدی صاحب ادیب بھی ہیں اور ذرا سی کوشش کے ساتھ یا بغیر کوشش کے انشائیہ نگار بن سکتے ہیں۔ ان کا ایک انشائیہ...... کل چودھویں کی رات۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"جب کہ خدا کی تمام مخلوق کائنات سے بے نیاز نیند کی گہری گھاٹیوں میں پڑی سو رہی تھی اس وقت بھی نہ معلوم کیوں چاند کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ ہر طرف سکون طاری تھا۔ دنیا کی کشتی نیند کے سکون آمیز سمندر کی سطح پر تیر رہی تھی۔ چاند کی افسردہ اور زرد روشنی میں ہلکا ہلکا درد چھن رہا تھا نہ معلوم کیوں میرے دل میں ان کی یاد نے انگڑائی لی۔ میں نے چاند کی طرف غور سے دیکھا۔ جب مجھ سے نہ رہا گیا تو میں نے پوچھا۔ اے زخمی دلوں کو بے چین کرنے والے چاند۔ سچ بتا تو آج اس قدر افسردہ اور پریشان کیوں نظر آ رہا ہے۔ آہ چاند۔"

تو آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ آفریدی صاحب اگر کسی ادبی گروپ میں شامل ہو جائیں تو بڑی آسانی سے انشائیے کے آسمان پر طلوع وغیرہ ہو سکتے ہیں۔ ان کی تحریر میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو انشائیے کے لیے لازم و ضروری ہیں۔

آفریدی صاحب نے جو وڈیو فلمیں بنائی ہیں ان کے بارے میں لکھتے ہیں: "مجھے یقین ہے کہ میری

ویڈیو فلموں کو ہر مکتبۂ فکر کے لوگ پسند کریں گے اور شاید آپ کا دل آپ کو بار بار دیکھنے پر مجبور کرے گا۔ ان کی ڈائریکشن، کیمرہ مینوں کی ہدایات جگہ کی لوکیشن سب میری اپنی ہے اور نہ ہی کوئی ریہرسل کی گئی ہے۔ میری فلموں میں ایک انگلینڈ کے انگریز نے کام کیا ہے۔ اس کی ایک بات مجھے بار بار یاد آتی "کہ تم مٹی میں پڑے ہوئے ایک نایاب پتھر ہو۔ اگر تمہیں تراش کر پالش کر دیا جائے تو دنیا کے مشہور قیمتی پتھروں میں گنے جاؤ گے..... مگر افسوس ہزارہ میں کون ہے مجھے پالش کرنے والا۔"

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ ریاض آفریدی ایک دنیا ہیں۔ ایک ایسی دنیا جسے دیکھ کر آپ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ دولت کی ہوس میں گرفتار دنیا سے الگ دنیا جس کے اپنے معصوم مشغلے ہیں۔ اپنی علیحدہ زندگی ہے۔ ان کی باتوں میں ایک بھولپن ہے۔ بچپن کی معصومیت ہے اور عیاری اور علم نہیں ہے۔

میں یہ کالم لکھ رہا تھا کہ ملتان سے قدیم تاریخ کے دانشور جناب ابن حنیف تشریف لے آئے۔ انہوں نے آفریدی کی چند تصاویر دیکھیں اور مسکرا کر کہنے لگے۔ "ڈاکٹر صاحب کیا اس قسم کے کردار ہوتے ہیں؟"

"ہاں" میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ خود ہی دیکھ لیجئے کہ کتنے دلچسپ ہیں۔"

کہنے لگے۔ "لیکن ایسے کردار صرف آپ ہی کو کیوں ملتے ہیں؟"

"اس لیے کہ میں خود اسی قسم کا ایک کردار ہوں اور وہ جان جاتے ہیں کہ یہ شخص ہمیں سمجھ سکتا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

انسان خانہ بدوش ہو تو اللہ کی زمین پر ایسے کردار ملتے ہیں۔ اگر ادیب ہو یا ٹیلی ویژن سے تعلق ہو تو کرداروں کے خط آتے ہیں۔ ریاض آفریدی بھی ایک ایسا ہی کردار ہے۔

"دریائی گھوڑوں کو شرم نہیں آتی"

چند بچوں نے مجھ سے ایک عجیب و غریب سوال پوچھا، کہنے لگے۔ چاچا جی یہ بتائیں کہ کیا جانور بھی ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں۔ میں نے کہا بھئی کچھ حضرات جانور ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں۔ لیکن وہ والے نہیں، جو چڑیا گھر میں پائے جاتے ہیں۔ بلکہ وہ والے جو تم جیسے معصوم بچوں کو اغوا کرتے ہیں، رشوت لیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ بچوں کو یہ جواب مطمئن نہ کر سکا۔ کہنے لگے نہیں نہیں چاچا جی ہم تو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا مگرمچھ ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں اور کیا سانپ بھی کارٹون دیکھتے ہیں.....

میں انہیں کیا جواب دیتا۔ انہیں پیار کیا اور چلا آیا..... لیکن میرے ذہن میں یہ فقرہ اٹک گیا کہ کیا جانور بھی ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں؟ پھر میں نے سوچا کہ فرض کیجئے، صرف کچھ دیر کے لیے فرض کیجئے کہ جانوروں کی ایک دنیا ہو ایک ملک ہو تو ظاہر ہے وہاں ان کا ایک ٹیلی ویژن ہو گا اور اس ٹیلی ویژن پر ان کی پسند ناپسند کے پروگرام پیش کیے جائیں گے تو وہ پروگرام کس قسم کے ہوں گے؟ کیا شیروں کے لیے الگ پروگرام ہوں گے۔ گیدڑوں کے لیے الگ۔ اور کیا ان کی اناؤنسر "خواتین" بھی دوپٹہ اوڑھ کر بیٹھیں گی۔ ہر حال پروگرام تو بے شمار ہوں گے لیکن ان میں جانور گھر بہت پاپولر پروگرام ہو گا۔ کیونکہ اس میں حاضرین سے مختلف سوال پوچھ کر انہیں انعامات سے نوازا جائے گا۔ تو یہ جانور گھر کیسا ہو گا؟ میرا خیال ہے کچھ ایسا ہو گا کہ.....

ٹیلی ویژن سکرین پر میزبان ہاتھ میں یا پاؤں میں مائیک پکڑے نمودار ہوتا ہے۔ یہ میزبان کون سا جانور ہو گا، اسے رہنے دیجئے بہرحال یہ ایک ذرا شوخ و چنچل عمر کا شعر سنانے والا میزبان ہو گا..... تو یہ میزبان اگر تالیاں بجائے گا اور ہال میں تشریف فرما جانور خواتین و حضرات بھی خوب تالیاں بجائیں گے۔

"میرے پیارے بہن بھائیو،" میزبان مسکراتا ہوا کہہ رہا ہے۔ "میرے شیرو، میرے گیدڑو... میرے سانپ، خرگوش، ہرن، مگرمچھ، بھیڑیئے، اژدھا، اود بلاؤ، دریائی گھوڑے، زیبرے اور اونٹ وغیرہ وغیرہ میں آپ سب کو جانور گھر میں خوش آمدید کہتا ہوں...... ایک درخواست ہے کہ کم از کم اس پروگرام کے دوران ایک دوسرے کو نوش نہ کیجیے گا۔ یہ آداب کے خلاف ہے اور بعد میں بے شک جو جی میں آئے کیجیے گا تو پہلا سوال ہے کہ جنگل کے بادشاہ کا کیا نام ہے۔ جی تو میرے ہال میں سے کون جواب دے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہال میں بہت ساری دمیں اور پاؤں کھڑے ہیں۔ جی تو آپ دریائی گھوڑے صاحب آپ بتائیں گے۔"

"جی میں تو دریا میں رہتا ہوں جنگل میں نہیں۔ ویسے دریا میں میں بادشاہ ہوں۔"

"اوئے گھوڑے اوئے گھوڑے" ہال میں نعرے لگتے ہیں۔ "اوئے بادشاہ بنتے ہو شرم نہیں آتی۔"

"گھوڑوں کو شرم نہیں آتی۔ اور دریائی گھوڑوں کو تو بالکل نہیں آتی۔ انہوں نے دریا میں نہانا ہوتا ہے کپڑوں کے بغیر" دریائی گھوڑا جواب دیتا ہے۔

اس دوران ہال کے ایک کونے سے ایک عجیب و غریب آواز آتی ہے۔ جیسے کوئی خراٹے لے رہا ہو اور پھر ایک رعشہ زدہ شیر اپنی طرف سے گرج کر کہتا ہے۔ "اوئے میں ہوں جنگل کا بادشاہ شیر۔"

"بڈھا شیر، بڈھا شیر" ہال میں پھر نعرے لگتے ہیں۔

"خواتین و حضرات براہِ مہربانی انسانوں جیسی حرکات نہ کریں اور خاموشی سے سوالوں کے جواب دیں۔" میزبان تنگ آکر کہتا ہے۔

"اگر خاموش رہیں گے تو سوالوں کے جواب کیسے دیں گے۔" ایک خرگوش معصومیت سے کہتا ہے۔

"کوئی شعر سنا دیجیے سر" ایک لومڑی فرمائش کرتی ہے۔

"میں سناؤں۔" ایک شوخ لومڑ اٹھ کر کہتا ہے...... عرض کیا ہے...... لومڑی لومڑی کب ہوا آپ ہی لومڑی ہوا۔ کیسا ہے؟"

لومڑی شرما کر "اُف اللہ" کہتی ہے اور اپنی دم منہ پہ رکھ لیتی ہے۔

"تو جناب اگلا سوال ہے۔" میزبان ہال میں گھومتا ہوا کہتا ہے۔ "دنیا کا بلند ترین جانور کونسا ہے۔"

"میں ہوں۔" ایک خرگوش کہتا ہے۔

"نہیں جی میں ہوں۔" اوپر سے آواز آتی ہے۔ ہال کے روشندان میں سے ایک زرافے کی گردن نکل آتی ہے۔

"جواب درست ہے۔" میزبان کہتا ہے۔ "لیکن، آپ نے جانور کا نام نہیں بتایا۔"

"بتا جو دیا کہ میں ہوں۔" زرافہ بلکہ زرافے کی گردن بھنّا کر کہتی ہے۔

"میں بھی تو ہوں۔" ایک اونٹ اترا کر کہتا ہے۔

"اوئے بیٹھ اوئے۔" زرافہ کہتا ہے۔

"یہ تو ہمارا اگلا مرحلہ۔ ایک عدد بکری ہے جو صاحب تین سوالوں کے جواب درست دیں گے۔ ان کو یہ بکری انعام میں دی جائے گی۔ صرف تین غلطیوں کی گنجائش ہے تو آیئے گیدڑ صاحب آپ سے سوال پوچھتے ہیں۔ پہلا سوال ہے کہ آپ کی زندگی کتنی ہے؟"

"میں سو سال کا ہو چکا ہوں۔" گیدڑ اطمینان سے جواب دیتا ہے۔

"جواب تو درست ہے لیکن یہ فرمایئے کہ شیر کی ایک دن کی زندگی سے یہ زندگی بہتر ہے؟"

"آپ ذرا حساب لگا کر دیکھ لیجیے کہ اگر شیر ایک دن جیتا ہے اور ایک گیدڑ سو سال جیتا ہے تو گیدڑ کی ایک زندگی میں کتنے لاکھ شیر اب تک جاں بحق ہو چکے ہیں۔"

"اچھا تو گیدڑ صاحب اگلا سوال ہے کہ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا؟"

"کسی نہ کسی نے تو دیکھا ہو گا ورنہ ہمیں کیسے پتہ چلا کہ جنگل میں مور ناچا ہے۔ یہ محاورہ ہی غلط ہے۔"

"جواب درست ہے، اچھا آپ یہ فرمائیں کہ اگر آپ بکری جیت جاتے ہیں تو آپ اس کا کیا کریں گے؟"

"میں اسے شیر بھائی کو دے دوں گا۔ مجھ سے زیادہ ان کو اس کے خون کی ضرورت ہے۔ بوڑھے

ہو چکے ہیں۔ اس لیے ان کی خوراک کا بندوبست میں ہی کرتا ہوں۔"

"یہ جانور ہمدردی کی بہترین مثال ہے..... اگلا سوال ہے جنگل میں منگل کس طرح منایا جاتا ہے؟"

"منگل کے روز۔"

"بالکل درست..... ویسے آپ بکری جیت چکے ہیں۔ لیکن یہ ضرور بتا دیجئے کہ یہ منگل آپ کس کے ساتھ منانا پسند کریں گے؟"

"وہ منگل نہیں جو منایا جاتا ہے۔ وہ بنی مون ہوتا ہے اور میں ابھی لنڈورا ہوں۔"

"گیدڑ صاحب آپ بکری کے مالک ہوئے اور چونکہ آپ نے جانور ہمدردی کی بہترین مثال قائم کرتے ہوئے اسے بڈھے شیر کو بخش دیا ہے تو آیئے بڈھے شیر سے کچھ باتیں کرتے ہیں۔ "بڈھے شیر صاحب کیا حال ہے؟"

"کوئی حال ہوتا تو آج گیدڑوں کا محتاج ہوتا۔ فرائی روسٹ کرنے والی ایک بجلی کی مشین منگا رکھی ہے تو بکری کو اس پر ٹانگ کر روسٹ کروں گا۔"

"بہت اچھے..... تالیاں" میزبان ہاتھ اونچے کر کے کہتا ہے۔ ہال اپنے پاؤں سے تالیاں پیٹتا ہے۔ کچھ جانور سیٹیاں بجاتے ہیں۔ "تو اب آپ کو موسیقی سنوائی جائے..... تشریف لاتی ہیں غزال سسٹرز" اس پر تین ہرنیاں کودتی ہوئی اسٹیج پر آتی ہیں اور لہک لہک کر "میری چیچی دا چھلا ماہی لا لیا" گانے لگتی ہیں۔ اب سیٹیوں کا شور بہت زیادہ ہے۔ گیدڑ بھی موسیقی میں مست ہے اور بے دھیانی میں سرہلاتا ہوا بڈھے شیر کے قریب چلا جاتا ہے۔ بڈھا شیر اونگھ رہا ہے ایک آنکھ کھول کر دیکھتا ہے اور پھر یکدم پنجا مار کر گیدڑ کو قابو کرتا ہے اور اطمینان سے اسے نوش کرنے لگتا ہے..... کھانے سے فارغ ہو کر وہ ہاضمے کے لیے سوڈا واٹر کی بوتل پیتا ہے اور پھر گنگنانے لگتا ہے۔

میتوں سوڈا واٹر لے دے وے روز بالما کہندی۔

جانور گھر میں ہرنیاں گا رہی ہیں اور شیر گنگنا رہا ہے اور جنگل زندہ باد۔

شیر عینک کے شیشے اتار کر صاف کرتا ہے اور پھر اپنی نقلی بتیسی اتارتا ہے اور اسے دوبارہ فٹ کرتا ہے۔

"آپ کو شیر ہونا کیسا لگتا ہے؟"

"شیر ہونا کیسا لگتا ہے۔ ہم بھی پاگل ہو جائیں گے ایسا لگتا ہے۔" شیر ایک آہ سرد بھر کر کہتا ہے۔

"واہ واہ" میزبان بال سنوارتے ہوئے داد دیتا ہے۔ "کیا شعر ہے آپ کا اپنا ہے۔"

"جی ہاں کل ہی خریدا تھا۔ برخوردار آپ کی شکل مجھے ٹھیک طرح سے نظر نہیں آ رہی۔ آپ ذرا قریب آ جایئے۔"

"اگرچہ آپ بڈھے شیر ہیں۔ پھر بھی آپ سے ڈر لگتا ہے۔ اس لیے یہی فاصلہ ٹھیک ہے..... تو بکری آپ کی ہوئی۔ میں ابھی اس کی رسی آپ کو تھما دوں گا۔ یہ فرمائیں کہ آپ اس بکری کا کیا کریں گے؟"

"روسٹ۔"

"جی؟"

"میں اسے روسٹ کروں گا..... جب سے کمزوری لاحق ہوئی ہے کچا گوشت کھانے سے پرہیز کرتا ہوں۔"

"ہم سب پیٹو ہیں"

یہ میرا اور آپ کا مشترکہ تجربہ ہے کہ کسی شادی میں شرکت کے لیے گئے۔ رسمِ نکاح اختتام کو پہنچی۔ لوگوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے مگر آنکھیں ہیں کہ اس قنات کے پیچھے جھانک رہی ہیں جہاں سے برتنوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ اشتہا انگیز خوشبوئیں اٹھ رہی ہیں۔ منصوبہ بند حضرات پہلے سے ہی ان نشستوں پر براجمان ہیں جو کھانے والے حصے کے قرب و جوار میں واقع ہیں۔ چنانچہ جونہی پردہ ہٹا کر رُخِ کھانا دکھایا گیا۔ ایک بھگدڑ سی مچی اور اسی دھکم پیل میں آپ بھی اندر پہنچ گئے۔ اب آپ پلیٹ ہاتھ میں پکڑے اس انبوہ کثیر کے اُوپر سے جھانک رہے ہیں جس کے درمیان کہیں کھانے کی طشتریاں روپوش ہیں۔ کامیاب حضرات اپنی پلیٹ کو ورلڈ کپ کی طرح سر سے اونچا اُٹھائے بیچ میں سے فاتحانہ طور پر برآمد ہو رہے ہیں اور ہر پلیٹ میں گوشت کا ایک پہاڑ ہے جسے وہ کھائیں گے نہیں بلکہ نوچ نوچ کر اِدھر اُدھر پھینکتے رہیں گے۔ اس وقت آپ بالکل ایک فقیر کی طرح پلیٹ ہاتھ میں لئے انتظار کر رہے ہیں اور آپ انتظار کرتے رہیں گے اور بالآخر چاولوں کے چند دانے اور کچھ سلاد حاصل کر کے اس مقابلے سے دستبردار ہو جائیں گے اور کھانا گھر جا کر کھائیں گے۔

آخر ہم اتنے بھوکے کیوں ہیں؟

چلیے غریب غربا تو بیچارے ترسے ہوتے ہیں کہ اپنی محدود آمدن میں روسٹ مرغ اور پلاؤ افورڈ نہیں کر سکتے اور ان موقعوں پر وہ خوراک اپنے معدوں میں اتارنا چاہتے ہیں جسے وہ بازار میں دیکھتے ہیں اور خرید نہیں سکتے۔ لیکن میں نے تو کارخانہ داروں، بڑے بڑے افسروں اور مختلف

نستعلیق حضرات کو بھی کھانے کے معاملے میں انتہائی بے صبری بلکہ بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے دیکھا ہے۔ ایسے لوگ جن کے فریج ہمہ وقت گوشت سے ٹھنسے رہتے ہیں۔

کیا یہ ہماری ازلی بھوک ہے جو ختم ہی نہیں ہوتی؟

لاہور کی گلیوں میں ہر جگہ مرغوں کے دھڑ لٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کباب، تکے، کڑاہی گوشت، مرغ حلیم، نہاری اور ہر قسم کے گوشت کھا کھا کر ہم اپنی بھوک کو ختم کرنے کی کوشش میں ہیں بدذوق اور فٹ پاتھوں کے کنارے بیٹھ کر ہم اس کڑاہی پر وحشیوں کی طرح پل پڑتے ہیں جن میں جانے کون سے جانور اور کتنے بوڑھے جانور کا گوشت تیز مصالحوں کی وجہ سے گلا ہوا اور قابلِ استعمال دکھائی دیتا ہے۔ روسٹ مرغوں کی مشینیں ایک قومی نشان کے طور پر ہر سو دکھائی دیتی ہیں۔ ایک اچھا بھلا سکوٹر سوار یا کار والا ایک غلیظ ترین ریڑھی والے کے قریب رک کر ایک روپے کی حلیم اور آدھا نان ایک مقدس فرض کے طور پر کھائے گا۔ کچھ لوگ اتنا انتظار نہیں کر سکتے کہ کڑاہی گوشت پوری طرح تیار ہو جائے۔ وہ کڑاہی کے اُوپر کھڑے ہو کر اس میں سے بوٹیاں نکال نکال کر چبائیں گے۔ اگر کچی ہوگی تو وہیں تھوک کے اُگل دیں گے۔ اگر نگلی جا سکے تو گرم گرم نگل لیں گے اور ساتھ ساتھ پبلک کی طرف دیکھتے جائیں گے کہ دیکھا بچہ، ہم خوراکیں کھا رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمیں گوشت ترک کر دینا چاہیے لیکن اسے کھانے کا کوئی طریقہ، کوئی قرینہ بھی تو ہونا چاہیے۔ کیا تہذیب صرف لباس اور اُٹھنے بیٹھنے تک ہی محدود ہوتی ہے؟ کیا خورد و نوش کی کوئی اخلاقیات نہیں ہیں؟

دراصل ہم ایک پیٹو قوم ہو گئے ہیں۔ چٹورے اور ندیدے۔ ہم کھاتے کم ہیں اجاڑتے زیادہ ہیں یا پھر ہمارے پیٹوں میں "معہپ" ہیں جو ہماری بھوک ختم ہی نہیں ہوتی اور پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ صاحب اب خوراک میں وہ لذت کہاں۔ اب تو بھوک ہی نہیں لگتی، ہمارے بزرگ تو پورا بکرا کھا جایا کرتے تھے۔ ان کو شاید یہ معلوم نہیں کہ ان بزرگ نے شاید زندگی میں ایک ہی بکرا کھایا تھا اور بکرا کھانے کے بعد کیا وہ حیات بھی رہے یہ کسی کو معلوم نہیں اور آپ تو روزانہ لاکھوں مرغ اور بکرے اجاڑتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ روزانہ گوشت خوری کے ان مقابلوں میں حصہ لیتے ہیں اُن کے پاس ایسی رقم ہوتی ہے جو وہ کسی انسانی بکرے "کو ذبح کر کے لائے ہوتے ہیں۔ انہوں نے کسی انسانی مُرغ "کو روسٹ کیا ہوتا ہے جو اتنی مہنگائی کے باوجود فٹ پاتھوں پر بیٹھے "خوراکیں" کھا رہے ہوتے ہیں اور ایسے پیٹو لوگ ملک کے پسماندہ طبقے میں شدید احساسِ کمتری پیدا کر دیتے ہیں۔ کیا پچیس روپے دیہاڑی لینے والا مزدور کبھی سوچ بھی سکتا ہے کہ وہ بال بچوں کو بھول کر چالیس روپے کا ایک روسٹ مرغ ہڑپ کر جائے؟

اصل میں ہم دوسروں کا رزق بھی کھا جاتے ہیں۔ آپ کے آگے رکھی بھاپ اڑاتی کڑھائی میں اگر دو کلو گوشت ہے تو اس میں سے آپ کا حصہ بمشکل ایک چھٹانک ہے مگر آپ وہ سارے کا سارا بکھ چکتے ہیں اور کچھ پیٹ میں اتار لیتے ہیں۔ کیا ہم گوشت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ گوشت کا ناغہ اگر دو دن کی بجائے دو ماہ کا ہو تو کیا ہم سب فوت ہو جائیں گے۔ ایسا نہیں ہوگا البتہ گوشت کی قیمتیں ضرور کم ہو جائیں گی۔

چنانچہ روسٹ مرغ، کڑھائی گوشت، سیخ کباب، تکہ لاہوری، مرغ حلیم، پشاوری اور چکن تکہ کے شوقین حضرات سے گزارش ہے کہ براہِ کرم دوسروں کا رزق مت کھائیں ورنہ ایک دن آپ کا رزق بھی ختم ہو جائے گا اور مرغوں اور بکروں کی تصویریں صرف بچوں کی کتابوں میں دیکھنے کو ملیں گی۔

"الیکشن کہانی"

کل دوپہر جب شہر سے گھر واپس آیا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرا کتا نہا رہا ہے..... میرا مطلب ہے نہلایا جا رہا ہے۔ ایک صاحب جو مجھے دیکھ کر اس طرح اُٹھے جیسے کوئی جہان سے اُٹھتا ہے۔ فارغ البال تھے اور دھوپ میں ان کی "ٹنڈ" چمک رہی تھی..... ان صاحب نے اُٹھ کر پہلے مجھے گلے لگایا اور پھر دانت نکالتے ہوئے کہنے لگے "ہائے ہائے "ناردر صاحب" میں ذرا پریشان ہو گیا کہ یہ حضرت مجھے ہائے ہائے کیوں کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے ذرا سنجیدہ ہو کر کہا "فرمایئے" انہوں نے اسی طرح دانت نکالتے ہوئے برآمدے کے فرش پر بیٹھے ہوئے ایک صاحب کی طرف اشارہ کیا جو بڑی دلچسپی سے میرے کتے کو غسل دینے میں مصروف تھے..... یہ کتا دراصل کچھ زیادہ کتا نہیں ہے اور بڑے کتے کے چوری ہو جانے کے بعد فی الحال بارہویں کھلاڑی کے طور پر صرف فیلڈنگ کر رہا تھا یعنی نفع نقصان میں شریک نہیں بھونکنے کے بارے میں ذرا تامل سے کام لیتا ہے اور ہر وقت ایک چارپائی کے نیچے گھس کر سو رہتا ہے اور رات کو ہم اُسے ٹھڈے مار مار کر اُٹھاتے ہیں کہ جاؤ چوکیداری کرو اور وہ ایک ہلکی سی چیخ کر کے پھر سو جاتا ہے..... میری بیگم کا کہنا ہے کہ ابھی بچہ ہے جب بڑا ہو جائے گا تو تمہاری طرح گھر کی چوکیداری شروع کر دے گا۔ ظاہر ہے جب یہ کتا آیا تھا نہایا نہیں تھا کیونکہ کتے عام طور پر خود غسل نہیں کرتے اور مجھے کتے نہلانے کا زیادہ تجربہ بھی نہیں..... یہ صاحب جو برآمدے میں بیٹھے میرا کتا نہلا رہے تھے میری طرف دیکھ کر کہنے لگے: "لو جی سوہنا ہو گیا ہے....."! اب میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ یہ دونوں صاحبان کون ہیں اور میرے کتے پر اتنے مہربان کیوں ہو رہے ہیں..... میری پریشانی

بھانپ کر گنجے صاحب کہنے لگے: "میں ادھر سے گذر رہا تھا تو سوچا آپ کے کتے کو نہلا دوں..... آپ کا کتا میرا کتا....."

"لیکن آپ....." میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں انہیں کیا کہوں۔

"دراصل یہ میرا ملازم ہے اور میرے کتوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ آج صبح میرے کتوں کو نہلا رہا تھا تو مجھے خیال آیا کہ اگلے روز تارڑ صاحب کے گھر کے سامنے جو کتا نما کتا کھڑا تھا اس بے چارے کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی کیوں نہ اسے بھی نہلا دیا جائے....."

"لو جی کتا تیار ہے۔" ملازم نے ہاتھ جھٹک کر کہا اور کتا خاموشی سے بیٹھا نہانے کے بعد کی ہلکی پھلکی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ "آپ ذرا اندر سے کوئی کپڑا لے کر آئیں اسے خشک کر لیں۔"

"اسے نچوڑیے گا نہیں۔" میں نے اندر جاتے ہوئے کہا..... بیگم باورچی خانے میں تھیں۔ "بھئی یہ باہر کتا کس سلسلے میں نہلایا جا رہا ہے؟"

"الیکشن کے سلسلے میں....." وہ کہنے لگی۔ "تم شہر چلے جاتے ہو اور شامت میری آ جاتی ہے ہر دو منٹ بعد گھنٹی بجتی ہے اور کوئی نہ کوئی امیدوار چندہ مانگنے والوں ایسی مسکین صورت بنائے پھاٹک کے باہر کھڑا ہوتا ہے....."

"لیکن الیکشن کا اس غسل کتا سے کیا تعلق ہے؟"

"یہ جو صاحب ہیں گنجے سے یہ امیدوار ہیں ہمارے علاقے کے..... آج صبح آ کر کہنے لگے کہ بھابھی اجازت دیجئے تاکہ آپ کا کتا نہلا دیا جائے۔ اب میں انہیں کیا کہتی..... اس سے پیشتر ایک صاحب آئے تھے وہ گوبھی کے پھول دے گئے تھے....."

"گوبھی کے پھول؟"

"ذرا ڈرائنگ روم میں جھانک کر دیکھئے۔"

میں نے ڈرائنگ روم میں جھانک کر دیکھا تو ایک کونے میں گوبھی کے پھولوں کا ڈھیر لگا تھا کم از کم دو تین درجن تو ہوں گے....." ان صاحب کے پاس ایک ریڑھا تھا اور وہ گوبھی کے پھول

سے لدا ہوا تھا پورے بلاک میں بانٹ کر گئے ہیں۔" میری بیگم نے بتایا۔

میں ایک پرانا کپڑا لے کر باہر گیا اور گنجے امیدوار کے ملازم نے میرے کتے کو خشک کیا اور کہنے لگا۔ "لو جی کتا بالکل تیار ہے..... چھوڑ دوں؟"

"چھوڑ دو۔"

اس نے کتے کو چھوڑا تو وہ کم عقل کچی مٹی میں جا کر لوٹنیاں لینے لگا اور پہلے سے زیادہ گندہ ہو گیا۔

"آپ فکر نہ کریں میرا ملازم کل آ کر اسے دوبارہ نہلا دے گا..... وہ صاحب بے حد ملائمت سے بولے اور اس خاکسار کو یاد رکھیے گا..... نام تو آپ جانتے ہیں ناں؟"

"بالکل جی۔ میرا ووٹ آپ کے لئے ہے آپ فکر نہ کریں..... اور کتا نہلانے کا شکریہ۔" انہوں نے جھک کر ہاتھ ملایا اور چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد ایک اور حضرت آ گئے..... "میں جمہوریت پسند ہوں....." وہ دانت نکال کر بولے۔

"اچھا..... بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

"میں جمہوریت پسند ہوں۔" انہوں نے پھر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "میں بھی آپ ہی کو تلاش کر رہا تھا۔"

"کیوں؟" وہ گھبرا گئے۔

"مجھے بھی تھوڑی سی جمہوریت چاہیئے تھی اور آپ ساری کی ساری لے گئے تھے۔"

"جی؟..... وہ ذرا پریشان ہوئے۔ "بہر حال مجھے یاد رکھیے گا..... اور وہ جو گوبھی بانٹ پھر رہے ناں اُسے ووٹ نہ دیجئے گا..... دراصل آج صبح وہ سبزی منڈی میں گوبھی کا ریڑھا فروخت کرنے کے لیے لے گیا تھا چونکہ ان دنوں گوبھی کا ریٹ بہت نیچے گر گیا ہے اس لیے اس نے اپنے علاقے کے ووٹروں میں بانٹ دی تھی....."

نیز توکل کا قصبہ ہے اور آج صبح سے پھر گھنٹی بجتی ہے اور کوئی صاحب چاول یا حلیم وغیرہ کا برتن اٹھائے کھڑے ہوتے ہیں: "یہ میاں صاحب نے دیگ دی تھی، یہ قریشی صاحب کی طرف سے ہے، یہ خان صاحب نے بھجوائی ہے......"

"اور جونہی چاولوں والا برتن واپس کرتے ہیں اسی لمحے امیدوار صاحب بھی نازل ہو جاتے ہیں: "وہ چاول پہنچ گئے ناں؟ میں نے ملازموں سے کہا تھا کہ پہلے میرے بھائی کے گھر پہنچا دیں۔"

"کون سے بھائی کے؟" میں پریشان ہو کر پوچھتا ہوں۔

"ہوا اس بلاک میں آپ ہی تو ہمارے بھائی ہیں...... بس خیال رکھیے گا۔"

"جی بالکل......" میں عاجزی سے کہتا ہوں۔ "اور چاولوں کے لیے شکریہ...... ویسے آپ اس علاقے کے مسائل حل کرنے کے لیے کیا کریں گے؟"

"کون سے مسائل؟" وہ ہنس کر کہتے ہیں۔ "یہاں تو اللہ کے فضل سے کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں؟......"

"اور یہ جو ٹوٹی ہوئی سڑک ہے اور بلبوں کے بغیر کھمبے ہیں اور ابلتے ہوئے گٹر ہیں اور...... چلڈرن پارک میں اودھم مچاتے کرکٹ کے شوقین نوجوان ہیں...... یہ مسائل نہیں ہیں؟"

"اچھا یہ مسائل؟...... یہ حل ہو جائیں گے بالکل ہو جائیں گے۔" انہوں نے سر ہلایا اور چلے گئے۔ ساتھ والے پھاٹک پر دستک دی۔ ہمارے ہمسائے باہر آئے تو ان کی آواز مجھ تک پہنچی: "وہ چاول پہنچ گئے ناں؟ میں نے ملازموں سے کہا تھا کہ پہلے میرے بھائی کے گھر پہنچا دو......"

ہمارے علاقے میں ایک اور صاحب بھی امیدوار ہیں۔ معاف کیجیے گا کینڈی ڈیٹ ہیں۔ ان سے پوچھئے کہ کیا آپ بھی امیدوار ہیں تو جواب میں کہیں گے کہ جی نہیں میں تو کینڈی ڈیٹ ہوں۔ ...... ان کینڈی ڈیٹ صاحب کو الیکشن میں کھڑا ہو جانے کا چسکا ہے۔ تقریباً دس برس پیشتر یہ کسی الیکشن میں کھڑے ہوئے اور پھر بیٹھے نہیں کھڑے ہی رہے۔ الیکشن بلدیاتی اداروں کا ہو یا

قومی اور صوبائی اسمبلیوں کا یہ صاحب کھڑے رہتے ہیں اور یوں کھڑے رہتے ہیں کہ ایک ہی مرتبہ ہزاروں پوسٹر با تصویر چھپوائے ہیں اور ہر بار ان کو دیواروں پر خود ہی چسپاں کر دیتے ہیں۔ اس پوسٹر میں کینڈی ڈیٹ برائے...... چھپا ہوا ہے اور وہ الیکشن کی مناسبت سے بریکٹ کے آگے کونسلر، ایم پی اے، ایم این اے وغیرہ ہاتھ سے لکھ لیتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی الیکشن نہیں ہوتا اور وہ اپنی بوریت دور کرنے کی خاطر دیواروں پر پوسٹر بہر طور لگا دیتے ہیں۔

اس الیکشن کہانی کا کلائمکس ابھی تھوڑی دیر پہلے پیش آیا ہے اور اسی لیے میں نے یہ کالم لکھا ہے...... سب سے پہلے تو وہ گنجے صاحب تشریف لائے جنہوں نے گھی نہلوایا تھا اپنی ذاتی سپرویژن میں، اور کہنے لگے "آپ سے یہ امید نہ تھی، ادیب اور صحافی تو قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں اور آپ...... مجھ سے اپنے نجس اور ناپاک کتے نہلاتے رہے......"

میں نے پوچھا کہ جناب ہوا کیا ہے؟

انتہائی غصے کے عالم میں کہنے لگے "ووٹروں کی فہرست میں آپ کا تو نام ہی نہیں ہے؟"

میں نے سر جھکا کر کہا "ہاں پہلے مال روڈ پر رہتا تھا یہاں آیا تو ووٹ ساتھ لے کر نہیں آیا۔"

"تو پھر خواہ مخواہ کتے نہلواتے رہے ہم سے" وہ غضبناک حالت میں چلے گئے۔

پھر وہ گوبھی والے حضرت تشریف لے آئے اور وہ بھی غصے میں اپنی گوبھیاں اٹھا کر لے گئے...... ظاہر ہے اب چاول بھی نہیں آئیں گے...... دیکھیں ہم جمہوریت کی تلاش میں در بدر ہو رہے ہیں اور ہمارا ووٹ ہی نہیں ہے۔

بیس کاروں کا سوال ہے بابا

میں ان دنوں بیس کاروں کی تلاش میں ہوں.....

جی ہاں دو کاروں کا تو بندوبست ہو گیا ہے باقی رہ گئیں بیس تو میں ان کی تلاش میں ہوں۔ شہر کے مخیر حضرات اور دریا دل حضرات کی طرف دیکھ رہا ہوں کہ وہ میری مدد کو آئیں۔ مجھے روپیہ پیسہ نہیں بلکہ بیس کاریں درکار ہیں۔ ہے کوئی سخی بابا جو میری مشکل حل کر دے؟.....

قصہ دراصل یہ ہے کہ چائے ایک مرتبہ پھر پچھلے سے پوری رازداری سے مہنگی ہو گئی ہے اور اسی وجہ سے میں کاروں کی تلاش میں ہوں۔ ہر دوسرے ہفتے جب چائے کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے تو میں اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتا تھا کہ میں اب دن میں چھ پیالیوں کی بجائے صرف ساڑھے پانچ پی لوں گا تو گھریلو بجٹ میں کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن صاحب مجھ سے چوری سے جاتا ہے چائے سے نہیں جاتا۔ میرا مطلب ہے چائے ایک ایسی لت ہے جس کی پیالیوں میں کمی نہیں ہو سکتی اسے آپ شرفا کی ہیروئن بھی کہہ سکتے ہیں لیکن ہیروئن کی طرح اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے ملک بھر میں کوئی کلینک کوئی ہسپتال نہیں ہے اس لئے اس کے شیدائی اسے پینے پر مجبور ہیں اور چائے کمپنیاں ان کی مجبوری سے ہمیشہ فائدہ بالکل ناجائز فائدہ اٹھاتی رہتی ہیں۔ میں شاید موضوع سے ہٹتا جا رہا ہوں دراصل صبح سے صرف دو پیالی چائے پی ہے اس لئے حاضر دماغی دھیرے دھیرے غائب دماغی ہو رہی ہے بہر حال جونہی چائے مہنگی ہوئی میری بیوی نے گھریلو بجٹ کو بیلنس کرنے کے لئے مزید رقم کا مطالبہ کر دیا......

"تم اچھی طرح جانتی ہو بیگم کہ یہ ممکن نہیں ہے۔" میں نے عرض کیا "میرے پاس پیسے ہوتے تو

میں بیٹے کے سلیپر پہنے رہتا ہوں؟ اب وہ ہر دو منٹ کے بعد آ کر کہتا ہے کہ ابو! ذرا میرے سلیپر دیجئے گھنٹی بجی ہے میں نے باہر جا کر دیکھنا ہے کہ کون ہے اور خاص طور پر اس وقت کہتا ہے جب میں کسی نوجوان ادیب کو وجودیت کے فلسفے پر لیکچر دے رہا ہوتا ہوں۔ قصہ مختصر میں کسی سے مزید قرض نہیں لے سکتا۔"

"تو پھر کوئی کرتب سیکھ لو۔" وہ اطمینان بھری آواز میں بولی۔

"کرتب؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس سے بڑا کرتب اور کیا ہو گا کہ میں قلم کے ذریعے روزی کماتا ہوں۔ کیا یہ کرتب کم ہے کہ لاہور کی مال روڈ پر صبح کے وقت حادثہ کئے بغیر ڈرائیو کر سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں اب تک زندہ ہوں جبکہ ہر روز مجھے بتایا جاتا ہے کہ کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ جان قربان کر دیں گے۔ خون کا آخری قطرہ بہا دیں گے۔ ہمارا خون رنگ لائے گا وغیرہ وغیرہ اور میں نے ابھی تک قربانی نہیں دی اور خون کا کوئی بھی قطرہ نہیں بہایا سوائے شیو کرتے ہوئے تو کیا یہ سب کرتب نہیں؟"

"میں چائے کے حوالے سے بات کر رہی تھی۔" بیگم ہنس کر کہنے لگی۔

"چائے کے حوالے سے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "چائے کے ساتھ کیا کرتب ہو سکتا ہے؟"

"سنو!" وہ منتظر سی ہو کر بولی۔ "ایک کار ہمارے پاس ہے اور دوسری بھائی جان سے مانگ لیں گے......"

"کیا دنیا کے گرد کاروں کی دوڑ منعقد کرنے کا ارادہ ہے کیا؟"

"سنو تو سہی...... اور تمہارا پرانا موٹر سائیکل ابھی تک مستری کی دکان پر پڑا ہے۔ زنگ کھا رہا ہے اور اس کی قیمت پانچ سو سے زیادہ نہیں لگ رہی تو تم یہ کرو کہ کہیں سے بیس کاروں کا بندوبست کرواؤ اور اپنے موٹر سائیکل پر سوار ہو کر ان کاروں کے اوپر سے چھلانگ لگا دو، ہماری تمام مالی مشکلات حل ہو جائیں گی......"

"لیکن میں تو......" میں ہکلانے لگا۔ "میں تو...... میں یہ کیسے کر سکتا ہوں؟"

ساری عمر تم نے موٹر سائیکل پر گزاری ہے اتنا ذرا سا کام بھی نہیں کر سکتے ! سنو...... جب تک کوئی شخص کرتب نہ دکھائے اس کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا...... سیاست، کاروبار، دنیاداری میں کرتب دکھانے والے ہی سامنے آتے ہیں۔ تم اگر عالم چنا ہوتے تو میں تمہارے کندھوں پر چڑھ کر ہوتے "یعنی اور تمہیں درجنوں ملازمتیں اور نقد رقوم دی جاتیں۔ اگر تم ایک بلا مار لیتے تو دنیا ساری دیناں...... اب کم از کم یہ تو کرو کہ بائیس کاروں پر سے اپنے موٹر سائیکل پر چڑھ کر چھلانگ لگا دو اس سلطان گولڈن کی طرح...... یوں ساری عمر رزق حلال کے لئے دھکے کھاتے رہو گے اور کوئی نہیں پوچھے گا۔"

"لیکن بیگم ایک قباحت ہے......" میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "اگر میں بائیس کاروں کو عبور نہ کر سکا اور درمیان ہی میں کریش کر گیا تو؟"

"تو بھی کچھ نہیں ہوگا۔ گولڈن بھی پہلے تو گر پڑا تھا لیکن انعام پھر بھی مل گیا۔ اب حساب لگاؤ کہ بائیس کاروں کو عبور کرنے کے اسے ساڑھے چار لاکھ وصول ہوئے۔ یعنی فی کار تقریباً بیس ہزار روپیہ تو اگر تم تین چار کو بھی عبور کر جاؤ تو اتنی رقم مل جائے گی جتنی تم ڈرامے، کالم اور کتابیں لکھ کر برسوں میں کماتے ہو، کیا خیال ہے؟"

تو خواتین و حضرات وہ دن اور آج کا دن میں کاریں جمع کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دو کا بندوبست ہو گیا ہے اور باقی بیس کے لئے جدوجہد کر رہا ہوں۔ آپ بھی میری مدد کیجئے اگر میں جیت گیا تو آپ کو چینی کھانا کھلاؤں گا اور اپنے نام کے ساتھ گولڈن لگاؤں گا...... کیا خیال ہے؟

"نیا سال مبارک"

ہر شخص کا ایک ذاتی اور مخصوص "نیا سال" ہوتا ہے۔ نہ صرف ہر شخص کا بلکہ ہر قوم کا نیا سال مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً انگلستان میں نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے جو طریقے ہیں وہ اخلاقیات سے خاصے فاصلے پر واقع ہوتے ہیں۔ ان میں ایک رسم ایسی ہے جو انگلستان میں رہائش پذیر پاکستانی اور دیگر غیر ملکی نوجوانوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ ساڑھے گیارہ بجے شب کے قریب جوان حضرات گھروں سے باہر نکلتے ہیں اور شہر یا قصبے کے مرکزی چوک میں چلے جاتے ہیں۔ جہاں انگریز حضرات نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ یہ خواتین و حضرات خمار کی ایسی حالتوں میں ہوتے ہیں جہاں سے ان کو ان کی خبر تک نہیں آتی اور حالات اتنے دگرگوں ہوتے ہیں کہ اگلی صبح کو کسی کو کچھ یاد نہیں آتا کہ کون کہاں تھا کیسے تھا، کس طرح تھا اور کس کے ساتھ تھا۔ چنانچہ اس صورت حال کا فائدہ غیر ملکی حضرات کو ہوتا ہے جو کم از کم اس لمحے کے لئے باہوش رہتے ہیں۔ ان مرکزی چوکوں میں پبلک منہ اٹھائے کھڑی ہوتی ہے اور کچھ اور پبلک ان پر منہ جھکائے کھڑی ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ بارہ بجتے ہیں ہی تمام خواتین و حضرات کے بھی بارہ بج جاتے ہیں بلکہ ہوش حواس کے معاملے میں تو ان کے بارہ کب کے بج چکے ہوتے ہیں اور نئے سال کے آتے تک ان کے بارہ بجتے چلے جاتے ہیں اور یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب آپ کسی بھی خاتون کو "ہیپی نیو ایئر" کہہ سکتے ہیں اور زبان سے کہہ سکتے ہیں۔ کیسے کہہ سکتے ہیں اس کی تفصیل میں جانا مناسب نہیں لیکن اسے کہا نامناسب طریقے سے جاتا ہے۔ چنانچہ یہ سادہ دل پاکستانی سارا سال اس لمحے کے منتظر رہتے ہیں۔ ان کا اخلاق ملاحظہ فرمایئے کہ انگریز خواتین کو صرف "ہیپی نیو ایئر" کہنے کے لئے سارا

سال انتظار کرتے ہیں۔ جہاں ہم نے انگریزوں کی پیروی میں سوٹ زیب تن کئے انگریزی بھول کر شیکسپیئر کی انگریزی بولنے کی کوشش میں ہانپتے رہے۔ وہاں ہم نے یہ نیو ایئر نائٹ بھی اپنا لیا کیونکہ یہ آقاؤں کا رواج تھا۔ اس لئے غلاموں نے اسے اپنے لئے ضروری سمجھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کالے انگریزوں نے اسے سینے سے لگائے رکھا۔

اس برس بھی ماشاء اللہ لاہور کے باسیوں نے نیا سال منایا۔ ایک رپورٹ کے مطابق درجنوں افراد جو نشے میں "ٹُن" تھے گرفتار ہوئے۔ چند حضرات کو نقلی پستول سے پٹاخے چلانے کے جرم میں پکڑ لیا گیا۔ میں نے ایک دوست سے پوچھا کہ بھئی یہ کھلونا پستول سے پٹاخے چلانے کو جرم کب سے قرار دے دیا گیا ہے تو وہ کہنے لگا بھولے بادشاہ ان دنوں اصلی پستول سے گولیاں چلانا جرم نہیں نقلی پستول سے پٹاخے چلانا جرم ہے۔ بہرحال میری سمجھ میں تو آج تک یہ بات نہیں آئی کہ آخر پولیس صرف اور صرف لبرٹی مارکیٹ کا رخ ہی کیوں کرتی ہے اور اسے انہی علاقوں کے شرابی پکڑنے میں کیا لطف آتا ہے کیا شرابی شہر کے دیگر حصوں میں نہیں پائے جاتے؟ میرا خیال ہے پولیس بھی ذرا بے تکے موڈ میں ہوتی ہے اور نیا سال منانے کی خاطر لبرٹی مارکیٹ اور حسین چوک میں آ جاتی ہے ویسے بھی پولیس ذرا ماڈرن ہو گئی ہے۔ تازہ ترین کاروں میں گھومتی پھرتی ہے اور پچھلی نشستوں پر بیٹھ کر سگریٹ پیتی ہے بلکہ کون آئس کریمیں کھاتی ہے۔ دوسری بات جو میری سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ ہے کہ آخر یہ خمار آلود حضرات نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے لئے اپنے ٹھکانوں سے باہر کیوں آ جاتے ہیں اور گلبرگ کی لبرٹی مارکیٹ میں ہی کیوں آ جاتے ہیں جبکہ ہر کوئی جانتا ہے کہ نئے سال کی رات کو وہاں پولیس ہوگی اور وہ آپ کو پکڑے ہی پکڑے۔ میرا خیال ہے یہ بی چوہے والا کھیل ہے جو ذرا نشے میں ہو تو نچلا نہیں بیٹھ سکتا اور دم پر کھڑا ہو کر کہتا ہے آج بی کہاں ہے؟ شاید نئے سال کو خوش آمدید کہنے والے حضرات بھی ذرا پی کر ترنگ میں آتے ہیں اور سیدھے لبرٹی مارکیٹ کا رخ کرتے ہیں۔ ایک صاحب جو ان معاملات کے ایکسپرٹ ہیں کہنے لگے کہ جناب اس میں پینے والوں کا کوئی قصور نہیں کیونکہ شروع میں آدمی سمجھتا ہے کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا پھر وہ ذرا اطمینان سے

سانس لیتا ہے اور دو چار چڑھانے کے بعد کہتا ہے کہ تو بی ہم کس سے ڈرتے ہیں اپنے پلے سے پیتے ہیں اور [illegible] ایسے بوتل میز پر رکھ دے ...... اچھا بوتل میز پر رکھ دیتا ہے اور پھر پولیس آ جاتی ہے۔

نئے برس میں ایک اور کھیلا ہو گیا اور وہ یہ "بیک فٹ" کا چکر تھا۔ زمین کی گردش اور انسان کے بنائے [illegible] کلاک آپس میں ربط قائم نہیں رکھ سکے اور بارہ بج کر ایک سیکنڈ پر نیا سال آیا دنیا بھر کی گھڑیوں کو ایک سیکنڈ پیچھے کیا گیا تاکہ زمین کی گردش کا ساتھ دیا جا سکے۔

اور وہاں ایک اور بات بھی جسے ہمیشہ مانا جاتا ہے کیونکہ وہ بوتل میز پر رکھ دیتا ہے ورنہ "شرفا" تو اپنے گھروں میں آتش دانوں کے سامنے بیٹھ کر دوست احباب کے ہمراہ پیتے ہیں۔ یا اگر نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے لئے باہر بھی نکلیں تو ڈرائیور کار چلاتا ہے اور ان کی چیکنگ بہت کم ہوتی ہے کیونکہ سال نو کی شب میں نے تو گھر میں ہی گزاری بلکہ خیال ہی نہ رہا کہ آج شب ہنگامہ ہے ذرا لبرٹی مارکیٹ کی رونق دیکھتا۔ ہاں البتہ اس کی تفصیل اگلے روز اخباروں میں پڑھی۔ اور اگلے ہی روز جب میں گوالمنڈی گیا تو وہاں بھولے سے ملاقات ہو گئی جو اپنی ریڑھی کے گرد [illegible] رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ بھولے سے پوچھا جائے کہ اس نے سال نو کس طرح منایا اور اسے کس طرح خوش آمدید کہا چنانچہ میں نے اس سے یہی کچھ پوچھا۔

"نواں سال؟" بھولے نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے لہجے میں حیرت تھی "کون سا نواں سال باؤ جی؟"

"کمال ہے بھولے..... تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ کل پچھلے سال کی آخری رات تھی اور آج نئے سال کا پہلا دن ہے۔" میں نے جھنجلا کر کہا "تو شہر بھر میں شرفا نے نئے سال کو خوش آمدید کہا تم نے نہیں کہا؟"

"کیا نہیں کہا؟" وہ منہ کھول کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"بھئی خوش آمدید" میں نے مزید جھنجلا کر کہا "بھولے تم یہ تو جانتے ہو ناں کہ آج جنوری

کی پہلی تاریخ ہے اور سن ۸۸ء کا آغاز ہو چکا ہے؟"

"نہیں جب......" بھولے نے سر ہلایا اور زور زور سے ہلایا "میں تو ان پڑھ آدمی ہوں باؤ جی تاریخ کا مجھے کچھ پتہ نہیں۔"

"عجیب شخص ہو نئے سال کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اچھا یہ بتاؤ کہ نئے سال کے لئے تمہارا کیا ارادہ ہے یعنی کہ اس برس تمہاری کیا خواہش ہے؟"

"میری خواہش جی؟" بھولے نے سوچتے ہوئے کہا "باؤ جی میرا ارادہ تو یہ ہے کہ مجھے اللہ اسی طرح حق حلال کی روزی دیتا جائے اور آج شام سے پہلے پہلے میرے سارے مالٹے فروخت ہو جائیں یہ میری خواہش ہے۔"

واقعی عجیب شخص ہے میں نے مایوسی سے سر ہلایا دنیا نے بیرونی مارکیٹ میں نیو ایئر منایا اور یہ بازار حسن میں گانا سننے گیا نہ مہنگی ترین کاروں میں شراب پی کر گھوما اور یہ بھی نہیں جانتا کہ آج نئے سال کا پہلا دن ہے اور خواہش کیا کر رہا ہے؟ ویسی یہ کہ اللہ میاں حق حلال کی روزی دیتا ہے اور شام سے پہلے سارے مالٹے فروخت ہو جائیں عجیب شخص ہے۔

"خریدا ہُوا جن واپس نہیں ہوگا"

میں نہایت پریشان حال بدحال بیٹھا تھا اور شاید قدرے آبدیدہ بھی تھا کہ خلیفہ خلاف شادیانہ آگئے اور انہیں دیکھ کر میں نے ایک نہایت سرد آہ بھری اور اس کی سردی سے خلیفہ تھوڑا سا ٹھٹکے اور پھر ایک جھرجھری لے کر بولے۔

"آخر ہوا کیا ہے؟"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس آہ بھر کر ناک پر رومال رکھا اور ایک لمبی شوں کر کے کہنے لگا۔

"زندگی کیا ہے غم کا دریا ہے۔"

اس پر خلیفہ ناراض ہو گئے "ایک تو تم ناشکرے بہت ہو اور یہ فقرہ کہ زندگی کیا ہے غم کا دریا ہے تو تمہارا تکیہ کلام ہو گیا ہے؟"

"نہیں خلیفہ!" میں نے سر ہلایا۔ "میرا تکیہ کلام تو گزارہ نہیں ہوتا ہے اور ایک عرصے سے ہے......"

"بہر حال اب کیا ہوا ہے؟" وہ ناک چڑھا کر بولے۔

"ہونا کیا ہے گزارہ نہیں ہوتا...... سوری خلیفہ گزارہ تو ہو رہا ہے۔ لیکن ذرا بوکھلا سا ہو رہا ہے...... میرا دل کہہ رہا ہے کہ پیسے زیادہ کرو اور میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اگر ایک سو یہ کھو کر بڑھاؤں تو وہ ہر ماہ سو روپے کا بوجھ بڑھ جائے گا...... یہ سو روپیہ کہاں سے آئیگا؟"

"کہاں سے آئے گا؟" خلیفہ بگڑ کر بولے۔ "کمال ہے سو روپے کی کیا حیثیت ہے۔ تم عجیب گھٹیا آدمی ہو سو روپے کے لئے فکر کرتے ہو۔ یہاں ان دنوں تو شہزادہ لندن اور امریکہ وغیرہ کا پھیرا لگاتے ہیں اور واپس آ کر ایک کوٹھی دو چار پجیرو اور دس مربع زمین خرید کر بقیہ عمر یاد الٰہی میں گزار دیتے ہیں......"

"اور اگر پکڑے جاؤ تو؟"

"تو بھی بقیہ زندگی یادِ الٰہی میں گزارتے ہیں۔ لیکن ذرا جیل میں گزارتے ہیں۔" خلیفہ مسکرایا اور بڑی کائیاں مسکراہٹ مسکرایا۔

"نہیں خلیفہ میری معاشی بدحالی کو دور کرنے کے لیے کوئی اور طریقہ سوچو...... میں جیل جانے کے لیے بہت مشہور آدمی ہوں بدنامی ہوگی۔"

خلیفہ نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ "ارے تم کہاں کے مشہور ہو...... یہاں تو بڑا بڑا نامور شخص اور بڑا خاندانی شخص ان کاموں میں پکڑا گیا۔ اور جو نہیں پکڑا گیا وہ بھی ظاہر ہے نامور اور بڑا تھا......"

"نہیں کوئی اور طریقہ سوچو میرا ایسے گزارہ نہیں ہوتا......"

خلیفہ سوچ میں پڑ گیا اور خاصی دیر پڑا رہا۔ پھر تنگ آ کر اٹھا یا تو مسکرا کر کہنے لگا۔ "تم ایک عدد جن خرید لو۔"

"جن؟......" میں نے منہ کھول کر پوچھا "وہ جو شراب ہوتی ہے؟"

"نہیں نہیں وہ جو ہوتی نہیں ہے بلکہ سچ مچ کا جن ہوتا ہے......"

"میں ایک جن خرید لوں؟" میں نے ایک زہر آلود مسکراہٹ کے ساتھ کہا "کسی روز انار کلی جاؤں اور ہر دکان سے پوچھوں کہ جناب عالی آپ کے پاس ایک عدد جن ہوگا برائے فروخت مجھے ذرا سستا سا جن چاہیے اور بہت بڑا بھی نہ ہو۔ بس میڈیم سائز کا ہو...... شکل صورت سے بہت زیادہ جن نہ لگے...... یہ کروں؟"

خلیفہ سر ہلانے لگا جیسے میرے مستقبل سے مایوس ہو گیا ہو۔ "میں سنجیدگی سے مشورہ دے رہا ہوں اور تم مسخرے ہو رہے ہو...... اچھا تو پھر ٹھیک ہے تمہاری زندگی غم کا دریا ہی رہے رہے گی میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا لیکن پھر دھڑام سے بیٹھ گیا کیونکہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا تھا۔ "ناراض نہ ہو جایا کرو خلیفہ جی، ہم حالات کے ستائے ہوئے لوگ ہیں۔ آپ کو کیا پتہ کہ اکثر اوقات ہماری جیب میں دس روپے بھی نہیں ہوتے۔ چلیے خرید لیتے ہیں جن......

انہی دنوں خرید لوں یا ذرا انتظار کر لوں شاید ان کی کلیئرنس سیل لگ جائے کہ پہلے آئیے پہلے پائیے کی بنیاد پر ہر قسم اور ہر سائز کے جن محدود سٹاک ہے آپ کی پسند کا جن...... جنوں کی واپسی...... خریدا ہوا جن واپس نہیں کیا جائے گا وغیرہ وغیرہ......"

خلیفہ پھر ناراض ہو کر اٹھنے لگا لیکن میں نے اس کا کندھا دبا کر پھر بٹھا لیا۔ "نہیں بالکل سنجیدگی سے بتاؤ کہ جن کہاں سے خریدوں؟"

"تو سنو......" خلیفہ کہنے لگا۔ "میرے ایک دوست ہیں بٹ صاحب...... محکمہ اوقاف میں کام کرتے ہیں اور محکمے کی جانب سے مختلف مزاروں اور درگاہوں وغیرہ پر جا کر حساب کتاب کرتے ہیں۔ چند برس پیشتر محکمے نے ان سے کہا کہ سندھ کے ایک دور افتادہ علاقے میں جن فروخت ہو رہے ہیں......"

"کھلے بندوں جن فروخت ہو رہے تھے؟"

"تم سنتے ہو یا میں جاؤں؟" خلیفہ پھر گرمی کھا گیا۔ "تو بٹ صاحب ایک بس پر سوار ہو کر ایک چھوٹے سے قصبے میں پہنچے وہاں سے دریافت کیا کہ یہ جن کہاں ملتے ہیں تو انہوں نے ایک کچے راستے پر ڈال دیا۔ بٹ صاحب کو کئی کلومیٹر پیدل چلنا پڑا اور جب وہ "جن شو" پر پہنچے تو گرمی، بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو چکے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک کچی کوٹھی کے اندر ایک صاحب آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور جن فروخت کر رہے تھے باہر جن خریدنے والوں کا ہجوم تھا۔ ایک کارندہ ایک ایک شخص کو اندر بھیجتا تھا اور وہ شخص جب باہر آتا تو اس نے مٹھیاں بند کر کے آسمان کی جانب اٹھائی ہوتی تھیں اور خوشی کی وجہ سے نعرے لگا رہا ہوتا تھا۔ جب بٹ صاحب اندر گئے تو جن فروش نے پوچھا کہ...... "کتنے لوگے؟"

"بھاؤ کیا ہے؟" بٹ صاحب نے پوچھا۔

"پانچ روپے کا جوڑا۔" انہوں نے کہا۔

"یہ تو بہت مہنگا ہے۔" بٹ صاحب نے اعتراض کیا۔

"چلے جاؤ۔" ان صاحب نے گرج کر کہا۔ اس پر بٹ صاحب نے پانچ روپے نکال کر پیش

کر دیے۔ ان صاحب نے پانچ روپے جیب میں ڈالے اور آس پاس کی ہوا میں ہاتھ چلانے لگے ...... بایاں ہاتھ چلاتے ہوئے بولے "پکڑ لیا" پھر دایاں ہاتھ چلانے لگے۔ بالآخر وہاں بھی کامیاب ہوئے اور کہنے لگے "پکڑ لیا"۔ اب کیفیت یہ تھی کہ ان صاحب نے اپنی دونوں بند مٹھیاں بٹ صاحب کے سامنے کیں اور کہنے لگے "لو سنبھالو"۔ بٹ صاحب نے اگرچہ بہت بیوقوف محسوس کیا اپنے آپ کو لیکن اپنی مٹھیاں بند کر کے ان دونوں جنوں کو پکڑ لیا ...... "بھولے لگتے ہیں کوئی چھوٹا سا جن نہیں ملے گا" بٹ صاحب نے کہا اور وہ صاحب پھر گرجے "چلے جاؤ" ...... چنانچہ بٹ صاحب اپنی مٹھیوں میں جن پکڑے باہر آ گئے ...... ان کا کہنا ہے کہ لوگ بس کی سڑک تک اسی طرح مٹھیاں بند کر کے چلے آتے ہیں جیسے ان میں کوئی شے بند ہو ...... اور وہاں سے بس میں سوار ہو کر جنوں کو گھر لے جاتے ہیں۔ ایک صاحب بس میں سوار ہونے لگے تو غلطی سے مٹھی کھل گئی اور انہوں نے "ہائے میرا جن۔ ہائے میرا جن" کا شور مچایا۔ وہاں سے واپس گئے اور ایک اور خرید کر لے آئے ......"

یہ کہانی سنا کر خلیفہ چپ ہو گئے تب میں نے اُن کے کندھے پر ایک دھپ رسید کی اور پوچھا "خلیفہ اگر میں بھی جنوں کا ایک جوڑا خرید لاؤں تو میری مشکلات حل ہو سکتی ہیں؟ ویسے تو میری مشکلات حل کرنے کے لئے درجن بھر جن درکار ہوں گے ......"

"ہو تو سکتی ہیں"۔ خلیفہ نے سر ہلایا۔ "لیکن پرابلم یہ ہے کہ جن ختم ہو گئے ہیں۔"

"جن ختم ہو گئے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میری باری جن بھی ختم ہو جائیں۔"

"بٹ صاحب کچھ عرصہ پہلے وہاں گئے تھے اور وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ جن فروش مال بنا کر جا چکا تھا ...... اچھا بھئی خدا حافظ" ...... خلیفہ جی اٹھے اور مجھے اسی طرح پریشان حال، بدحال اور بے حال بیٹھا چھوڑ کر چلے گئے ...... خواتین و حضرات اب میرا کیا ہو گا؟ میری باری آئی ہے تو جن نہیں ملتے ...... دیکھیں مجھے یقین ہے کہ پاکستان میں کہیں نہ کہیں اس وقت بہت اعلیٰ قسم کے جن فروخت ہو رہے ہیں جو مجھے مل جائیں تو میری مشکلات حل کر دیں گے ...... کیا آپ مجھے اس جن سٹور کا پتہ روانہ کر سکتے ہیں! پلیز ......

"شیر چاہیئے شیر"

اگلے روز گوالمنڈی کی طرف جانے کا اتفاق ہوا تو چوک میں بے حد ہجوم تھا اور دو پارٹیاں گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگا رہی تھیں ایک اور پارٹی بھی تھی لیکن وہ ذرا بیمار شمار تھی اس لئے نہایت ناتوانی سے نعرے لگاتی تھی۔ ان دنوں بلدیاتی الیکشنوں کی گہما گہمی ہے اور یہ اجتماع اسی سلسلے میں تھا۔ میں قریب ہوا تو یوں لگا جیسے الیکشن لاہور کے نہیں بلکہ چڑیا گھر میں ہو رہے ہیں۔

ایک جانب سے نعرہ لگتا "ساڈا نیولا" اور عوام جواب میں گلا پھاڑ کر کہتے "آوے ای آوے"۔

پھر ایک اور نعرہ بلند ہوتا "آ گیا میدان میں" اور بقیہ پبلک "ہے جمالو" کا شور مچا کر بھنگڑے ڈالنے لگی۔

یہ تو ایک پارٹی تھی۔ اب دوسری پارٹی میدان میں آ گرجتی۔

"ساڈا لیڈر تہاڈا لیڈر ...... کرلا ای اوئے، کرلا ای اوئے"

"کرلے دے نعرے وجن گے ...... کرلا زندہ باد"

یہ تو طے ہو گیا کہ ایک پارٹی کسی نیولا صاحب کی حمایت میں چیخ رہی ہے اور دوسری کرلا صاحب کی سپورٹر ہے۔ البتہ تیسری ناتوان پارٹی اردو میں نعرے لگا رہی تھی کہ "پھونکوں سے یہ ...... چراغ بجھایا نہ جائے گا ...... پھونکوں سے یہ ......"

...... تمام نعرہ جات نہایت سنجیدگی سے لگائے جا رہے تھے اور نہایت شائستگی سے ...... جھگڑا ڈالا جا رہا تھا۔ ان نعرہ بازوں میں بھولا ریڑھی والا اور پچو پان فروش پیش پیش تھے۔

"بھولے یہ کیا ہو رہا ہے بھئی" میں نے پوچھا۔

"ساڈھا نیولا آوے ای آوے" بھولا ہاتھ کھڑے کر کے کہنے لگا۔

"کیوں میاں پچی کیا ہو رہا ہے؟"

"ساڈھا کرلا...... آوے ای آوے......" پچی بھی پر جوش انداز میں نعرہ مار کر بولا۔

"یہ تم لوگوں نے کوئی پرائیوٹ نیولے اور کرلے پال رکھے ہیں جنہیں بلا رہے ہو؟"

"نہیں باؤ جی......" بھولا ہنس کر کہنے لگا: "یہ ذرا شغل ہو رہا ہے ووٹوں کے لئے...... میں نیولے کے ساتھ ہوں اور پچی کرلے کے ساتھ ہے......"

"اور یہ تیسری پارٹی کس کی ہے؟"

"یہ جی دیوا پارٹی ہے...... آپ کو پتہ ہے نا کہ دیوا بھی کھڑا ہو گیا ہے......؟"

"نہیں مجھے تو نہیں پتہ۔"

"اچھے اخبار والے ہو سیاست کا کچھ پتہ ہی نہیں...... بہرحال اچھا ہی ہوا کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔" بھولا کہنے لگا۔ "ہم تو آپ کے گھر جانے والے تھے۔ آپ سے ایک کام ہے۔"

"اپنے امیدوار کی تصویر اخبار میں شائع کروانا چاہتے ہو......؟"

"نہیں جی......" پچی کہنے لگا "ایک اور کام ہے...... آؤ سامنے والی ہٹی پر بیٹھتے ہیں۔" ہم سامنے والی ہٹی کے تھڑے پر جا بیٹھے...... یہ ایک مخصوص اور خوبصورت گوالمنڈی سردیوں کی صبح تھی۔ دھوپ میں نرمی تھی اور آس پاس ایک ہلکا سا شور تھا۔ ریڑھی والے پھل سجائے کھڑے تھے اور تانگوں کے گھوڑے اترا اترا کر چلتے تھے۔

"ہاں بھئی کیا کام ہے؟" میں نے بھولے سے پوچھا۔

"جی ہمیں ایک شیر چاہیئے" پچی بولا "شیر" میں نے بے یقینی سے کہا "سچ مچ کا شیر یا پنجاب کا کوئی ایک شیر......"

"جناب پنجاب کا کوئی شیر نہیں چاہیئے سچ مچ کا شیر چاہیئے۔"

"اچھا" میں نے سر ہلایا۔ "آپ کو شیر چاہیئے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ شیر بھی لڈو پیٹھیاں والے

کی طرح بکتے ہیں کہ جی چاہا تو ایک عدد خرید لیا...... اور ویسے آپ کریں گے کیا شیر کا؟"

"ہم جی نیولے کو اس پر بٹھا کر اس کا جلوس نکال دیں گے......" بھولا پر مسرت لہجے میں بولا۔

"اور الیکشن کے دن اپنے نیولے کے ساتھ باندھ دیں گے۔"

"اور جی کرلے کو بھی شیر کی سواری کرائیں گے۔"

"ایک ہی شیر پر کرلا بھی اور نیولا بھی!"

"کسی کو کیا پتہ کہ ایک ہی شیر ہے یا دو الگ الگ ہیں...... ہمارے ملک میں شیروں کو کوئی نہیں پہچانتا۔"

"یہ پھر کچھ شیر کی بے عزتی نہیں کہ ایک نیولا یا کرلا اس پر سواری کرے؟"

"آپ نے شیر سے پوچھ کر اس پر نیولے کو بٹھانا ہے؟...... اسے کیا پتہ کہ اس پر کیا بیٹھا ہے؟"

"اور کیا نیولا شیر پر بیٹھ جائے گا؟"

"ہم نے اس سے پوچھ لیا ہے وہ کہتا ہے کہ میں عوام کی خاطر شیر تو کیا ہاتھی، گینڈے اور گدھے پر بھی بیٹھ سکتا ہوں۔"

"لیکن میرے والے امیدوار نے شرط پیش کی ہے...... وہ کہتا ہے کہ میں شیر پر بیٹھ جاؤں گا لیکن پہلے میری آنکھوں پر پٹی باندھنا ہو گی تاکہ مجھے پتہ ہی نہ چلے کہ میں شیر پر بیٹھا ہوں یا گدھے پر......"

"اچھا یہ تو طے ہو گیا کہ تم لوگوں کو ایک عدد شیر کی ضرورت ہے اور تم اسے خریدنے پر تلے ہوئے ہو...... لیکن تمہیں یہ کس نے بتایا کہ میں شیروں کا بیوپاری ہوں...... میں تو خود کچھ گیدڑ ہوں کہ سر جھکا کر چلتا ہوں اور رونے کی توفیق نہیں رکھتا......"

"کیا آپ شیروں سے ڈرتے ہیں؟"

"ارے نہیں" میں نے ہنس کر کہا "بیوروں والے شیروں سے کیا ڈریں گے!...... مجھے خود ایک مرتبہ شیر پالنے کا خیال آیا تھا لیکن پھر سوچا کہ بیوی کی موجودگی میں تو یہ ہے کہ ایک گھر میں دو شیر نہیں رہ سکتے۔ ویسے بھی ہماری بیگم صاحبہ کے رعب داب کا یہ عالم ہے کہ اگر شیر دو چار دن ہمارے گھر

رہ جائے تو اُسے مان جاؤں گا یہی کہ ایک روز شیر صاحب الماری کے اُوپر چڑھ کر بیٹھے رہیں گے اور دم دبا کر تھر تھر کانپ رہے ہوں گے اور نیچے ہماری بیگم کھڑی رہیں گی اور کہہ رہی ہوں گی کہ اگر شیر ہو تو نیچے اُتر کر میرا سامنا کرو بزدل کہیں کے .... شیر بنے پھرتے ہو...... اور شیر تھر تھر کانپتے ہوئے کہے گا کہ بیگم صاحبہ میں آپ کا خاوند نہیں ہوں جو یوں برس رہی ہیں۔ عزت دار شیروں کا کچھ تو خیال کریں......

"باؤ جی آپ ہماری بات ہنسی میں نہ اڑائیں" بھولا ناراض ہو گیا "آپ ہمیں شیر لے دیں"

"میں کہاں سے لے دوں شیر؟"

"ہاں باؤ جی...... اخبار میں لکھا ہے کہ پاکستان کے چڑیا گھروں میں شیروں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے کیونکہ شیر بہت پیدا ہو رہے ہیں اور اس وجہ سے چڑیا گھروں میں گنجائش سے زیادہ شیر ہیں...... اور جناب جو سیکرٹری ہیں جنگلات کے .... انہوں نے کہا ہے کہ یہ شیر کسی شوقین کو دیئے جا سکتے ہیں...... یہ دیکھئے" پپی نے اخبار کی کٹنگ جیب سے نکال کر میرے سامنے رکھ دی...... "واقعی یہی کچھ لکھا تھا"

"تو تم خود جا کر سیکرٹری جنگلات سے شیر لو مجھے کیا کہتے ہو"

"وہ بھی لکھا ہوا ہے کہ یہ شیر کسی شوقین کو دیئے جا سکتے ہیں...... ہم بھی شوقین تو بہت ہیں لیکن ہماری سفارش کوئی نہیں...... آپ ذرا سفارش کر دیں" یہ عجیب بات تھی کہ پاکستان میں شیر فالتو ہو گئے تھے سرپلس ہو گئے تھے۔ والا کہ گدھوں کے بارے میں یہ بیان زیادہ قابل فہم ہو سکتا تھا...... اگرچہ میری سفارش کچھ بہت بڑی نہیں ہے لیکن میں سیکرٹری جنگلات سے سفارش کرتا ہوں کہ وہ ایک عدد سرپلس شیر بھولے اور پپی کو عنایت کر دیں وہ بے حد شوقین ہیں اور شیر پر کرے اور نیولے کو بٹھا کر جلوس نکالنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اب شیروں کے ساتھ یہی کچھ ہو گا۔

"پائلٹ اور پلیٹ"

اسلام آباد کے بین الاقوامی ایئر پورٹ سے جیٹ طیارہ ناک اونچی کر کے فضا میں بلند ہوتا چلا گیا پھر اس نے ایک چکر لگا کر اپنا رخ شمال سے موڑ کر جنوب کی طرف کر دیا اور اطمینان سے پرواز کرنے لگا اسی لمحے جہاز کے سپیکر میں سے آواز آئی خواتین و حضرات آپ کا کیپٹن آپ سے مخاطب ہے۔ اس وقت ہم سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں۔ ہماری رفتار ساڑھے سات سو میل فی گھنٹہ ہے اور انشاء اللہ تیس منٹ میں ہم لاہور پہنچ جائیں گے...... امید ہے آپ کا سفر خوشگوار گزرے گا شکریہ......" اس اعلان کو انہوں نے غور سے سنا جو پہلی بار سفر کر رہے تھے اور جو سفر کرتے رہتے تھے وہ جمائیاں لیتے رہے کہ کب اعلان ختم ہو اور وہ ذرا اونگھ لیں۔ میرے برابر میں ایک لحیم شحیم نوجوان جین اور نیلی بنیان میں بیٹھا تھا۔ اس کی انگوٹھی میں ایک بڑا پتھر تھا اور گھڑی سونے کی تھی اور وہ ان دونوں کی نمائش مناسب طریقے سے کر رہا تھا۔

"آپ کا کیا شغل ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"جی؟" اس کا منہ کھل گیا...... "میں کوئی شغل نہیں کرتا ہوں اللہ بچائے شغل سے"

"نہیں میرا مطلب ہے کہ آپ کیا کاروبار کرتے ہیں؟"

"میں پائلٹ ہوں......" اس نے مسکرا کر کہا...... اب یہ لفظ میرے پلے نہ پڑا۔

"کیا ہیں جی؟......"

"پائلٹ نہیں ہوتا جو جہاز چلاتا ہے"

"یعنی آپ پائلٹ ہیں...... یعنی کمال ہے" میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں! کمال ہے" وہ بھی مسکرایا۔

"کہاں پر ہیں آپ یہ...... پیٹ؟"

"نیویارک میں......" اس نے اطمینان سے جواب دیا اور میرا منہ کھل گیا کہ یہ نوجوان جو باقاعدہ بھاگا ہے اور...... یعنی کمال ہے۔

"خواتین و حضرات!" ایک مرتبہ پھر پیٹ میرا مطلب ہے پائلٹ کی آواز آئی "ہم سطح مرتفع پوٹھوہار سے گزر کر دریائے جہلم پر سے گزر رہے ہیں۔ اس کے بعد دریائے چناب پر سے گزریں گے جو دکھائی دے رہا ہے اور باہر درجہ حرارت...... اندر درجہ حرارت...... بلندی......" وہ بولتا چلا گیا تب معلوم ہوا کہ یہ "باتونی پائلٹ" ہے۔ لاہور اور اسلام آباد کے درمیان ہوائی سفر کے دوران میں مختلف جہازوں اور جہاز اڑانے والوں کی خصلت سے خاصا واقف ہو چکا تھا انہیں میں باتونی پائلٹ صاحب تھے جو جہاز کے فضا میں بلند ہوتے ہی آپ کو ہر قسم کی زمینی، آسمانی معلومات فراہم کرتے جاتے تھے اور جب تک جہاز لاہور ائیر پورٹ پر لینڈ نہیں کر جاتا تھا موصوف جاری رہتے تھے ایک لحاظ سے یہ بہت مناسب اور خوشگوار طریقہ تھا کہ طیارے میں سفر کرنے والے غیر ملکی پاکستان کو اور اس کے دریاؤں کو جان لیتے تھے۔"

"یہ چپ نہیں کر سکتا۔" میرے برابر کے پیلٹ صاحب نے کہا۔

"وہ جہاز کا کپتان ہے جناب جو چاہے کرے ہم اسے کیسے منع کر سکتے ہیں۔ ویسے بھی وہ غریب آپ کو اتنے تر و تازہ معلومات بہم پہنچا رہا ہے آپ کو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔"

اس دوران جہاز کو دو چار جھٹکے لگے۔

"خطرناک ہو رہا ہے۔"

میں نے اسے بتایا کہ معاملہ تو پچھلے ہفتے خطرناک ہوا تھا۔ میں لاہور سے اسلام آباد جا رہا تھا اور اس بار جہاز ائیر بس ٹائپ کا تھا۔ یہ جہاز مجھے بڑی الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ اس میں بیٹھے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ کسی بارات کے ساتھ آئے ہوئے ہیں اور گاؤں کے کسی دالان میں بیٹھے ہوئے ہیں یہ اتنا بڑا ہے کہ پہلے تو یقین ہی نہیں آتا کہ یہ پوری عمارت فضا میں بلند ہو سکتی ہے کہ

نہیں...... یہی خیال رہتا ہے کہ رن وے پر بھاگتے ہوئے یہ پرواز تو کیا کرے گا بلکہ بائی روڈ ہی اسلام آباد چلا جائے گا۔ بہرحال یہ ائیر بس فضا میں بلند ہوئی اور اسی لمحے ایک تاریک طوفانی بادل کی لپیٹ میں آ گئی۔ پہلے کچھ ہلکے پھلکے جھٹکے جنہیں مسافروں نے انجوائے کیا پھر ذرا زوردار جھٹکے اور پھر ایک ایسا زلزلہ نما جھٹکا جس کی شدت سے سامان کے دراز کھل گئے اور سامان مسافروں کے سروں پر آ گرا اور چیخیں...... میرے سامنے حفاظتی پیٹی میں جکڑی ائیر ہوسٹس ڈر کے مارے آنکھیں نہیں کھول رہی تھی اور ہر جھٹکے پر وہ اتنا برا سا منہ بناتی تھی جیسے بس آخری سانس ہو...... اسی دوران ائیر بس فضا میں جیسے رکی اور پھر ایک عمارت کی طرح گرتی چلی گئی...... میں یہاں ہرگز یہ نہیں کہوں گا کہ میں بڑی لاپرواہی اور بے فکری سے بیٹھا رہا بلکہ میں یہ کہوں گا کہ میری روح فنا ہو رہی تھی بلکہ شاید ہو چکی تھی...... پتہ نہیں یہ ائیر بس کتنے سو فٹ نیچے آئی لیکن لگتا یہ تھا کہ ماؤنٹ ایورسٹ سے نیچے گر رہی ہے اور اب رکے گی نہیں...... لیکن یہ رک گئی (اسی لئے تو کالم لکھ رہا ہوں)...... یہ کوئی ایئر پاکٹ تھی اسلام آباد تک سرخ روشنی جلتی بجھتی رہی اور ہم حفاظتی پیٹیوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہے۔ صورتحال ذرا بہتر ہوئی تو مجھ سے اگلی نشست پر براجمان ایک صاحب جو پرواز کے آغاز میں سیاست اور فلسفے کے بارے میں بڑے سنجیدہ ہو رہے تھے کہنے لگے "کوئی مروانے لگے تھے کیپٹن صاحب...... دیکھو جی کتنی زیادتی ہے۔ اب مجھے اور آپ کو تو علم ہے کہ زیادہ خطرہ نہیں ہے لیکن باقی مسافروں کو کیا پتہ کہ کب کیا ہونے والا ہے۔ پائلٹ کو چاہیے تھا کہ ساتھ ساتھ بتاتا جاتا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں...... انہوں نے اپنی پیشانی سے چلو بھر پسینہ پونچھتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا اور اسی لمحے پھر ایک جھٹکا لگا تو بولے: "اوئے بریک لا۔"

تو معاملہ تب خطرناک تھا اب تو ذرا ہلکے پھلکے جھونکے جھلائے جا رہے تھے...... "تو آپ پیٹ ہیں!" میں نے اپنے ہم سفر سے پوچھا۔

"آہو" اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا کیونکہ جھٹکے ابھی تک لگ رہے تھے۔

"آپ خود پیٹ ہیں تو پھر آپ کو تو نہیں ڈرنا چاہیے۔"

"میرے ہاتھ میں کنٹرول ہوتا تو میں نہ ڈرتا۔ کنٹرول تو اس نامانیم کے ہاتھ میں ہے۔"
یہ پیلٹ صاحب بڑی دلچسپ چیز تھے قدرے ناخواندہ لگتے تھے اور موچی دروازہ سے سیدھے نیویارک پہنچ کر اپنی ہمت اور کوشش سے مقامی فلائنگ کلب میں سبق لے کر باقاعدہ پیلٹ بن گئے تھے ان دنوں پاکستان آئے ہوئے تھے اور کسی رشتے کے سلسلے میں اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔

.....دریائے راوی کو عبور کر کے جہاز کوٹ لکھپت اور ٹاؤن شپ سے پرواز کرتا نیچے ایئرپورٹ پر اترنے لگا۔ جب جہاز کے پہیے زمین کے ساتھ لگے تو ایک زوردار جھٹکا لگا جو خاصا شدید تھا۔

"اوئے نامرنیم....." پیلٹ کہنے لگے "مرنگ پر کنٹرول نہیں اس کا..... اسی لئے جھٹکا لگا ہے۔ جہاز کو مارا تھا اس نے۔"

ایئرپورٹ پر خدا حافظ کہتے ہوئے میں نے ان سے پوچھا "یہ لینڈنگ کے وقت اتنا شدید جھٹکا کیوں لگا تھا؟"

"جذباتی پیلٹ ہے" وہ کہنے لگے "ای لیے باتیں زیادہ کرتا تھا۔ اور اسی لئے لینڈنگ ٹھیک نہیں کی..... جہاز چلانے والے کو جذباتی نہیں ہونا چاہیے۔" مجھے اس موچی دروازے کے حال مقیم نیویارک پیلٹ کی یہ بات اچھی لگی..... جہاز چلانے والے کو جذباتی نہیں ہونا چاہیے۔

"تلاشِ گمشدہ کُتّا جات اور بِلّی جات اور نیولا جات"

طوطے کپسر کی طوطا کہانی والے کالم کی وجہ سے مجھے تلاش گمشدہ کتا جات اور بلی جات اور نیولا جات اور پرندہ جات کے بارے میں اتنے ڈھیر سارے خطوط موصول ہوئے ہیں کہ یقین جانیے میرے ہاتھوں کے طوطے بھی اڑ گئے ہیں اور یہ والے طوطے واپس نہیں آئیں گے۔ ان خطوط میں ایسے ایسے اشک آور اور آہ و فغاں سے بھرپور خط ہیں کہ میں انہیں پڑھ کر خاصی دیر تک ایک کونے میں کسی اداس کوّے کی طرح بیٹھا رہا..... میرا خیال تھا کہ یورپ اور انگلستان میں ہی جانوروں سے محبت کرنے والے پائے جاتے ہیں۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ سوات گوجرانوالہ اور بدین میں بھی جانوروں سے عشق کرنے والوں کی کمی نہیں..... تو ملاحظہ فرمائیں سوات کی ایک خاتون کا خط جو اپنی بلی کے غم میں اتنی نڈھال ہیں کہ انہیں بلڈ پریشر ہو گیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔ "تارڑ بھائی جان خدا آپ کا بھلا کرے کہ آپ نے آخر کار کوئی اچھا کالم لکھا ہے۔ پورے ملک میں اس قسم کا کوئی انتظام نہیں کہ اگر کسی شخص کا کوئی جانور گم ہو جائے تو اس کو تلاش کرنے کا شعبہ ہو۔ دیکھئے ناں یہ جو جنگلی جانوروں کے تحفظ والا محکمہ ہے تو یہ بلیوں اور کتوں کا تحفظ کیوں نہیں کرتا۔ جو جانور جنگل میں ہیں ان کے بارے میں یہ بہت فکرمند ہیں اور جو جانور ہمارے پاس رہتے ہیں اور ہماری خدمت کرتے ہیں ان کی انہیں کوئی پرواہ نہیں۔ میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ جو میری بلی گم ہو گئی ہے اور آج گم ہوئے چھ ماہ ہو گئے ہیں۔ اور میں نے بہت کوشش کی کہ مل جائے۔ بھائی جان وہ کہنے کو تو بلی تھی لیکن کسی سہیلی سے کم نہ تھی۔ میں اپنی راز کی باتیں اس کے ساتھ کرتی تھی..... کیا اسے تلاش کرنے میں آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟ اگر آپ میری بلی کو تلاش کر دیں تو آپ کا نام تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا۔"

ان خاتون نے خط کے آخر میں بلی کا حلیہ بیان کیا ہے اور وہ ایسا ہے کہ کسی بھی بلی کا ہو سکتا ہے۔

بلکہ کسی کتے کا بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً جانی جان اس کی دم بہت موٹی ہے اور گچھے دار ہے اور دانت نوکیلے
منہ بڑا خوب صورت ہے...... وغیرہ وغیرہ۔ گوجرانوالہ کے ایک ریٹائرڈ ٹیچر نے لکھا ہے کہ چند سال پہلے ان
کا پسندیدہ نیولا گم ہو گیا ہے۔ یہ نیولا بہت صحت مند تھا اور ان کے صحن میں رہتا تھا۔ جب وہ بازار جاتے
تو ان کے ساتھ چلتا ہوا آتا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ نیولا ان کے محلے کے لڑکوں نے چرایا ہے اور یہ کہ ان کا
انہیں واپس دلایا جائے۔ ان ریٹائرڈ ٹیچر نے بھی آخر میں اپنے نیولا جی کا حلیہ بیان کیا ہے۔ اس سے
پتہ چل جاتا ہے کہ نیولا کیا ہوتا ہے۔ ان صاحب سے بھی میں یہی گزارش کروں گا کہ چند ناگزیر وجوہات کی
بنا پر میں ان کے نیولے کی بازیابی میں معاون ثابت نہیں ہو سکتا۔ پشاور کے دو بچوں نے اپنے لو برڈز کے بارے
میں لکھا ہے کہ وہ اڑ گئے ہیں اور کیا پیارے انکل ان کو تلاش کر سکتے ہیں۔

برادر جاوید اقبال آفرین ہے تم پر کہ تم نے اپنی ایک کتیا کی خاطر اعلیٰ ترین حکام کے دروازے
دستک دے دے کر فیصلے کر دیے۔ اگرچہ پولیس اور عوام نے آپ کا مذاق اڑایا، لیکن آپ اپنے موقف پر
ڈٹے رہے اور انصاف حاصل کرنے کے لیے بلکہ اپنی کتیا حاصل کرنے کے لیے دن رات ایک کر دیا۔
دراصل عوام الناس ایک کتے کو صرف ایک کتا سمجھتے ہیں۔ اس کی قدر تو اس کے مالک سے پوچھیے...... عام لوگ
تو یہی کہتے ہیں کہ جی کیا ہوا اگر کتیا چوری ہو گئی لیکن انہیں کیا پتہ کہ اس لیڈی میں کیا کیا خصوصیات تھیں...... اس
کی دم کتنی شاندار تھی اور گھر آنے پر وہ کیسے پیارے "بف بف" کر کے بھونکتی تھی اور قدموں میں لوٹتی تھی۔
پیارے بچو تمہارے پیارے انکل اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے...... وہ لاکھوں پرندوں میں سے
تمہارے دو لو برڈز تلاش کرنے سے قاصر ہیں۔ کچھ غیر سنجیدہ قسم کے خط بھی ہیں، ان سے چند اقتباس
ملاحظہ کیجیے......

"تھانیدار صاحب آپ یہ فرمائیں اگر آپ گمشدہ چیزیں تلاش کرنے کے ماہر ہیں تو ایک تو قومی تشخص
تلاش کر دیجیے۔ اور اس کے علاوہ پوری قوم کے گمشدہ حواس تلاش کر دیجیے۔"

"جناب گزارش یہ ہے کہ میرا گھر مجھ سے ناراض ہو کر کہیں چلا گیا ہے آپ اسے کہیں کہ واپس
آجائے۔ اسے کچھ نہیں کہا جائے گا......"

ان تمام خطوں میں سے ایک خط انتہائی سنجیدہ اور تفصیلی ہے اور حافظ آباد کے جاوید اقبال صاحب
کا لکھا ہوا ہے اور خط کے ہمراہ شناختی کارڈ کی کاپی اور ایک عدد ایف آئی آر کی نقل بھی ارسال کی گئی ہے۔
جاوید اقبال صاحب کے خط کے چیدہ چیدہ حصے ملاحظہ کیجیے۔

"پولیس کا فرض ہے مدد آپ کی۔"

"سستا اور سہل انصاف؟؟"

جوئے شیر لانا سہل مگر پولیس سے چوری کی ایف آئی آر درج کرانا مشکل۔

کئی سال تک ایف آئی آر کے اندراج کی تھکا دینے والی تگ و دو کے بعد پولیس حکام تھانہ
(ضلع گجرات) نے ملزمان کے ساتھ ملی بھگت اور ساز باز کر کے ملزمان کو ناجائز تحفظ فراہم کرنے کے لیے
چوری شدہ کتیا کا ناجائز طور پر ایک دعویدار بھی کھڑا کر دیا۔

پولیس کا فرض سرگرمی اور جرائم کی پرورش کرنا ہے یا کہ ان کا قلع قمع کرنا۔

قابل احترام جناب مصباح الدین جامی صاحب آئی جی پنجاب سے چوری شدہ کتیا کی بازیابی کی اپیل
میں ایک ذمہ دار بینک آفیسر ہوں اور اس کے علاوہ گورنمنٹ ملازم ہونے کے ناطے سے بھی غلط بیانی
اور کذب و افترا کے نتائج و عواقب سے پوری طرح آگاہ ہوں۔ مورخہ ۱۹-۱۰-۸۵ کو جب کہ میں اپنی
ملازمت کے سلسلے میں چالیہ میں مقیم تھا، میری اعلیٰ اور قیمتی نسل کی "جرمن شیپرڈ لونگ کوٹڈ بریڈ" کتیا میری
رہائش واقع ستارہ راج چالیہ سے چالیہ کے ایک نواحی گاؤں کے چیئرمین اجس کے ہمشیرہ ہی سے تھانہ
کے ہر ایک تبدیل ہو کر آنے جانے والے پولیس حکام سے نہایت ہی گہرے اور خصوصی مراسم رہے ہیں،
نے چوری کروالی تھی۔ مسمی کلاں ماضی بعید میں میری کتیا کی دیکھ بھال پر مامور تھا۔ اس لیے کتیا اس سے
نہایت ہی زیادہ مانوس تھی۔ مگر چوری کے وقوعہ سے تقریباً مہینہ بھر قبل اسے کتیا سے علیحدہ کر دیا گیا
تھا۔ میں اعلیٰ پولیس حکام خصوصاً قابل احترام جناب آئی جی پنجاب سے اپیل کرتا ہوں کہ میری تفتیش تھانہ
پولیس حکام کی بجائے کسی انتہائی غیر جانبدار اور ایماندار پولیس افسر سے کروا کر میری چوری شدہ کتیا ملزمان
سے برآمد کروائی جائے اور تھانہ پولیس حکام کو بے جا طور پر ملزمین کی جرم پوشی سے باز رہنے کی سختی سے

اور فیصلہ کن ہدایات جاری فرمائی جاویں تاکہ قانون کی عملداری کا احساس اجاگر ہو اور میری دلجوئی ہو اور کم از کم اعلیٰ پولیس حکام کی فرض شناسی غیر جانبداری اور غیر لچکدار ایمانداری پر عوام الناس کا یقین پختہ ہو۔ اس انتہائی طویل اور تفصیلات سے بھرپور خط کے ساتھ اس ایف آئی آر کی ایک نقل بھی ہے جو کتیا کی گمشدگی کے بعد بعد کوشش درج کروائی گئی۔

بھائی جاوید اقبال میں تمہارے ساتھ ہوں۔ دراصل ہم دونوں کا غم مشترک ہے۔ میں اس سے پیشتر اپنے غم کا اظہار اس لیے نہیں کرتا تھا کہ کہیں لوگ میرا مذاق نہ اڑائیں۔ لیکن آپ تو میرے لیے بھی مشعل راہ ثابت ہوئے اور تاریخ میں میرا نہیں آپ کا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ یعنی ایک ایسا شخص جس نے اپنی کتیا کے لیے زندگی وقف کر دی۔ اب میری داستان الم بھی سنیئے..... میرا ایک کتا ہوا کرتا تھا۔ سیاہ رنگ اور السیشن نسل کا یعنی تقریباً آپ کی کتیا کا بھائی..... کیونکہ لیڈی جرمن شیپرڈ تھی تو یہ کتا جس کا نام شیری تھا پورے ساڑھے چار برس بعد چوری ہو گیا..... پتہ نہیں کون لے گیا..... گھر سے باہر نکلا اور کسی سنگدل نے اغوا کر لیا اور شاید فروخت کر دیا۔ بچے اسے یاد کرتے ہیں۔ ہم اسے یاد کرتے ہیں..... کسی کو اپنا غم بتاتے نہیں تھے لیکن اب بھائی جاوید اقبال کی داستان سن کر حوصلہ ہوا ہے کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں......

ایک روز کسی عزیز نے اطلاع دی کہ فلاں کوٹھی کے اندر ہے اور میں نے خود دیکھا ہے۔ بے حد اداس تھا۔ چنانچہ میں شام کے وقت اس کوٹھی کے قریب گیا۔ دیوار کے قریب کھڑا ہو کر چپکے چپکے "شیری شیری" پکارنے لگا..... میں بے حد آہستہ سے اور سرگوشی کے انداز میں پکارتا تھا تاکہ صرف شیری سن سکے۔ یکدم ایک مونچھوں والے صاحب باہر آ گئے اور مجھے تقریباً گردن سے پکڑ کر بولے۔ "اوئے کس کو بلاتا ہے؟"

میں نے عرض کیا شیری کو۔

کہنے لگے کیوں..... آئندہ بلایا تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ غضب خدا کا دن رات شیری شیری ہوتی رہتی ہے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ شیری ان کی دختر نیک اختر کا نام ہے تو بھائی جاوید ہمارے ساتھ تو یہ ہوا۔ اب گھر سونا سونا ہے..... اخباروں میں اشتہار دیکھ کر ایسے لوگوں کے پاس گئے جن کے پاس کتورے برائے فروخت تھے۔ چونکہ مجھے بھی آپ کی طرح السیشن ہی پسند ہیں اس لیے السیشن کتورے حاصل کرنے کے لیے دن رات ایک کر دیا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اگر نسل اچھی ہو تو کتے کا بھی بھاؤ تیز ہوتا ہے۔ یعنی ایک صاحب نے صرف چار ہزار روپے قیمت بتائی ایک اور صاحب کہنے لگے کہ آپ دو ہزار دے دیجئے گا۔ ڈرامے لکھنے اور اداکاری کرنے سے تو بہتر ہے کہ انسان کتورا فروشی شروع کر دے۔ کیونکہ ٹیلی ویژن سے جو چیک ملتا ہے اس کے ساتھ تو ایک کتورا بھی نہیں خریدا جا سکتا۔ چنانچہ اب ہم کتے کے بغیر ہیں اور اپنے شیری کا انتظار کرتے ہیں۔ کیونکہ نیا کتا خریدنا ہمارے بس کی بات نہیں..... کسی روز بازار سے کوئی ڈوگ کتورا لے آئیں گے اور اس کی تربیت کریں گے۔

بھائی جاوید اقبال میری ساری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب آپ کی کتیا آپ کے پاس ہو گی۔ اور آپ بھی دعا کیجئے کہ میرا شیری بھی واپس آ جائے..... اور اس موقع پہ ایک شعر یاد آ گیا اور پتہ نہیں کیوں یاد آ گیا۔ آپ بھی سن لیجئے۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

"گڈ مارننگ سر عید مبارک"

ہم عید گاہ کے راستے پر چل رہے تھے اور ہمارے دونوں جانب انواع و اقسام کے گداگر گڈ ڈی آفر پیش کر رہے تھے۔ اپنے مڑے تڑے بازوؤں کے ساتھ لبے نور آنکھوں سے اور "جلا ہو بابو جی عید مبارخ" ..... سخیا تیقوں لکھ لکھ مبارخاں" ..... دے جا ..... دے جا" لیکن قابل رحم میرا مطلب ہے قابل فہم طور پر ابھی ان کی یلغار میں وہ گرمی پیدا نہیں ہوئی تھی جس کے لیے انہوں نے پورا سال تیاری کی تھی۔ یہ گرمی تو گداگری نماز عید کے بعد دیکھنے میں آتی تھی۔ عید کی نماز کا اصل لطف تبھی آتا ہے اگر انسان سلیپر گھسیٹتا، ازار بند اڑستا، ٹوپی تلاش کرتا اور بغل میں کھیس یا چادر وغیرہ دابے جا گم جاگ عید گاہ میں پہنچے، اور لوگ صفیں سیدھی کر رہے ہوں اور وہ بمشکل جگہ پیدا کر کے پہلی تکبیر پر ہاتھ اٹھائے۔ چنانچہ میں اپنے بال بچوں کے ہمراہ اسی طرح عید کی نماز سے لطف اندوز ہوا۔

ہر سال کی طرح اس برس بھی ہمارے بوڑھے اور ضعیف امام مسجد نے نماز عید کی امامت کروائی۔ لیکن اس مرتبہ وہ دھاڑیں مار مار کر روتے نہیں بلکہ صرف قدرے گلوگیر ہوئے۔ ان کے رونے کا قصہ کچھ یوں ہے کہ ہر برس عیدین کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے وہ یکدم خاموش ہو جاتے اس پر تمام نمازی حضرات جان جاتے کہ وقت آگیا ہے بلکہ کھسر پھسر بھی ہوتی کہ اب یہ روئیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا۔ وہ یکدم دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے اور حاضرین سے درخواست بھی کرتے جاتے کہ اے مسلمان جائیو! کہ میں اب اتنا ضعیف اور بوڑھا ہو چکا ہوں کہ اگلی عید پر ملاقات نہیں ہو سکتی ..... بالکل نہیں ہو سکتی ہائے واسطے اب آپ سے ملاقات نہیں ہو گی۔

اس پر حاضرین میں سے چند ایک بہ آواز بلند کہتے کہ مولانا! آپ اس طرح ناامید نہ ہوں انشاء اللہ

اگلی عید پر آپ زندہ ہوں گے اور ہمیشہ کی طرح امامت کرائیں گے۔ لیکن مولانا اس پر مزید گلوگیر ہو جاتے اور کہتے نہیں نہیں۔ برادران اسلام! اب میری قسمت کہاں کہ اگلے برس تک زندہ رہوں۔ آپ مجھ گنہگار کے لیے دعا کیجیے گا۔ کچھ نمازی آبدیدہ ہو جاتے کیونکہ سب لوگ ان کے خلوص اور نیک نیتی کے مداح ہیں۔ کوئی شخص کھڑا ہو کر کہتا کہ مولانا آپ فکر نہ کریں۔ آپ انشاء اللہ ..... اس پر مولانا چپ ہو جاتے مگر آہستہ آہستہ اپنے آنسو پونچھتے جاتے اور بالکل آخر میں وہ یکدم سر ہلا کر کہتے "نہیں برادران اگلی عید پر آپ سے ملاقات نہیں ہو گی۔ میں آپ سب کو خدا حافظ کہتا ہوں۔" اور خدا کا کرنا کیا ہوتا کہ مولوی صاحب اپنی تمام تر ضعیفی، نقاہت اور عمر رسیدگی کے باوجود اگلی عید پر ہم سے ملاقات کرنے کے لیے موجود ہوتے اور ایک مرتبہ پھر روتے ہوئے ہم سے درخواست کرتے کہ اے مسلمان جائیو! لیکن اس مرتبہ شاید وہ کچھ کچھ شرمندہ تھے کہ ہر مرتبہ رو دھو کر کہتا ہوں کچھ ہوں "وہ کچھ ہوتا نہیں، اور خواہ مخواہ لوگوں کو آبدیدہ کرتا ہوں۔ اس لیے انہوں نے اپنی خرابی صحت اور فوتیدگی وغیرہ کا بالکل ذکر نہیں کیا۔ لوگ انتظار کرتے رہے۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا ..... اللہ انہیں صحت دے اور ہمت دے کہ وہ آئندہ عید کو بھی ہمارے درمیان موجود ہوں، اور ہمیں نماز پڑھائیں، اور آئندہ عید کون سی دور ہے۔

خطبے کے اختتام پر میں سرسری اور ناگزیر قسم کی عید مبارکیں وصول کر کے اپنی دری سمیت جلدی سے باہر کی طرف جاتا کیونکہ پبلک اگر پہچان لے تو عید مل مل کر پسلیاں توڑ دیتی ہے۔ اور باہر گداگر تھے اور پورے جوبن پر تھے۔

ایک برقع پوش عورت بار بار اپنے بچوں کے ہاتھ کو اوپر کر کے ٹیڑھا کرنے کی کوشش کر رہی تھی تاکہ یوں لگے جیسے بچہ اپاہج ہے اور بچہ بھی جس کی نظر غباروں پر تھی بھول جاتا اور ہاتھ سیدھا کر دیتا اور مسلسل مار کھاتا چلا جاتا۔

ایک گداگر کو دیکھا کہ اس نے چادر پھیلائی۔ پھر جیب سے پانچ پانچ کے درجنوں کڑکتے نوٹ نکال کر اس پر پھیلا دیے۔ اور پھر "ہے بابا ہے بابا۔"

کچھ حضرات نوٹوں کی گڈیاں لے کر کھڑے تھے اور گداگروں کے غول ان کا محاصرہ کیے ہوتے تھے

صاحب نوٹ ہوا میں اچھال رہے تھے اور گداگر بچے انہیں لوٹ رہے تھے۔

ٹوٹے ہوئے یا توڑے ہوئے اعضاء کی نمائش ہو رہی تھی اور رحمدل حضرات ان پر نوٹوں کی بارش کر رہے تھے۔ عید کی نماز پڑھنا اور خطبہ سننا یا گداگروں کے ہجوم میں سے گزرنا کوئی نئی بات نہیں لیکن ایک نئی بات ہوئی جس کی وجہ سے میں یہ کالم لکھنے پر مجبور ہوا۔ گداگر دونوں ہاتھوں سے نوٹ سمیٹ رہے تھے اور خدا جھوٹ نہ بلوائے ہر ایک کے سامنے جو نوٹ تھے وہ ہمارے پارک میں شفقت کرنے والے بوڑھے مالی کی کئی تنخواہوں کے برابر تھے۔ اور نوٹ سمیٹنے کے ساتھ ساتھ وہ جھوم جھوم کر نعرے بھی لگا رہے تھے۔ "او دے دیتا جا سخیا..... عید مبارخ..... باؤ جی باؤ جی..... صاحب جی، حاجی صاحب..... تیرے بچے جیئیں..... دے جا نبی کا صدقہ..... گڈ مارننگ سر عید مبارک۔"

چند قدم آگے جا کر مجھے احساس ہوا کہ میں نے کیا سُنا تھا..... "گڈ مارننگ سر عید مبارک" میں نے پلٹ کر دیکھا، جہاں گداگر عورتوں، مردوں اور بچوں کے چہرے تھے اور وہ شور مچا رہے تھے۔ ان میں سے کس نے نہایت نفیس لہجے میں "گڈ مارننگ سر عید مبارک" کہا تھا۔ اتنے میں قریشی صاحب آ گئے۔

"واہ واہ تارڑ صاحب..... عید مبارک"؟ وہ الگ ہوئے تو خان صاحب..... پھر میر صاحب..... اور یوں سب سے عید ملتا گھر واپس پہنچ گیا۔

ان میں وہ کون سا گداگر تھا جس نے "گڈ مارننگ سر عید مبارک" کہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ گداگروں کے سامنے پڑے نوٹوں کے ڈھیر دیکھ کر مجھے ان پر رشک آیا تھا۔ اور یہ میں خود ہی تھا جس نے اپنے آپ کو "گڈ مارننگ عید مبارک" کہا تھا..... میں خود ہی گداگر تھا۔ یا میری خواہش تھی کہ کاش میں بھی گداگر ہوتا..... آپ ہی بتائیے کیا آپ نے عید کی صبح کو یہ آواز سنی تھی کہ..... گڈ مارننگ سر عید مبارک۔

"میں نے سگریٹ چھوڑ رکھے ہیں"

آج..... اس وقت مجھے سگریٹ چھوڑے ہوئے پورے چار دن گیارہ گھنٹے بیس منٹ اور کچھ سیکنڈ ہو گئے ہیں۔

مجھے بار بار یہ مشورہ دیا جا رہا ہے کہ سگریٹ کے بارے میں مت سوچو۔ اس کے بارے میں مت لکھو ورنہ یہ پھر سے تم پر حملہ آور ہو جائے گا۔ تمہیں اس کا خیال آئے گا۔ اس کی خوشبو زبان تلے چھو جائے گی۔ تھوک میں آ جائے گی اور تم سگریٹ کے اس پیکٹ کو نکال لاؤ گے جس میں ابھی پانچ چھ سگریٹ باقی ہیں۔ یہ سگریٹ پورے چار دن گیارہ گھنٹے بیس منٹ اور..... نہیں اکیس منٹ پرانے ہیں اور ماضی میں کبھی ایسا نہیں ہوا پچھلے پچیس برس میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے سگریٹ خریدے ہوں، پیکٹ کھولا اور..... اور اس میں سے چند سگریٹ پی کر بقیہ چار دن گیارہ گھنٹے اور بائیس منٹ تک یونہی پڑے رہیں..... اور پرانے ہوتے رہیں۔ نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا..... لیکن اس مرتبہ ہوا ہے اور میں آپ سب کو اس کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں..... نہیں نہیں کوئی لیکچر نہیں۔ اس کے نقصانات کی تفصیل نہیں..... صرف پچھلے چار روز کے محسوسات آپ کے سامنے بیان کروں گا تاکہ آپ کو بھی معلوم ہو کہ سگریٹ آسانی سے نہیں چھوڑے جا سکتے۔ وہ لوگ جو بڑے فخر سے یہ کہتے ہیں کہ جناب سگریٹ کا کیا ہے جب چاہا چھوڑ دیا..... وہ لوگ درست کہتے ہیں کیونکہ وہ سگریٹ کو بیس پچیس منٹ تک واقعی چھوڑ دیتے ہیں۔ اور میری طرح کے کئی حضرات جو اس خیال سے اپنے آپ کو خوش رکھتے ہیں کہ دس بارہ سگریٹ روزانہ تو بہت کم ہیں۔ جب چاہیں گے چھوڑ دیں گے..... جی نہیں آپ سگریٹ نہیں چھوڑ سکتے یہ ایک ہزار پایہ ہے جو آپ کو چمٹا ہوا ہے اور یہ آپ کے بدن کو آسانی سے نہیں چھوڑتا۔ دراصل جب آپ سگریٹ چھوڑنا چاہتے ہیں۔

صرف اس لمحے، زندگی میں پہلی مرتبہ آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ آپ تو نکوٹین کی غلامی میں ہیں، آپ کا بدن اور آپ کا ذہن نکوٹین کا بدن ہے نکوٹین کا ذہن ہے...... آپ کا کچھ نہیں، آپ صرف غلامی میں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ سگریٹ کیوں چھوڑے جائیں۔ یہ آپ کی زندگی کا حصہ ہیں۔ چائے، پانی، سگریٹ۔ آپ ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ سگریٹ کے بغیر مزہ نہیں آتا...... اور بھی لوگ پیتے ہیں۔ ابھی تک یہ طے نہیں ہوا کہ کیا واقعی کینسر سگریٹ نوشی کی وجہ سے جسم میں پھیلتا ہے اور ہم نے بے شمار ایسے کیس بھی دیکھے ہیں جنہوں نے ساری عمر سگریٹ کا ایک کش بھی نہیں لگایا اور کینسر کی وجہ سے پھڑک گئے۔ ونسٹن چرچل نے جب فیلڈ مارشل منٹگمری کی جانب سگریٹ کا پیکٹ بڑھایا تو منٹگمری نے بڑے فخریہ بلکہ تکبر سے کہا تھا کہ نہ میں شراب پیتا ہوں اور نہ میں سگریٹ پیتا ہوں اور میں...... سو فیصد فٹ ہوں...... اس پر چرچل نے اپنی موٹی ناک چڑھا کر کہا تھا، میں شراب پیتا ہوں اور سگریٹ نوشی بھی جی بھر کے کرتا ہوں اور میں دو سو فیصد فٹ ہوں! اب پتہ نہیں چرچل کے اس بیان میں کتنے فیصد سچائی ہے۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ اس میں قسمت اور فطرت کا عمل دخل بہت ہوتا ہے...... تو سگریٹ کیوں چھوڑے جائیں؟"

میں آپ کو اپنی وجوہات بتاتا ہوں۔

سب سے اہم مسئلہ اقتصادی ہے ایک اچھے برانڈ کی ڈبیا تیرہ روپے میں ملتی ہے روزانہ تیرہ روپے کے حساب سے تقریباً چار سو روپے ماہانہ آپ کا دھوئیں کا خرچہ ہے...... دھوئیں کے اس خرچ کو چلانے کے لیے آپ ادھر اُدھر سے چھوٹی چھوٹی بچتیں کرتے رہتے ہیں۔ ہر وقت آپ کے ذہن میں اگلے پیکٹ کی دستیابی کا مسئلہ سر اٹھاتا رہتا ہے۔ پہلے تو رقم کا بندوبست اس کے بعد اپنے پروگرام میں اتنا وقت بچا رکھنا کہ جس میں آپ کسی مخصوص دکان میں جاکر سگریٹ خریدیں گے۔ یہ سگریٹ آپ یوں تو کہیں سے بھی خرید سکتے ہیں لیکن ہر سگریٹ پینے والے کا ایک خاص اڈہ ہوتا ہے اور اسے وہیں سے سگریٹ خریدنے میں لطف آتا ہے۔ سگریٹ نوشی کا دوسرا مسئلہ ہے اس کی مکمل غلامی۔ آپ بے شک اس حقیقت سے منہ موڑ لیں۔ سگریٹ آپ کا آقا بن جاتا ہے۔ آپ کی پوری زندگی کی منصوبہ بندی سگریٹ کے حوالے سے ہوتی ہے۔ مثلاً آپ ہر وقت اپنے سگریٹوں کو گنتے رہتے ہیں۔ گھر میں شام

گزارنے کے لیے پانچ کافی ہوں گے۔ صبح کے لیے تین درکار ہیں...... چنانچہ گھر میں قدم رکھنے تک آپ ان کو گنتے رہتے ہیں اگر وہ آٹھ کی بجائے سات رہ گئے ہیں تو آپ کی جان پر بن گئی کہ اب کیا ہو؟ آپ کے ذہن کا ایک حصہ صرف سگریٹوں کا حساب کتاب کرتا رہتا ہے۔

آپ گھر سے نکلتے ہیں تو مختلف کام سگریٹوں کے پیمانے سے ناپے جاتے ہیں۔ فلاں دفتر میں جاؤں گا تو وہاں زیادہ سے زیادہ دو سگریٹ پیوں گا تو کام ہو جائے گا۔ فلاں جگہ ایک سگریٹ پینے کے بعد اٹھ کھڑا ہوں گا...... فلاں دوست کو ملنے جا رہا ہوں تو زیادہ سے زیادہ تین سگریٹ...... اس طرح آپ اگر کوئی بوتل پیتے ہیں، چائے نوش کرتے ہیں یا کھانا کھاتے ہیں تو آپ اس کے ذائقے سے لطف اندوز نہیں ہو رہے ہوتے بلکہ اس بات پر خوش ہو رہے ہوتے ہیں کہ یہ کھانے یا پینے کے بعد میں سگریٹ پیوں گا، چنانچہ یہاں بھی آپ سگریٹ کی غلامی میں ہیں۔

سگریٹ کے ساتھ تھوڑی سی شرمندگی بھی ہوتی ہے۔ آپ کسی کے ہاں مہمان ہیں اور صبح سویرے حسب عادت اپنے گلے میں جمع مادے نکالنا چاہتے ہیں...... یہ آپ کی مجبوری ہے۔ صبح سویرے "خوں خوں...... اہم اہم...... کھوں کھوں" کر کے اپنا گلا صاف کرنا اور کئی مرتبہ رات کو بہت دیر تک کھانسنا اپنے خاندان اور اپنے ہمسایوں کو تنگ کرنا۔

میرا خیال ہے کہ میں اتنے اچھے دلائل نہیں دے سکا اور یہ دلائل کسی کو سگریٹ سے دور لے جانے کے لیے زیادہ وزنی نہیں ہیں، دراصل میرے پاس کوئی خاص وجہ...... کوئی وزنی دلیل، کوئی اخلاقی جواز وغیرہ بالکل نہیں ہے۔ میں نے سگریٹ صرف اس لیے چھوڑے ہیں تاکہ دیکھا جائے کہ کیا سگریٹ چھوڑے جا سکتے ہیں اور اگر میں ان کو چھوڑ دوں تو میری زندگی میں کیا تبدیلی رونما ہوگی...... اب میں آپ کو مختصراً بتاتا ہوں کہ سگریٹ سے دور ہونے پر مجھ پر کیا گزری۔ پہلا دن سب سے خطرناک اور سب سے مشکل ہوتا ہے۔ پہلے تین گھنٹے تو آپ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہیں کچھ جذبۂ تفاخر ہوتا ہے کہ دیکھا میں نے سگریٹ چھوڑ دیئے ہیں اور کیا تیر مارا ہے یہ کچھ کچھ اس کیفیت کے قریب ہے جو سفر پہ روانگی کے اولین لمحات میں آپ پر اس وقت طاری ہوتی ہے۔ جب ریل گاڑی پلیٹ فارم چھوڑتی ہے اور آپ گردن

باہر نکال نکال کر دیکھنے لگتے ہیں۔ دوپہر کے وقت آپ کچھ کچھ بے چین ہونے لگتے ہیں۔ جیسے پچھلے پہر روزہ دار بے چین ہوتا ہے اور پھر شام تک آپ بُرے حالوں میں رہتے ہیں۔ آپ کا بدن ٹوٹ رہا ہوتا ہے۔ آپ انگلیاں چٹخاتے ہیں۔ دانت کچکچاتے ہیں۔ لمبے لمبے سانس لیتے ہیں اور آپ کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کب تک ہوتا رہے گا۔ اگر آپ باتھ روم میں سگریٹ کے ساتھ جاتے ہیں تو پھر آپ کا خدا ہی حافظ۔

سگریٹ کے بغیر باتھ روم میں جاتے یوں لگتا ہے جیسے آپ ہتھیار کے بغیر میدان جنگ میں اتر رہے ہیں..... دوسرا دن آپ کو پریشان کرتا ہے۔ کچھ کچھ ویران کرتا ہے کیونکہ آپ دنیا کی باقی آبادی سے الگ ہو چکے ہوتے ہیں۔ تیسرا دن کچھ ماؤف کیفیتوں کا دن ہوتا ہے۔ کچھ غیر جانبدار سا۔ یہاں نکوٹین پیچھے ہٹتی ہے اور اب آپ پر منحصر ہوتا ہے کہ آپ دل کڑا کر کے سگریٹ سے دور رہنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں یا لپک کر سگریٹ سلگا لیتے ہیں اور ہاں..... سگریٹ چھوڑنے کے بعد آپ کو بھوک لگتی ہے۔ گمشدہ ذائقے واپس آتے ہیں تو انسان زیادہ کھانے لگتا ہے۔ ہر وقت کھانے پینے کو جی چاہتا ہے..... چوتھے روز کبھی کبھار چند لمحے آتے ہیں جب آپ مکمل طور پر بھول جاتے ہیں کہ سگریٹ کا وجود ہے یا کبھی آپ سگریٹ پیا کرتے تھے۔ سگریٹ کی کشش بیچ بیچ میں سے غائب ہونے لگتی ہے۔ شنید ہے کہ چوتھا دن بھی بے حد خطرناک ہوتا ہے۔ انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ سگریٹ کی قید سے چھوٹ گیا۔ اس کی غلامی سے آزاد ہو گیا اور قدرے لاپرواہ ہو جاتا ہے اور کسی کمزور لمحے میں صرف ایک کش لگانے کے لیے اپنا سارا ریکارڈ خراب کر لیتا ہے۔

آج..... اس وقت مجھے سگریٹ چھوڑے ہوئے چار دن بارہ گھنٹے اور پانچ منٹ ہو چکے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں بالآخر کامیاب ہوں گا یا نکوٹین کا جادو مجھ پر غالب آ جائے گا۔ لیکن میں ایک عجیب و غریب تجربے میں سے گزر رہا ہوں۔ کیا سگریٹ چھوڑنے کے بعد میری زندگی پہلے سے بہتر ہو جائے گی؟ کیا میں ایک بہتر انسان بن جاؤں گا؟ کیا مسرت میرے قریب آ جائے گی..... کیا ہو جائے گا مجھے کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہو گا۔ لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ مجھے غلامی پسند نہیں۔ اب دیکھئے کہ میں کتنا

عرصہ آزاد رہتا ہوں..... اور کیا یہ آزادی مجھے راس بھی آتی ہے یا نہیں۔ فی الحال تو یہ ہے کہ میں پچھلے چار دن بارہ گھنٹے اور پچاس منٹ سے گھر میں بیٹھا ہوں اور کہیں باہر نہیں گیا۔ بچے میرے قریب سے گزرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ میں انہیں بلاتا ہوں تو وہ چونک جاتے ہیں۔

میرا کوئی فون آتا ہے تو سرگوشیوں میں بتایا جاتا ہے کہ دراصل انہوں نے سگریٹ چھوڑ رکھے ہیں۔ اس لیے احتیاط سے بات کیجئے گا۔

بجلی کا میٹر چیک کرنے والا آیا تو اسے کہہ دیا گیا کہ فی الحال آپ یہ کام نہ کریں۔ کیونکہ ابّو نے سگریٹ چھوڑ رکھے ہیں۔

آج صبح میری بیگم نے بچوں سے پوچھا کہ اگر بھنڈیاں پکا لی جائیں تو ٹھیک ہے۔ ان تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر سنجیدگی سے کہا۔ "بھنڈیاں کیسے پک سکتی ہیں؟ ابو نے سگریٹ چھوڑ رکھے ہیں۔"

ایک اور دشواری جو مجھے درپیش ہے وہ یہ ہے کہ میں جو بھی بات کرتا ہوں میرے اہل خانہ بیحد سنجیدہ اور رونی شکل بنا کر مجھے دیکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں۔ "ہاں آپ نے سگریٹ جو چھوڑ رکھے ہیں۔"

مثلاً اگر میں یہ کہوں کہ میں بھی اس گھر کا ایک فرد ہوں۔ کسی کو میرا بھی دھیان رکھنا چاہیے میرے کپڑوں کا میرا تو یہ کہا جاتا ہے کہ بس سگریٹ چھوڑ رکھے ہیں ناں اس لیے ایسی باتیں کرتے ہیں۔ اور اگر میں یہ کہوں کہ اگر انسان کی عمر زیادہ ہو جائے اور وہ بال بچوں والا ہو جائے تو بھی اسے محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو مجھے یہی کہا جاتا ہے کہ دراصل آپ نے سگریٹ چھوڑ دیئے ہیں اس لیے ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہیں اور شاید یہ درست بھی ہے کہ میں پہلے اس قسم کی باتیں نہیں کرتا تھا۔ شاید اس لیے کہ سگریٹ میرا خیال رکھتا تھا۔ میرے ساتھ رہتا تھا میرا رفیق تھا اور اب میں اکیلا ہوں۔ اور یہ تنہائی رفاقت اور چاہت مانگتی ہے۔ اور یہ چیزیں اس زمانے میں کم کم ہیں۔ میرا خیال ہے اب میں دل کی بات کہہ سکوں گا جو سوچتا ہوں وہ لکھ سکوں گا۔ جو چاہتا ہوں اس کا اعلان کر سکوں گا۔ کیونکہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں نے سگریٹ چھوڑ رکھے ہیں اور اسی لیے اوٹ پٹانگ باتیں کرتا رہتا ہوں۔

"نباتاتی مریض اور گملا بازی"

بچپن میں ایک کارٹون دیکھا تھا کہ لق و دق صحرا ہے نہ بندہ نہ پرندہ۔ البتہ ایک جنگی ٹینک دندناتا ہوا چلا جا رہا ہے اور اس بیابان میں ایک ننھا منا پھول کھلا ہے جو بالکل ٹینک کے راستے میں سر اٹھائے اس کی جانب خوفزدہ ہو کر دیکھ رہا ہے۔ تب ٹینک اپنا راستہ بدلتا ہے تاکہ وہ پھول اس کے آہنی وجود سے روندا نہ جائے۔ اس وقت بات سمجھ میں نہ آئی۔ گڑگڑاتے ہوئے ٹینک کو کیا ضرورت تھی کہ ایک فضول سے پھول کے لیے گیئر بدل کر اپنا راستہ بدل لے۔ لیکن اب پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں پھول اور بچے کیا خوب صدق اور معصومیت کے مظہر ہیں۔ کیا کوئی شخص کھیل کود میں مشغول کسی ننھے منے بچے کو ٹینک کے نیچے کچل سکتا ہے......؟ تو پھر پھول بھی کچلا نہیں جا سکتا۔

اگرچہ میری روزی کا انحصار کسی حد تک پھولوں پر تھا۔ بلکہ پھولوں کے بیجوں پر تھا۔ لیکن مجھے ذاتی طور پر ان سے کوئی ایسی چوڑی دلچسپی نہ تھی...... پھول اور پودے میرے لیے زندگی کے پس منظر کا ایک حصہ تھے۔ زندگی کا حصہ نہ تھے..... پھر یوں ہوا کہ..... ایک بلند فلیٹ میں ایام زندگی بسر کرتے کرتے ایک چھوٹا سا مکان نصیب میں آیا جس کے پچھواڑے میں تھوڑی سی زمین بھی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس خالی زمین کو سرسبز ہونا چاہیے۔ چنانچہ نرسریوں کا رُخ کیا..... چند دنوں کے اندر اندر میں ایک "نباتاتی مریض" بن چکا تھا۔ گھر سے نکلتا اور کسی نہ کسی نرسری میں گھس جاتا۔ شام کو واپسی پر بھی میں اس وقت تک پودوں پر جھکا رہتا۔ جب تک تاریکی ان کو مجھ سے جدا نہ کر دیتی..... اب میں صرف پودوں اور پھولوں کے بارے میں ہی باتیں کرتا تھا۔ ٹی وی کے اشتہاروں میں "چم چم چمکے" والی خاتون کو دیکھنے کی بجائے پس منظر میں سجے پھولوں پر ہی نگاہ پڑتی۔ لاہور کی سڑکوں کے کنارے لگے درخت اور پودے اب میرے لیے زندہ ہو گئے۔ میں ہر روز

ان کی بدلتی ہوئی حالت کو غور سے دیکھتا۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ کون سا درخت کون سے ہفتے پھول دے گا۔ اور میں اپنے سارے کام کاج چھوڑ کر اسے دیکھنے جاتا۔ انہی دنوں ایک اور راز مجھ پر آشکارا ہوا۔ جناح باغ میں بے شمار درختوں اور جھاڑیوں کو کاٹھ کباڑ ہی سمجھتا تھا۔ چند ایک تو اچھے لگتے۔ لیکن باقیوں کے بارے میں یہ سمجھ نہ آتی کہ آخر ان کو یہاں کیوں لگایا گیا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ دن گزرنے سے رتوں کے بدلنے سے میں نے دیکھا کہ سال میں کوئی نہ کوئی وقت ایسا ضرور آتا ہے جب وہ درخت جسے میں کاٹھ کباڑ سمجھتا تھا پھول دینے لگتا ہے اور اس پر اتنا بے پناہ جوبن آتا ہے کہ چند دنوں کے لیے وہ پورے باغ میں حسین ترین درخت بن جاتا ہے۔ چنانچہ وہ بے مقصد نہیں ہوتا۔ اسی طرح انسانوں کی زندگی ہوتی ہے۔ کوئی بھی شخص بے مصرف پیدا نہیں ہوتا۔ اس پر کچھ دن ایسے آتے ہیں جب وہ اپنے ہونے کا اپنی اہمیت کا اعلان کرتا ہے...... ہاں اسے دیکھنے کے لیے ایک ہمدرد نظر درکار ہے۔

پودوں اور پھولوں میں دلچسپی کی وجہ سے میں ان لوگوں کی تلاش میں رہنے لگا جو میری طرح "مریض" تھے۔ مریض تو بہت ملے۔ لیکن "معالج" تلاش کرنے میں بہت دشواری پیش آئی۔ ایک روز میرے والد صاحب کہنے لگے کہ تم سارا دن میرا سر کھاتے رہتے ہو کہ جی فلاں پودا کہاں سے ملتا ہے۔ کب پھول دیتا ہے۔ یہاں پاکستان میں اگ سکتا ہے یا نہیں...... تو چودھری خورشید کے پاس چلے جاؤ۔ میرے قدیم ترین دوستوں میں سے ہیں۔ چنانچہ میں چودھری خورشید کے پاس پہنچ گیا۔ ان کا گھر میرے لیے دنیا کا خوب صورت ترین گھر تھا۔ کیونکہ ان کے عجیب و غریب اور قدرت کے پراسرار باغ میں میں نے ایسے ایسے پودے اور پھول دیکھے جو اس سے قبل صرف کتابوں میں دیکھے تھے...... جن کے بارے میں یقین نہیں آتا تھا کہ یہ سچ مچ نظروں کے سامنے اُگ پائے ہیں۔ چودھری خورشید بھی خاصے پراسرار تھے۔ استاد اللہ بخش کے شاگرد اور ان کی ٹریڈیشن میں پینٹ کرنے والے مصور۔ ماہر علم نجوم اور ماہر نباتات و پودہ جات و پھول جات وغیرہ..... میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے۔ نہایت عقیدت سے ہاتھ ملایا اور کہنے لگے کہ چودھری صاحب آپ کا نسخہ بہت کیا ہوا۔ فلاں پام جو گملے میں لگایا تھا۔ اس کا ایک بیج پھوٹ آیا۔ چودھری صاحب اچھل پڑے۔ اچھا ہم چل کر دیکھتے ہیں۔ ایک اور صاحب آئے کہنے لگے جناب کیا کروں۔ حسن ابدال کی ریت نہیں ملتی تو کیا

گوجر خان کی ریت استعمال کروں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چودھری صاحب کہنے لگے ورنہ یہ غضب نہ کرنا، ریت تو حسن ابدال ہی کی چاہیے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ صاحب اٹھے اور حسن ابدال کی طرف روانہ ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ کیکٹس کی کسی خاص قسم کے لیے موٹی ریت درکار ہے۔ جو صرف حسن ابدال ہی میں ملتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک روز ایک حضرت جھومتے جھومتے آئے اور کہنے لگے چودھری صاحب بچہ ہو گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چودھری صاحب نے انہیں بہت بہت مبارک باد دی۔ میں نے پوچھا جناب لڑکا ہوا ہے یا لڑکی؟ وہ حضرت بے حد ناراض ہوئے۔ اگر میں چودھری صاحب کی پناہ میں نہ ہوتا تو یقیناً چانٹہ رسید کر دیتے۔ بعد میں پتہ چلا کہ ان کے کسی نہایت کمیاب نسل کے پودے کی جڑ سے ایک شاخ پھوٹی ہے۔ یعنی اس پودے کا ایک اور بچہ بن گیا ہے۔ اکثر اوقات پودوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے چودھری صاحب کچھ اس قسم کا بیان دیتے: "اس کی پرورش ٹھیک نہیں ہوئی۔ آپ نے اس کی خدمت نہیں کی۔ اس کی خوراک کا دھیان رکھیے ورنہ مر جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر پودا ایک جگہ خوش ہے تو اسے وہاں سے شفٹ مت کیجیے۔ ورنہ ناراض ہو کر مر جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ایک اور صاحب تشریف لائے اور پودوں کے بارے میں کچھ پوچھا۔ چودھری صاحب کہنے لگے۔ آپ کے پاس جگہ تو ہے نہیں پھر کیا کریں گے۔ وہ صاحب بولے میں گملا بازی کروں گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں چائے پی رہا تھا، پیالی میرے ہاتھ سے چھوٹتے بچی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا بازی کریں گے؟ میں نے پوچھا۔ "گملا بازی" وہ کہنے لگے۔ پودے گملوں میں اگاؤں گا۔" چودھری صاحب کے پاس آنے والے تقریباً تمام حضرات "نباتاتی مریض" ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ جو نباتاتی مریض ہوتے ہیں، تقریباً لاعلاج ہوتے ہیں۔ ان کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ وہ تھوڑا سا "کبا ہوا" ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیونکہ ہر وقت جھکا جھکا رہتا ہے اور پھولوں پودوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں پتوکی کے ایک غریب گھڑی ساز کو جانتا ہوں، جو نباتاتی مریض ہے اور مقامی کمہار اور اس کے پورے خاندان کی گھڑیاں اس شرط پر ٹھیک کرتا ہے کہ وہ اسے ہر برس بیس گملے بنا کر دے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک روایت کے مطابق ایک ایسے مریض تھے جو پکے مریض تھے اور فوت ہونے کو تھے۔ فوتیدگی سے پیشتر فرمایا کہ اس جہان سے چلے جانے کا کوئی دکھ نہیں صرف یہ دکھ ہے کہ ان دنوں گلاب کا موسم نہیں اور لوگ میری قبر پر گیندے کے پھول ڈالیں گے۔ جو مجھے پسند نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اولاد بے حد فرمانبردار تھی۔ انہوں نے کسی نہ کسی طرح گلاب کے پھولوں کا انتظام کر دیا اور بزرگ

فی الفور ہنسی خوشی فوت ہو گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اپنی اولاد کو اپنا پسندیدہ پھول بتائیے۔ ورنہ وہ انتظام کر دیں گے۔

خواتین و حضرات! اس موضوع پر میں ساری عمر لکھ سکتا ہوں کیونکہ "مریض" ہوں۔ لیکن فی الحال اجازت چاہتا ہوں۔ کیونکہ میرا ایڈوکیریویا اور میرے ڈبل پٹونیا میرا انتظار کر رہے ہیں۔ خدا حافظ!

"ماچس ہو گی آپ کے پاس؟"

ان دنوں اخبارات میں ماچسوں کا بہت تذکرہ ہے۔

پچھلے ماہ اسلام آباد میں ایک پاکستانی صاحب نے ماچسوں کا شو منعقد کیا جس میں ہزاروں ماچسیں نمائش کے لئے رکھی گئیں۔ بشنید ہے کہ یہ دنیا میں ماچسوں کا دوسرا سب سے بڑا ذخیرہ ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ ماچس موصوف خود سگریٹ تک نہیں پیتے...... میرا جی چاہتا ہے کہ ان صاحب سے جا کر پوچھوں کہ...... ماچس ہو گی آپ کے پاس!

پچھلے دنوں کی بات ہے کہ لاہور ٹیلیویژن سے "ایک حقیقت ایک فسانہ" نام کا ایک پاپولر ڈرامہ سیریل ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا۔ جس میں رپورٹر کا نام امجد ہوا کرتا تھا اور ایڈیٹر صاحب اپنے آپ کو "انچارج" کہلایا کرتے تھے۔ انچارج صاحب ایک مخبوط الحواس قسم کے شخص تھے جو ہر وقت بولائے پھرتے تھے۔ اور ان کا تکیہ کلام "وقت کم ہے اور مقابلہ سخت" بے حد پسند کیا جاتا تھا۔ ان انچارج صاحب کے ہونٹوں سے ایک ان جلا سگریٹ لٹک رہا ہوتا تھا۔ اور جونہی امجد ان کے کمرے میں داخل ہوتا تو وہ ہمیشہ ایک ہی فرمائش کرتے کہ...... ماچس ہو گی تمہارے پاس!...... انچارج کا یہ کردار نثار قادری نے ادا کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک انتہائی ڈرامائی اور سنجیدہ منظر میں طاہرہ نقوی مرحومہ آنکھوں میں آنسو لئے رپورٹر کو اپنی دردناک کہانی سنا رہی تھی۔ پورے ماحول میں سوگواری تھی اور طاہرہ اپنے کردار میں ڈوبی روئے چلی جا رہی تھی۔ انچارج صاحب جو بالکل خاموش کھڑے تھے انتہائی رونی شکل بنا کر آگے بڑھے اور طاہرہ سے کہنے لگے...... "ماچس ہو گی آپ کے پاس؟" اس پر طاہرہ نقوی یکدم کھلکھلا کر ہنس دی اور وہاں پر موجود تمام حضرات بے اختیار مسکرانے لگے۔ منظر دوبارہ شروع ہوا۔ لیکن اب طاہرہ نقوی سے سنجیدہ نہیں ہوا جاتا تھا۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ یہ سین دوسرے دن پر اٹھا رکھا جائے اور یہ کہ نثار قادری اس ایسے منظر میں ماچس ہو گی آپ کے پاس بالکل نہیں کہیں گے...... ویسے جی تو میرا چاہتا ہے لیکن حق نثار قادری کا بنتا ہے کہ وہ ان اسلام آباد والے ماچس کلکٹر سے جا کر پوچھیں کہ "ماچس ہو گی آپ کے پاس؟"

اب ہم فرض کر لیتے ہیں کہ معاشرے کے دیگر افراد کو بھی ماچس کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ضرورت ہے تو ملاحظہ فرمایئے۔

ایک شاعر۔ ماچس ہو گی آپ کے پاس...... کیوں میں نے باقی تمام شاعروں کے دیوان جلانے ہیں (شاعر کی بجائے کالم نگار وغیرہ بھی استعمال ہو سکتا ہے)

ایک سیاستدان۔ ماچس ہو گی آپ کے پاس...... کیوں؟ میں نے بقیہ سیاسی پارٹیوں کے منشور کو آگ لگانی ہے۔

لاہور کارپوریشن اور واپڈا وغیرہ۔ ماچس ہو گی آپ کے پاس...... کیوں؟ ہم نے اخباروں میں اپنے خلاف چھپنے والی شکایتوں کو دیا سلائی دکھانی ہے۔

ایک اداکارہ...... ماچس...... کیوں؟...... فلاں اداکارہ کا ہیر سٹائل بہت خوبصورت ہے میں نے اس کا جھاڑا ساڑنا ہے۔

ایک بی جمالو...... ماچس...... کیوں؟ میں نے مجلس میں چنگاری ڈالنی ہے۔

ایک سپر پاور...... ماچس...... لبنان کے لیے درکار ہے۔

ایک عام آدمی...... ماچس ہو گی آپ کے پاس...... کیوں کیا کرنی ہے؟...... کمال ہے...... میں تو صرف اپنا سگریٹ سلگانا چاہتا ہوں......

آپ پہچان گئے ہوں گے کہ مندرجہ بالا فہرست انتہائی طویل ہو سکتی ہے اور آپ اپنی من مرضی

کے کرداروں کے بارے میں سوچ سکتے ہیں کہ وہ ماچس کو کس طرح استعمال کریں گے۔ البتہ آپ یہ جاننے میں بھی حق بجانب ہوں گے کہ میاں آج تمہیں ماچسوں کے بارے میں کالم لکھنے کی کیا سوجھی؟ تو عرض یہ ہے کہ اپنے ہمسائے ملک ہندوستان کے شہر دہلی میں صرف ماچس نہ ہونے کی بنا پر ایک بڑا شاندار منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ہوا یوں کہ ایک ساس اور سسر اپنی نو بیاہتا بہو سے فرمائش کرتے رہتے تھے کہ رانی جی تم ذرا اپنے ماں باپ کے گھر جاؤ اور ان سے مبلغ دس ہزار روپے مانگ کر لے آؤ ہمیں ضرورت ہے۔ بد قسمتی سے رانی جی کے ماں باپ بے حد غریب تھے۔ چنانچہ ساس اور سسر کی یہ معصوم خواہش پوری نہ ہو سکی اور انہوں نے نالائق بہو پر مٹی کا تیل چھڑکا تاکہ اس کا قصہ پاک کیا جا سکے..... آگ لگانے کے لئے ماچس درکار ہوتی ہے اور وہ اس وقت گھر میں موجود نہ تھی۔ سب لوگ تلاش کرتے رہے اور اتنی دیر میں ہمسایوں کو خبر ہو گئی اور بہو کو آگ نہ لگائی جا سکی..... میرا خیال ہے کہ جب وہ گلی محلے میں ماچس ڈھونڈ رہے تھے اور کہتے پھرتے کہ ماچس ہو گی آپ کے پاس تو کسی نے پوچھا ہو گا کہ کرنی کیا ہے تو انہوں نے اطمینان سے جواب دیا ہو گا کہ..... بس بہو کو آگ لگانی ہے۔

"میں بھی انٹرنیشنل ہونا چاہتا ہوں"

ان دنوں میں بے حد اداس ہوں کیونکہ میں ابھی تک "انٹرنیشنل" نہیں ہوا..... میرے بیشتر دوست انٹرنیشنل ہو گئے ہیں لیکن میں نہیں ہو سکا اور اسی لئے میں اداس ہوں، رنجیدہ ہوں کہ میں ابھی تک انٹرنیشنل کیوں نہیں ہوا۔

انٹرنیشنل وہ لوگ ہوتے ہیں جو کسی زمانے میں پاکستان میں پائے جاتے تھے لیکن اب کبھی دوبئی، کبھی کینیڈا، امریکہ اور کبھی ناروے اور کبھی ناروے سے خبر آتی ہے کہ وہ وہاں پائے جاتے ہیں اور پھر ایک بیان دیتے ہیں کہ خواتین و حضرات میں ان دنوں ملک غیر میں پاکستان کا نام روشن کر رہا ہوں اور بہت زیادہ روشن کر رہا ہوں۔ اللہ کے فضل سے وہاں میری اتنی آؤ بھگت ہوتی ہے کہ میں تو کبھی پاکستان نہ آتا اور پاکستانی عوام کو کبھی منہ نہ لگاتا لیکن پھر بھی میں پاکستان واپس آیا ہوں کیونکہ عزت میری نہیں پاکستان کی ہوتی ہے..... ان لوگوں میں گلوکار سر فہرست ہیں..... مثلاً سال دو سال بعد ٹیلی ویژن سٹیشن کے آس پاس شوکت علی سے ملاقات ہو جاتی ہے اور میں اسے مشکل سے پہچانتا ہوں۔ وہ بسم اللہ بسم اللہ کرتا ہوا آگے آتا ہے اور بغلگیر ہو جاتا ہے۔ "شوکت جی! کہاں ہوتے ہو نہ کسی فنکشن میں، نہ ٹیلیویژن پر۔"

"ہم نے کہاں ہونا ہے تارڑ بھائی..... بس آپ کے قدموں میں..... دراصل آج صبح شارجہ سے آ رہا ہوں۔ کل رات البرٹ ہال لندن میں پروگرام ہے۔ پھر کینیڈا کے سکھ میرا انتظار کر رہے ہیں....."

"ہائے تو کینیڈا کے سکھ بڑے اچھے ہیں کہ تمہاری گائیکی سے لطف اندوز ہوتے ہیں؟"

"شرمندہ نہ کرو تارڑ صاحب..... بس دو ماہ کے لیے افریقہ جانا ہے۔ پھر اگلی عید تک..... یوں بھی پاکستان کا نام روشن ہو رہا ہے..... دن رات یہی کام کر رہا ہوں نام روشن کرنے کا۔"

کبھی غلام علی سے ملاقات ہو جاتی ہے چار چھ ماہ بعد۔

"اوہو...... تارڑ صاحب! بڑا پیار آپ نے مجھے دیا، ہندوستان گیا تو وہاں بھی لوگوں نے بڑا پیار دیا۔ کل بمبئی میں کنسرٹ تھا...... پرسوں کویت جا رہا ہوں...... اللہ نے بڑی عزت دی ہے...... امریکہ سے واپسی پر ملاقات ہوگی"

مہدی حسن نے باقاعدہ اپنے بیٹے کو پاکستان کے سپرد کر دیا ہے کہ آپ فی الحال اس کے ساتھ گزارہ کریں میں ذرا باہر کے ملکوں میں اپنا نام روشن کر آؤں...... مہدی حسن صاحب کی آواز سنے ہوئے ایک زمانہ ہو گیا کیونکہ وہ بھی انٹرنیشنل ہو چکے ہیں......

اپنے ڈرامہ سیریل "ہزاروں راستے" کے لئے مجید امجد صاحب کی نظم "ہزاروں راستے ہیں منزلیں ہیں" ریکارڈ کروانی تھی فیصلہ ہوا کہ مہناز کی آواز مناسب رہے گی۔ معلوم ہوا کہ وہ تو دوبئی گئی ہیں۔ وہ واپس آئیں تو نظم ریکارڈ ہوئی۔ دو روز بعد ان کی پھر ضرورت پڑی تو پتہ چلا کہ امریکہ چلی گئی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے یار لوگ پاکستان میں صرف سانس لینے آتے ہیں اور پھر واپس جا کر اس کا نام روشن کرنے لگ جاتے ہیں۔ اب اگر آپ مہدی حسن، شوکت علی، غلام علی وغیرہ کو سننا چاہتے ہیں تو کینیڈا اور امریکہ جا کر سنئے۔ موسیقی کا ایک پروگرام ہونے لگا تو تیاں چوہدری کی تلاش ہوئی وہ بھی پتہ نہیں کون سے ملک میں نام روشن کر رہی تھیں۔ منی بیگم تو خیر سے رہتی ہی باہر کے ملکوں میں ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان خواتین و حضرات سے درخواست کی جائے کہ پاکستان کا نام ماشاءاللہ بہت زیادہ روشن کر چکے اب وطن واپس آئیے اور چشم ما روشن کیجئے۔ اداکاروں کی بھی یہی حالت ہے۔ نیپال اور سری لنکا تو ویک اینڈ پر جاتے ہیں ورنہ تمام شوٹنگیں غیر ممالک میں ہوتی ہیں۔ گلوکاروں کے ساتھ اداکار بھی انٹرنیشنل ہو گئے۔ یہاں تک تو معاملہ ٹھیک تھا لیکن میرے اداس ہونے کی وجہ اور ہے اور وہ یہ کہ پاکستانی ادیب اور شاعر بھی انٹرنیشنل ہو گئے ہیں۔ اس بین الاقوامیت کا آغاز تو ہندوستان کے مشاعروں سے ہوا۔ ان کمرشل مشاعروں کا کوئی بیوپاری پاکستان آ نکلے تو محب الوطن شاعر حضرات اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ وہ اترنا چاہتا ہے تو بھی نہیں اتارتے، بٹھائے رکھتے ہیں۔ اب مشاعروں کا دائرہ کار

وسیع ہو گیا ہے...... کینیڈا، امریکہ، کویت، دوبئی، ناروے وغیرہ میں مشاعرے ہو رہے ہیں اور پاکستانی شاعر درجنوں کے حساب سے انٹرنیشنل ہوتے جا رہے ہیں۔ ان مشاعروں میں شرکت کے لئے سفارشیں ہو رہی ہیں۔ بزرگ شاعر اپنے بچوں کو آگے آگے کر رہے ہیں کہ جی میری جگہ اسے لے جائیے ان میں سے کچھ ظاہر ہے "اصلی شاعر ہیں اور کچھ شاعر کے میک اپ میں ہیں"...... یہ حضرات بھی پاکستان کا نام روشن کرنے جاتے ہیں۔ اب مجھے سخت شرمندگی ہو رہی ہے کہ میں اپنے وطن سے محبت کے اتنے بلند بانگ دعوے کرتا ہوں لیکن ہاتھ پہ ہاتھ دھرے گھر بیٹھا ہوا ہوں اور اس کا نام روشن نہیں کر رہا...... میرا مسئلہ یہ بھی ہے کہ میں گلوکار نہیں ہوں اور شاعر بھی نہیں ہوں، تو پھر کیا کروں۔

میرے دل میں انٹرنیشنل بن کر وطن کی خدمت کرنے کی خواہش ہے۔ میری آرزو ہے کہ میں بھی پاکستان کا نام روشن کروں اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ پاکستان میں رہ کر پاکستان کا نام روشن نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہاں کے لوگوں میں وہ ذوق نہیں ہے۔ ان کے پلّے اتنا پیسہ نہیں ہے اور لوگ بھی گھر کی مرغی دال برابر سمجھتے ہیں۔ باہر کے لوگ بڑے سمجھدار ہیں اور عزت کرنے والے ہوتے ہیں ادھر والا پاکستان کا نام "روشن" کرنے کے بہت سارے طریقے ہیں...... تو خواتین و حضرات میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ کسی نہ کسی طریقے سے مجھے "انٹرنیشنل" کروا دیں۔ یعنی باہر بھجوا دیں۔ باہر جا کر کیا کروں گا اس کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن ایک بات طے ہے کہ میں باہر جا کر کسی نہ کسی طریقے سے پاکستان کا نام روشن کر ہی دوں گا۔ مجھے امید ہے کہ باقی حضرات جو اتنے عرصے سے اس کام کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں میرے لئے کچھ نہ کچھ گنجائش رکھی ہوگی۔ کیونکہ اگر میں وہاں پہنچا اور پاکستان کا نام پوری طرح روشن نہ ہوا تو پھر میں کروں گا......!

"ماؤنٹ ایورسٹ پر یادیں"

چند برس پیشتر ایک یورپی اخبار میں ایک ایسے کوہ پیما کا تفصیلی انٹرویو چھپا تھا۔ جس کی زندگی کی واحد خواہش بس یہی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچ جائے۔ اس خواہش کے حصول کے لئے وہ ہر سال نیپال جاتا تھا۔ ایورسٹ پر چڑھنے کی کوشش کرتا تھا اور ہمیشہ ناکام ہو کر واپس یورپ پہنچ جاتا تھا۔ ان صاحب سے دریافت کیا گیا کہ جناب شرپا تن زنگ اور سر ایڈمنڈ ہیلری کے بعد سینکڑوں نہیں تو درجنوں حضرات اس چوٹی کو سر کر چکے ہیں۔ اس کا غرور خاک میں ملا چکے ہیں تو پھر آپ اپنی جان جوکھوں میں کیوں ڈالتے ہیں۔ یورپ کے مزے چھوڑ کر نیپال کے ویرانوں میں کیوں دھکے کھاتے پھرتے ہیں؟...... کوہ پیما صاحب نے جواب میں کہا کہ میں دراصل صرف ایورسٹ کی چوٹی سر کرنا نہیں چاہتا بلکہ وہاں جا کر دنیا کی اس بلند ترین جگہ پر کچھ ایسے کاغذات، کچھ ایسے خطوط رکھ کر آنا چاہتا ہوں جن کے بارے میں میری خواہش ہے کہ وہ تا ابد محفوظ رہیں اور کوئی انسانی آنکھ انہیں نہ دیکھ سکے...... وہ کاغذات کیا تھے۔ وہ خطوط کس کے تھے اس کے بارے میں انہوں نے لب کشائی نہیں کی البتہ ان کے انٹرویو سے مجھے کالج کے زمانے کی وہ کوہ پیما مہم ضرور یاد آ گئی جو سولہ ہزار فٹ بلند رتی گلی چوٹی کو سر کرنے کے لیے آزاد کشمیر گئی تھی اور جس کے نوجوان اراکین میں میں بھی شامل تھا۔ مجھے یاد ہے کہ رتی گلی گلیشیر کو عبور کر کے جب چوٹی پر پہنچے تو وہاں ایک چھوٹا سا پتھریلا میدان تھا۔ جہاں ہم سب لوگ تھکاوٹ کی وجہ سے ہانپتے ہوئے لیٹ گئے۔ البتہ جاوید اشرف غائب ہو گیا۔ جب ہم چوٹی کی دوسری جانب اترنے لگے تو جاوید بھی نمودار ہو گیا۔ میں نے پوچھا کہاں چلے گئے تھے؟ کہنے لگا میں سب کی نظروں سے چھپ کر چوٹی کے ایک کونے میں ایک پتھر کے نیچے کچھ چیزیں رکھ کر آیا ہوں۔ اگر زندگی رہی تو میں اس پہاڑ کی طرف دوبارہ آیا تو

دیکھوں گا کہ وہ چیزیں یہاں موجود ہیں یا نہیں...... جاوید نے بھی اس کوہ پیما کی طرح مزید تفصیل بتانے سے انکار کر دیا۔ رتی گلی کی چوٹی پر گئے ہوئے مجھے انتیس برس گذر چکے ہیں۔ جاوید ان دنوں امریکی شہری ہے اور کبھی پاکستان واپس نہیں آتا۔ اس کی چیزیں شاید ابھی تک وہیں پڑی ہوں۔ کبھی کبھار میرا جی چاہتا ہے کہ رتی گلی کی چوٹی پر جا کر دیکھوں تو سہی کہ اس نے وہاں کیا رکھا تھا......

ہر انسان کے دل میں ایک عجیب و غریب خواہش ہوتی ہے۔ ایک ایسی خواہش جس کا بظاہر کوئی جواز نہیں ہوتا کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور وہ یہ کہ وہ اپنی چند ذاتی اشیا ایسی جگہ چھپا کر رکھے جہاں انہیں کوئی دیکھ نہ سکے کوئی تلاش نہ کر سکے۔ مصری اور مایا تہذیبوں میں اہم افراد کی مقبروں کے خفیہ تہہ خانوں میں خزانے رکھے جاتے تھے۔ چولستان اور موہنجوڈارو میں بھی ایسی قبریں ملی ہیں جن میں روز مرہ ضروریات کے ظروف بچے ہوئے تھے۔ یہ درست ہے کہ ان لوگوں کے عقیدے کے مطابق ان کے ساتھ دفن کی جانے والی اشیا ان کے اگلے جنم کی ضرورتوں کے لیے ہوتی تھیں۔ لیکن اس عمل میں بھی ان چیزوں کو دوسروں سے چھپانے کا عمل ہوتا تھا...... لیکن یہ سب کچھ چھپ نہ سکا۔ حضرت انسان نے کھدائی کر کر کے ان پوشیدہ اشیا کو بھی نکال لیا اور تاریکی سے دن کی روشنی میں لا رکھا۔ زمین کی گہرائیوں میں مدفون اشیاء تو ظاہر کر دی گئیں لیکن دنیا کی بلند ترین چوٹیاں ابھی محفوظ تھیں۔ وہاں پہنچنا اتنا آسان نہ تھا...... لیکن نیپال کی ایک خبر کے مطابق ماؤنٹ ایورسٹ بھی اب محفوظ نہیں رہی۔ ایک خصوصی مہم صرف اس مقصد کے لئے ماؤنٹ ایورسٹ کو بھیجی گئی کہ وہاں جائے اور چوٹی پر جمع کاٹھ کباڑ کی صفائی کر کے آ جائے۔ یہ کاٹھ کباڑ ان کوہ پیماؤں کا چھوڑا ہوا ہے جو اس چوٹی کو سر کرنے میں کامیاب ہو گئے اور پھر نشانی کے طور پر وہاں کچھ نہ کچھ چھوڑ آئے۔ پچھلے برسوں میں اتنے زیادہ کوہ پیماؤں نے اس چوٹی پر قدم رکھا تھا کہ ان کی چھوڑی ہوئی نشانیوں سے وہاں ایک خاصا جنک یارڈ بن چکا ہے۔ وہاں ہر جگہ تو صرف اتنی سی ہے کہ بندہ اس پر کھڑا ہو کر ایک آدھ تصویر اتروائے اور واپس آ جائے۔ اب یہی ہوا ہو گا کہ کسی کوہ پیما نے شکایت کی ہو گی کہ جناب میں تو اپنے تئیں ایورسٹ پر گیا تھا لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ لاہور کارپوریشن کے کسی علاقے میں آ گیا ہوں جہاں ہر جانب کوڑے کرکٹ کے

ڈھیر تھے۔

ماضی کے کوہ پیماؤں نے بڑے چاؤ سے وہاں اپنی نشانیاں رکھی ہوں گی۔ اس یقین کے ساتھ کہ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا اور یہ تاابد انہی برفوں میں مدفون رہیں گی اور ان کے حوالے سے ان کا نام بھی تاابد زندہ رہیں گے۔ انہیں کیا پتہ کہ کسی روز وہاں ایک جھاڑو بردار دستہ روانہ کر دیا جائے گا جو جا کر ماؤنٹ ایورسٹ پر جھاڑو دے گا اور وہاں بہت کاٹھ کباڑ جمع ہے۔ پتہ نہیں وہ کیا اور کونسی نشانیاں تھیں جو کہ کوہ پیماؤں نے دنیا کے اس بلند ترین مقام پر رکھیں اور خود واپس اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے..... بیئر کے ٹین ہوں گے۔ نقشے ہوں گے۔ پرچم ہوں گے، پتہ نہیں کیا کیا ہوگا..... شاید تصویریں بھی ہوں..... ان چہروں کی تصویریں جو انہیں جان سے زیادہ عزیز تھے اس لیے تو وہ انہیں ایورسٹ پر رکھنے کے گئے اپنی جان خطرے میں ڈال کر..... ایسے خطوط جو غیروں کے لیے نہیں تھے..... ان سب کے ظاہر ہونے کا خطرہ تھا..... لیکن یہ خطرہ فی الحال ٹل گیا ہے کیونکہ صفائی کے اس کام پر معمور مہم کے دو رکن ایورسٹ پر چڑھنے کی کوشش میں ہلاک ہو گئے ہیں اور مہم واپس آ گئی ہے..... ایورسٹ نے فی الحال اپنے بھیدوں کو محفوظ رکھا ہے۔ اپنے رازوں پر سے برفانی پردہ نہیں اٹھایا..... دنیا میں کم از کم کوئی تو ایسی جگہ ہونی چاہیے جہاں انسان اپنی یادیں رکھے اور تاابد وہیں پڑی رہیں کل کا کیا پتہ..... ایٹمی جنگ سے انسان کی تمام نشانیاں مٹ جائیں..... اور صرف وہی باقی رہ جائیں جو بلند ترین چوٹیوں پر محفوظ ہیں۔

"ہائے میری مُرغابیاں"

شاہ جی آئے اور ان کے ہمراہ مرزا صاحب بھی آ گئے۔

شاہ جی اتنے عرصے بعد آئے تھے کہ ان کی گروچو مارکس ٹائپ کی مونچھیں ڈھلک چکی تھیں اور مرزا صاحب کا الٹا سویٹر سکڑ کر ان کی توند کو نمایاں کر رہا تھا۔ یہ دونوں حضرات میرے دوست ہیں اور بڑے استاد ہیں..... یہ استاد لاہوری محاورے کے مطابق نہیں بلکہ معلم ہونے کے حوالے سے ہیں اور اگر میرے دوست ہیں تو پھر ادیب بھی ہیں۔

ایک زمانے میں اور وہ زمانہ قدیم نہیں بس سات آٹھ برس پیشتر کا قصہ ہے۔ ہم لوگ بڑی باقاعدگی سے ملتے تھے..... پھر شاہ جی نے اپنے آپ کو ذرا مصروف کر لیا اور مرزا صاحب پتہ نہیں کس فلسفی کو پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچے کہ زندگی کیا ہے غم کا دریا ہے۔ اس لیے زندگی سے دور ہونے کے لیے دوستوں سے دور ہو گئے اور وہاں یہ بھی ہوا کہ انہیں زندگی نے بھی جکڑ لیا اپنا قیدی بنا لیا۔ ہم روزمرہ کے معمولات میں اس بری طرح سے غرق ہوئے کہ ابھرنے کا نام تک نہ لیا۔ شاید ٹریجڈی اسی کا نام ہے کہ انسان مسلسل کام کرتا چلا جائے اور باقی ہر شے سے دور ہو جائے..... بہر حال اس روز شاہ جی کے جی میں جانے کیا آئی کہ آ گئے اور ساتھ ساتھ مرزا صاحب بھی چلے آئے۔

"اوئے یار....." شاہ جی نے ایک دل دوز ہوکا بھر کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ "بڑا جی چاہتا تھا ملنے کو..... لیکن....." اور اس "لیکن" کے بعد انہوں نے اپنی مصروفیات کی ایک لمبی فہرست سنا دی۔ اسی طرح مرزا صاحب ذرا لٹکتے ہوئے لہجے میں بولے۔ "چھوڑیں جی....." اور پھر ایک نیم دلانہ سا ہاتھ ملایا..... مرزا صاحب نے بھی مصروفیات کا حوالہ دیا۔

شاہ جی بڑی رونی صورت بنا کر بیٹھے تھے۔ یکدم میز پہ مکا مار کر بولے۔ "اوئے یار۔۔۔۔ [illegible] آزاد ہو گئے ہیں۔ پھانسی پانے والوں کے گلے آزاد ہو گئے ہیں۔ ہم کب آزاد ہوں گے؟"

"انسان زنجیروں میں جکڑا ہوا پیدا ہوا تھا۔" مرزا صاحب نے ارشاد کیا۔

"کوئی نہیں پیدا ہوا تھا زنجیروں میں، یہ زنجیریں ہم نے خود پہنی ہیں۔" شاہ جی گرجدار آواز [illegible] کی کوشش میں کچھ بے وقوف ہو گئے۔ "ہم آزاد ہو سکتے ہیں۔"

"کس طرح؟" میں نے دریافت کیا۔

"سردیوں کی نرم دھوپ میں بیٹھ کر۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"مذاق کرتے ہو؟" مرزا صاحب نے گھورا۔

"نہیں مرزا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اوئے یار ہم اپنی اپنی مصروفیتوں میں قید ہو گئے ہیں۔ ٹھیک ہے ہم سب آسودہ حال ہونے کی کوشش کر رہے ہیں اور شہرت پر کانٹیاں ڈال رہے ہیں لیکن خالو یہ زندگی تو نہیں اور بقول کسے زندگی کیا ہے غم کا دریا ہے۔"

"نہیں تو یہ سردیوں کی نرم دھوپ میں بیٹھ کر ہم کیسے آزاد ہو جائیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"ذرا دماغ پہ زور دو اور بتاؤ کہ ان دنوں کیا موسم ہے اور کون سا مہینہ ہے؟" شاہ نے مونچھیں چڑھائیں۔ یہ اس کا کمال ہے وہ اتنی بھاری مونچھوں کو مسکراتے ہوئے ایسے پھڑکاتا ہے۔ جیسے ان میں کوئی بٹیرا پھنس گیا ہو۔

"یار کیا فضول سوال پوچھا ہے۔" مرزا صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔ "موسم سرما ہے اور مہینہ دسمبر کا۔"

"بالکل۔۔۔۔ یہ وہی مہینہ ہے جس کے بارے میں عرش صدیقی نے کہا تھا کہ اسے کہنا دسمبر آ گیا ہے اور میں تم سے کہتا ہے کہ دسمبر آ گیا ہے اور ذرا دسمبر کے ان دنوں کے بارے میں سوچو جب ہم اتنے مصروف نہیں ہوا کرتے تھے اور سردیوں کی نرم دھوپ میں بیٹھ کر ایسے پرسکون اور آسودہ محسوس کرتے تھے کہ جہاں تا بہ حد بھی دیکھ لیتے تو ہمارے ساتھ بیٹھ کر اپنے فن میں ڈوب کر سراغ زندگی پا لیتے۔"

"بات یہ ہے چودھری صاحب۔۔۔۔ کہ دسمبر کی دھوپ چار دن کی ہے۔ کچھ یاد ہے ہم ان [illegible]

میں ایک بار اپنی بیگموں کے ہمراہ شرقپور گئے تھے اور راستے میں سرسوں کے کھیتوں سے ساگ چوری کیا تھا۔ اور پھر اور وہاں کے باغ کے کنارے بیٹھ کر اس سنہری دھوپ میں شلجم اور گاجریں کھائی تھیں۔۔۔۔ ہائے ہائے کیا زندگی تھی۔"

"اگر گاجریں کھانا زندگی ہے تو ہم یقیناً خرگوشوں پر رشک کر سکتے ہیں۔" مرزا صاحب مسکرائے۔

"یار مذاق نہ کرو میں بہت سنجیدہ ہوں۔۔۔۔ دسمبر کی دھوپ چار دن کی ہوتی ہے۔"

"ہاں۔۔۔۔" میں نے بھی سر ہلایا "اور دسمبر کی اس نرم اور آسودگی میں گھلی ہوئی دھوپ میں اگر آپ کہیں دریائے چناب کے قادر آباد بیراج پر چلے جائیں تو وہاں دریا کے ساتھ میلوں تک جھیلوں کا ایک سلسلہ ہے اور ان میں جا بجا سرکنڈے اور جنگلی گھاس ہے جو سرسراتی ہے اور سورج کی کرنیں جھیلوں کے پانیوں کو اس طرح گرم کرتی ہیں کہ ان پہ تیرتی ہزاروں مرغابیاں اونگھنے لگتی ہیں۔"

"مرغابیاں اونگھنے لگتی ہیں؟" شاہ نے نعرہ لگایا۔ "ہائے ہائے ظالمو وہیں چلو۔ ابھی چلو۔ بس مجھے اجازت دو کہ میں "سُن وے بلوری اکھ والیا۔۔۔۔" کی کیسٹ گھر سے لے آؤں۔"

"شاہ جی۔۔۔۔" میں نے ناراض ہو کر کہا۔ "مرغابیوں کو یہ کیسٹ پسند نہیں۔"

"نہیں تو نہ سہی۔۔۔۔" شاہ جی نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔ "دوستوں کو پسند نہیں تو نہ سہی۔"

"چودھری صاحب یہ جو قادر آباد کا آپ نقشہ کھینچ رہے ہیں۔ تو کیا یہ سچ مچ ایسا ہے یا زیب داستان کا سلسلہ ہے؟"

"مرزا صاحب۔۔۔۔ آپ ان دنوں وہاں جائیں تو سہی۔۔۔۔ تاحد نظر دھوپ میں لیٹا پانی اور سنہرے سرکنڈے اور ہوا اور خاموشی اور اس خاموشی میں کہیں ادھر کہیں ادھر مرغابیوں کی ڈاریں، پانیوں پہ ہلکورے لیتی ہوئیں۔"

"ہائے میری مرغابیاں" شاہ جی نے "ہائے میری انگوٹھیاں" کی تان پہ اپنا رانجھا راضی کیا۔

مرزا صاحب نے شاہ جی کو چپ ہونے کے لیے کہا اور پھر اپنے گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر کہنے لگے۔ "شاہ ٹھیک کہتا ہے ہم قید ہو چکے ہیں۔ ہمیں آزاد ہونا چاہیے۔ اور یہ کام ہمیں خود

کن ہو گا۔ اس کے لیے ایمنسٹی انٹرنیشنل ہماری مدد نہیں کرے گی۔"

"بالکل" شاہ جی نے مونچھوں پر تاؤ دیا۔ "سب کچھ چھوڑو۔ گھر بار چھوڑو اور ایک دن کے لیے نکالو ایک دن کے لیے نادر آباد چلتے ہیں۔"

"نادر آباد نہیں شاہ جی قادر آباد...؟"

"ہاں وہی۔ کاروں پر چلتے ہیں۔ کو نشن مارکیٹ سے جنرل ٹیف کا ایک کو خرید لیں گے اور ابلے ہوئے انڈے چپس اور....."

"کچھ گلاب جامن بھی....." مرزا صاحب نے کہا۔

"نہیں یار مجھے گلاب جامن پسند نہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے تو ہیں۔" مرزا صاحب ناراض ہونے لگے "گلاب جامن کے بغیر نہیں جانا۔"

"ہاں تو..... گلاب جامن اور بیگموں سے کہیں گے کہ پراٹھے اور انڈے۔"

"نہیں نہیں" مرزا صاحب اچھل پڑے "بیگموں کو تو بتانا ہی نہیں۔ وہ کہیں گی ہمیں بھی ساتھ لے کر جاؤ۔ ہم آزاد ہونا چاہتے ہیں ایک روز کے لیے اور اپنی زنجیریں ساتھ لے کر چلیں؟ نہیں نہیں۔"

"اچھا تو بیگمیں نہیں جائیں گی" شاہ جی نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے دوست کہتے ہیں تو ٹھیک ہے ویسے یہ نادر آباد میرا مطلب ہے قادر آباد کو لاہور سے راستہ کون سا جاتا ہے۔"

"لاہور سے گوجرانوالہ..... وہاں سے علی پور چٹھہ کی طرف"

"گوجرانوالہ..... ہائے ہائے مرزا صاحب چرغے۔"

"کیا مطلب مرزا صاحب چرغے" مرزا صاحب چونکے۔

"میرا مطلب ہے وہاں روسٹ چرغے ملتے ہیں۔ روسٹ چرغے وہ بھی کھائیں گے۔"

"نہیں نہیں اگر گوجرانوالہ میں ہم روسٹ چرغے وغیرہ کھانے کے لیے بیٹھ گئے تو دیر ہو جائے گی اور یوں بھی نیند آنے لگے گی۔"

"چلیے پکنک کرائیں گے" شاہ جی نے خوش ہو کر کہا "تو بس ٹھیک ہے۔ کب کا پروگرام بنائیں

کل چلیں؟"

"کل؟ یار کل تو میرے بیٹے کا پہلا سینڈاپ امتحان ہے۔ اسے کار چاہیئے۔ پرسوں نہ چلیں؟" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے" مرزا صاحب بولے "لیکن گلاب جامن ضرور ساتھ لے جانے ہیں۔"

"یار بات یہ ہے" شاہ جی نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ "پرسوں تو ٹی وی ٹائم والے میرا انٹرویو لینے آ رہے ہیں پرسوں نہیں..... جمعے کے روز بہتر رہے گا چھٹی بھی ہے۔"

"او نہیں بھئی" مرزا صاحب کہنے لگے "بڑی مشکل سے سیریل کا آئیڈیا منظور ہوا ہے۔ جمعے کے روز تو میری میٹنگ ہے پروڈیوسر کے ساتھ۔"

"تو ہفتے کے روز طے کر لیتے ہیں۔ کیونکہ اس روز سب فارغ ہوں گے ٹھیک ہے؟"

"یار ہفتے کے روز تو میں اسلام آباد چلا جاتا ہوں۔ صبح کی نشریات کی میزبانی کے سلسلے میں....."

میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔

"تو پھر اگلے ہفتے سہی۔"

"بالکل اگلے ہفتے۔"

"ہاں ضرور..... ہر صورت آزاد ہونا ہے۔ دسمبر کی دھوپ چار دن کی ہوتی ہے۔"

"ہائے ہائے مرغابیاں" شاہ جی خوش ہو رہے تھے۔ لیکن نہیں، وہ جانتے تھے کہ دسمبر کی دھوپ کے چار دنوں میں سے ایک دن ختم ہو رہا ہے اور دوسرے دن میں معروف ہوں، تیسرے دن وہ خود کہیں نہیں جا سکتے اور چوتھے روز مرزا صاحب کی میٹنگ ہے..... چار دن تمام!

"پاکی باسٹرڈ"

پچھلے دنوں اخباروں میں چھوٹی چھوٹی دو خبریں تھیں۔

ایک تو یہ تھی کہ کوئی شخص ایک طویل مدت کے بعد ممالک غیر سے پاکستان آیا اور خاص طور پر عید منانے کے لیے آیا اور جونہی وہ ائیرپورٹ پہ اترا اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ اور ایک اور خبر تھی کہ ایک کرکٹ میچ کے دوران انگلستان کی کاؤنٹی ورسسٹرشائر کے تماشائیوں نے عمران خان اور پاکستانی نژاد برطانوی شہری ریحان علی خاں پر آوازے کسے اور انہیں گالیاں دیں۔ عمران خان نے ریحان علی خاں کو گالیاں دینے کے واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ مجھ سے زیادہ اس واقعہ کا دکھ ریحان علی خاں کو ہوا ہو گا کیونکہ اس کے والدین تو پاکستان سے آئے تھے لیکن وہ خود انگلستان میں ہی پیدا ہوا تھا۔

شاید عمران خان یہ کہنا چاہتے تھے کہ بھائی ہم تو ہوئے ہی پاکستانی اور کالے (اگرچہ الگ بات ہے کہ عمران بیشتر گوروں سے زیادہ گورے ہیں) لیکن ریحان بے چارہ تو یہیں پیدا ہوا۔ اس کے پاس برطانوی شہریت ہے۔ وہ اپنے آپ کو برطانوی کہتا ہے۔ اس بے چارے کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی ہو گی کہ یہ تماشائی مجھے کیوں گالیاں دے رہے ہیں۔ میں تو ان کا ہم وطن ہوں . . . . . میں یہ کالم ریحان علی خان ایسے لوگوں کے لیے لکھ رہا ہوں جو یہ نہیں جانتے کہ انگریز ان کو کیوں گالیاں دیتے ہیں اور یہ کالم ان کے لیے بھی ہے جو ایک طویل مدت تک اپنے ملک سے جدا رہتے ہیں اور اس کی جانب آتے ہیں تو ائیرپورٹ پر ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی مٹی کے قریب پہنچ کر مٹی ہو جاتے ہیں۔

انگلستان میں خاص طور پر لاکھوں پاکستانی آباد ہیں اور بہت عرصے سے آباد ہیں۔ ان میں سے بیشتر کی اولاد انگلستان کی "جم پل" ہے۔ انہوں نے پاکستان کو تصویروں، فلموں، اپنے بزرگوں کی باتوں میں

دیکھا ہے۔ اور شاید کبھی ایک مرتبہ کسی مختصر ہالیڈے میں یہاں آئے اور "اوہ یہ کتنا گندہ ملک ہے۔ اور ڈیڈی ہم تو یہاں نہیں رہ سکتے" کہہ کر واپس چلے گئے۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ انسان ایک ایسا جانور ہے جو اپنے آپ کو اپنے آس پاس کے مطابق ڈھال لیتا ہے اور پھر اسے اس ماحول کی اتنی عادت ہو جاتی ہے کہ وہ کہیں اور جا کر رہائش پذیر ہونے میں دقت محسوس کرتا ہے۔ ہمارے ایک دوست کا کہنا ہے کہ وہ پاکستان میں تعمیر شدہ ایک ایسے عالی شان محل میں گئے جو عرب بھائیوں نے اپنے شکار کے خیمے کے متبادل کے طور پہ بنوایا تھا۔ اس میں لاکھوں کروڑوں کے عالی شان فانوس ہیں اور سنگ مرمر کا یہ محل مرکزی طور پر ائیرکنڈیشنڈ ہے۔ ایک صبح انہوں نے یہ دیکھا کہ عرب بھائی چوری چھپے باہر نکلتے ہیں اور ریت کے ٹیلوں پر لوٹیاں لے کر اور کچھ دیر سستا کر پھر اندر چلے جاتے ہیں۔ یعنی وہ اس شاندار محل میں آرام محسوس نہیں کرتے بلکہ ریت پر لیٹنے میں ان کو راحت ملتی ہے۔

چنانچہ ایسے نوجوان جو انگلستان میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے ذہنی طور پہ بالکل انگریز ہیں اور یہ قابل فہم ہے کیونکہ جس ماحول میں وہ آنکھیں کھولیں گے اسی کو اپنائیں گے۔ یہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مکمل طور پر انگریز محسوس کرتے ہیں اور صرف اس وقت انہیں تھوڑا سا "شاک" ہوتا ہے۔ جب وہ آئینہ دیکھتے ہیں کہ ہم تو اتنے گورے نہیں، ورنہ وہ اس فرق کو بالکل محسوس نہیں کرتے۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ ان کے ساتھ وہی کچھ ہونے لگتا ہے جو ریحان علی خاں کے ساتھ ہوا۔

بے شمار پاکستانی نژاد لڑکیوں کے ساتھ ہوا ہے . . . . ہر کالی رنگت والے کے ساتھ ہوا ہے۔ بے شک آپ کے دادا جان انگلستان آئے تھے اور شاہی خاندان کے دوستوں میں سے تھے اور وہ شاید انگریز فوج میں بڑے عہدہ پر تھے اور پھر آپ کے والد لندن کے شہر میں تولد ہوئے اور پھر آپ بھی وہیں پیدا ہوئے اور آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ ہندوستان پاکستان کدھر کو جانا لگتا ہے لیکن اس کے باوجود آپ کبھی بھی برطانوی نہیں بن سکتے۔

بے شک سوائے انگریزی کے آپ کوئی اور زبان نہ بولیں اور آکسفورڈ سے انگریزی ادب کی ڈگری حاصل کریں، آپ "پاکی باسٹرڈ" ہی رہیں گے۔ میں پچھلے زمانوں میں انگلستان جایا کرتا تھا۔ ابھی نسلی منافرت

نے جڑیں نہیں پکڑی تھیں۔ اس کے باوجود ہم ان کے لیے ایک عجوبہ تھے۔ ہم ذرا سی عقلمندی کی بات کرتے تو وہ حیران رہ جاتے کہ اچھا پاکستانی ہو کر بھی اتنے عقلمند ہو۔ اگر ہم انگریزی کا کوئی اچھا فقرہ بولتے تو بہت داد ملتی کہ ویل ڈن۔ آپ نے صرف ایک دو سال یہاں رہ کر اتنی اچھی انگریزی سیکھ لی۔ اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ مائی باپ ایک دو سال نہیں ہم تو سینکڑوں برسوں سے انگریزی سیکھ رہے ہیں۔ جب ہم پیدا ہوتے ہیں تو "ہیلو مم" اور "میں بیٹھ جاؤں پاپا" کہنا شروع کر دیتے ہیں اور "ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل سٹار" گاتے ہیں اور پھر ساری عمر درست گرامر اور درست تلفظ پر قربان کر دیتے ہیں۔ ہم شیلے پر کو شیکسپیر کے ہم وطنوں سے زیادہ جانتے ہیں اور اس کے باوجود وہ ہمیں ان پڑھ ہی سمجھتے ہیں۔ ..... کئی جاننے والے ہیں جو انگریزی میں شاعری کرتے ہیں کہانیاں لکھتے ہیں اور بہت اچھا لکھتے ہیں اور میں ہمیشہ ان کی خدمت میں گزارش کرتا ہوں کہ بھائی میرے اگر انگریزی زبان میں لکھنے والے ادیبوں کی ایک فہرست تیار کی جائے تو اس میں دس ہزار نام ہوں تو اس میں آپ کا نام نہیں آسکے گا ..... اپنی زبانوں میں لکھیے۔ یہاں تو سو دو سو کی فہرست بنی تو آپ اس میں ہوں گے۔ ہم لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ہم غیر ملکیوں کی فہرست میں کبھی نہیں آئیں گے صرف اپنی فہرستوں میں ہی نام پائیں گے۔

ریحان علی خان کو اسی لیے بہت دکھ ہوا ہو گا کہ اس کے خیال میں وہ برطانوی تھا اتنا ہی برطانوی جتنا کہ ایک عام انگریز۔ شاید اس سے بہتر کہ وہ پڑھا لکھا تھا۔ شکل میں بھی بہتر تھا اور ظاہر ہے کاؤنٹی کرکٹ کھیلتا تھا اور ایک معروف کھلاڑی تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے گالیاں دی گئیں ..... اور مجھے معلوم ہے کہ وہ گالیاں کیا ہوں گی ..... یہی کہ کالے لوگو اپنے وطن واپس جاؤ ..... پاکی باسٹرڈز وغیرہ وغیرہ ..... تو ریحان نے سوچا ہو گا کہ میں تو یہاں کا رہنے والا ہوں۔ لیکن ریحان صاحب آپ وہاں کے رہنے والے نہیں ہیں ..... آپ اپنی تمام تر قابلیت اور خوش شکلی اور برطانوی شہرت کے باوجود کسی نالی میں گرے ہوئے شراب میں دھت ان پڑھ اور احمق انگریز کی ایک انگلی کے برابر نہیں ہو سکتے۔ یہ تو اپنا وطن ہے۔ اس کی مٹی ہے اس کی دھول ہے جو انسان کو عزت دیتی ہے۔ اسے سب کے برابر

بناتی ہے۔ ایک حوالہ ہے ایک پہچان ہے جس کے بغیر آپ کو گالیاں پڑتی ہیں۔

شام میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ کوئی پچاس برس پہلے پنجاب سے ادھر گئے۔ کسی عرب دوشیزہ پر مر مٹے، اور وہیں کے اور اسی کے ہو رہے۔ جب میری ملاقات ہوئی تو ان کے درجنوں پوتے پوتیاں اور ظاہر ہے اس سے پہلے بیٹے بیٹیاں تھے۔ جس محلے میں رہتے ہیں وہاں انہیں سب لوگ "ہندی" کہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی اپنی اولاد انہیں "ہندی" کہتی ہے۔ وہ اردو وغیرہ تقریباً بھول چکے ہیں۔ پچاس برس میں ایک دو مرتبہ گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہندی ہیں ..... پہچان تبدیل نہیں ہوتی۔ آپ تبدیل ہو جائیں لیکن آپ کا حوالہ ایک ہی رہتا ہے اور وہ ہے آپ کا وطن ..... مجھے افسوس ہے کہ عمران خان اور ریحان کو گالیاں دی گئیں صرف ان کی نسل کے مختلف ہونے کی وجہ سے ..... لیکن میں تھوڑا سا خوش بھی ہوں کہ ریحان جیسے نوجوان کو یاد رہے گا کہ ان کی نسل کیا ہے۔ ان کا اصل وطن کون سا ہے اور اس کی روایات کیا ہیں ..... یہ وطن جیسا بھی ہے یہاں پر تمام تر خرابیوں کے باوجود کوئی آپ کو "پاکی باسٹرڈ" کہہ کر نہیں پکارے گا۔

"بازارِ حسن یا بازارِ مجبوری"

کیا "بازارِ حسن" میں شریف لوگ جاتے ہیں؟

ظاہر ہے یہ ایک انتہائی احمقانہ سوال ہے اور تمام شریف لوگ بآوازِ بلند کہیں گے کہ جی ہم تو نہیں جاتے اور یہی مناسب جواب ہے کیونکہ شریف لوگ اسی لیے ایک عرصہ تک شریف رہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ انکار کرتے رہتے ہیں۔ اقرار کر لیں تو شریف کیسے کہلائیں؟

ہر حال میں چونکہ ایک ادیب ہوں اور بہت زیادہ شریف آدمی نہیں ہوں اس لیے میں اقرار کرتا ہوں کہ میں دو مرتبہ بازارِ حسن کی سیر کر چکا ہوں۔

ایک بار اور پہلی بار میں اپنے والد صاحب کے ہمراہ وہاں گیا تھا۔

لاحول ولا ..... آپ غلط سمجھے ہیں، جناب میرے والد صاحب مجھے خاص طور پر وہاں لے کر نہیں گئے تھے اور نہ ہی اس علاقے میں ان کی آمدورفت تھی۔ دراصل آج کے اقبال پارک اور ان دنوں کے منٹو پارک میں کوئی سیاسی جلسہ تھا اور والد صاحب مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ واضح ہو کہ اس وقت راقم الحروف بچہ تھا اور اتنا بچہ تھا جتنے بچے کو اگر بازارِ حسن سے گزار دیا جائے تو وہ کچھ نہیں کرتا صرف انگوٹھا چوستا رہتا ہے۔ جلسہ پر ہجوم تھا اور جب ختم ہوا تو ہر جانب زندہ دلانِ لاہور ایک دوسرے کو دھکے مار مار کر راستہ بنا رہے تھے۔ اس لیے والد صاحب نے مجھے ان دھکوں سے بچانے کی خاطر سرکلر روڈ کی بجائے گوالمنڈی جانے کے لیے ٹبی کے راستے کو اختیار کیا۔ میں ان کی انگلی پکڑے چل رہا تھا۔ یہاں بھی بہت زیادہ رش تھا اور یہ رش اسی جلسے میں سے لوٹنے والوں کا تھا۔ میں اگرچہ بچہ تھا اور اگرچہ مزاج جو تھا وہ بہت شریفانہ تھا اور عاشقانہ ہرگز نہ تھا۔ اس کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ

ماحول مختلف ہے۔ یہاں کی خوشبو تیز ہے اور ریڈیو نہیں بج رہے۔ لیکن کہیں کہیں سے موسیقی کی آواز آ رہی ہے۔ یہاں گھومنے والے لوگ مختلف ہیں اور بالکونیوں میں براجمان "خواتین" بھی قدرے شوخ لگ رہی ہیں۔ جب میں نے قدرے پرشوق انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا تو والد صاحب نے صرف ایک فقرہ کہا "بیٹے یہاں اچھے لوگ کبھی نہیں آتے"۔ یہ فقرہ ہمیشہ میرے ساتھ رہا۔ یوں تو میری سمجھ میں بالکل نہ آیا کہ اچھے لوگ یہاں کیوں نہیں آتے۔ کیونکہ اچھا بھلا خوشبودار علاقہ تھا لیکن میں سر جھکا کر چلتا رہا اور ہم تھوڑی ہی دیر میں اس علاقے سے نکل کر مسجد وزیر خاں کی جانب چلے گئے۔

اگرچہ زندگی میں بہت خانہ بدوشی کی لیکن شاید یہ اس فقرے کا اثر تھا جو والد صاحب نے بچپن میں وہاں سے گزرتے ہوئے کہا تھا یا میری بزدلی تھی کہ میں اس بازار میں کبھی بھی اپنی مرضی سے نہیں گیا۔ گیا نہیں، مجھے کبھی زبردستی بھی نہیں لے جایا گیا۔ لیکن بچپن کی اس سیر کے بعد میں ایک مرتبہ اور بازارِ حسن گیا۔

اشفاق احمد کی ایک بہت خوب صورت سیریز "ایک محبت سو افسانے" ٹیلی ویژن پر چل رہی تھی چند ڈراموں میں میں نے بھی مرکزی کردار ادا کیا۔ اسی سیریز کا ایک ڈرامہ تھا۔ جس میں فاروق ضمیر مرکزی کردار ادا کر رہے تھے۔ میں ٹیلی ویژن اسٹیشن پہنچا تو معلوم ہوا کہ ڈرامے کے ایک منظر میں فاروق ضمیر کو بازارِ حسن میں دکھایا جانا ہے اور اشفاق صاحب چاہتے ہیں کہ اس میں حقیقت کا رنگ ابھر آئے اور حقیقت ظاہر ہے وہاں تھی جہاں گھنگرو چھنک رہے تھے۔ چنانچہ ہمیں بھی "مجبوراً" "صرف ڈرامے" کی خاطر پورے یونٹ کے ساتھ اُدھر کا رخ کرنا پڑا۔ جہاں کے بارے میں والد صاحب قبلہ نے فرمایا تھا کہ وہاں شریف آدمی نہیں جاتے۔

شام کا وقت تھا اور ابھی سُر ملائے جا رہے تھے اور پردے کھینچے جا رہے تھے اور تیز خوشبوئیں ابھی کوٹھوں اور کمروں میں تھیں بازار میں نہیں پھیلی تھیں۔ ٹیلی ویژن کے کیمرہ مین نے اپنے زاویے تلاش کیے اور پروڈیوسر نے فاروق ضمیر کو ہدایات دیں کہ آپ اس طرح یہاں داخل ہوں گے۔ آپ بے حد پریشان ہیں اس لیے آپ کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ مونچھیں پھڑک رہی ہیں وغیرہ وغیرہ اور یوں اِدھر اُدھر

دیکھئے آپ ایک کوٹھے کی سیڑھیوں میں چلے جاتے ہیں۔ چونکہ ریکارڈنگ میں ابھی کچھ دیر تھی اس لیے ہم نے ذرا ”سائٹ سی اِنگ“ شروع کر دی۔ ہم جہاں سے بھی گزرتے وہاں سے نہایت عزت [illegible] سنائی دیتے۔ مثلاً ”آیئے آیئے نازش صاحب۔ کبھی ہمارے ہاں بھی تشریف لائیں۔“

”جناب آج آ ہی گئے ہیں تو ادھر بھی آجایئے۔“

”اوہو آپ ذرا جلدی آ گئے۔ یہاں تو ابھی دری جھاڑ رہے ہیں۔“

”بات سُنیں، آپ مجھے پہچانتے نہیں؟ میں نے آپ کے ساتھ فلاں ڈرامے میں کام کیا تھا۔“

دراصل بازارِ حسن کے مکین مجھے اپنا ہی سمجھ رہے تھے کیونکہ میں بھی ٹیلی ویژن پر کام کرتا تھا اور ان میں سے بیشتر کا چہرہ ٹیلی ویژن سکرین کی زینت بنتا تھا۔ بہرحال کچھ شرمندگی بھی ہوئی کہ کس برادری میں شامل کر رہے ہیں۔ لیکن ایک حقیقت بہرطور بیان کروں گا کہ جن لوگوں نے بلایا یا تسلیمیں روانہ کیں تو وہ سراسر خلوص کے پیکر تھے۔ کیونکہ میں بہرطور ”گاہک“ نہ تھا۔ اور مجھ سے کسی فائدے کی امید کے بغیر وہ مجھے مدعو کر رہے تھے اور میرے انکار پر تسلیمیں بھجوا رہے تھے کہ ”وہ بی بی جی نیلے سوٹ والی نے آپ کے لیے بھیجی ہیں۔“

اگرچہ ہم وہاں ایک سرکاری کام کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں چھاپہ نہ پڑ جائے..... تو یہ کل دو ملاقاتیں ہیں میری اور بازارِ حسن کی گذشتہ چالیس برسوں کے دوران..... میں نے جو کچھ وہاں دیکھا اسے پتہ نہیں کون لوگ بازارِ حسن کہتے ہیں، مجھے تو وہ بازارِ مجبوری لگا۔

”ہم پاکستان کے یار ہیں“

”پرقان بھائی.....“

”میں نے کہا پرقان بھائی..... بھئی میں ہوں تمہارا فرقان بھائی..... کیا چپ کا روزہ رکھے ہوئے ہو جو بولتے ہی نہیں اور کیا ہر شے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہو۔ کیا اس سے پیشتر پھول، درخت، بہاریں اور کھیت نہیں دیکھے جو انہیں اتنے غور سے دیکھ رہے ہو..... یار بات تو کرو..... کچھ کہو تو سہی کہ کیا ہوا..... کیا تم ہمارے یار نہیں ہو.....؟“

”میں تو پاکستان کا یار ہوں فرقان بھائی.....“

”شکر ہے تم بولے..... لب کھولے..... لیکن ہوا کیا؟“

”دیکھو ان پھولوں کے رنگ دیکھو..... اتنے چمکیلے اور اتنے شوخ اور اتنے آسمانی رنگ کس دیس میں ہوں گے..... اور فرقان ان درختوں کو تو ایک نظر دیکھو یہ کتنے قدیم اور کتنے مقدس ہیں۔ ان کی چھاؤں میں ہمارے بزرگ بیٹھتے تھے اور پھر ان کے بزرگ..... ہزاروں سال سے یہ ہم پر سایہ کئے ہوئے ہیں..... اور ان میں کیسے کیسے خوش آواز پرندے بسیرا کرتے ہیں۔ ان کے نغمے کتنے سُریلے ہیں.....؟“

”پرقان بھائی کیا بات ہے شاعری کا شوق چرایا..... تم آج ہر شے کی تعریف کرنے پر کیوں تُلے ہوئے ہو.....؟“

”یہ سب کچھ ہے ہی تعریف کے قابل..... کیا دنیا کے کسی ملک میں اتنے سرسبز

کھیت ہیں؟"

"ہوں بھی تو ہمیں کیا..... لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایسے سرسبز اور پُر بہار کھیت میں نے پوری دنیا میں نہیں دیکھے..."

"تم یہ بتاؤ کہ کیا پاکستان میں کوئی ایک شخص ایسا ہوگا جو ان پھولوں اور درختوں اور کھیتوں کی ہمیشہ کے لئے تباہی کی خواہش کرے....؟"

"توبہ کرو..... کیا بات کرتے ہو..... پاکستان کے باہر ہو تو ہو پاکستان کے اندر تو ایسا کوئی شخص نہیں ہو سکتا۔"

"تم یہ بتاؤ کہ گھریلو اختلافات کو بنیاد بنا کر کیا کبھی گھر کی تباہی کے نعرے لگانے چاہئیں؟"

"تو کیا بات کرتے ہو..... گھر تو بنیاد ہوتی ہے اس میں رہتے ہوئے اختلافات تو جنم لیتے ہیں..... یہی کہ اس کی ڈیکوریشن کیسی ہو، لان میں کون سے پھول لگائیں اور وہ کس رنگ کے ہوں..... اس میں اختیار کس کے پاس ہو یا یہ کہ گھر چلانے کے طریقے سے بھی اختلاف ہو سکتا ہے لیکن گھر سے تو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر گھر نہ ہو تو ڈیکوریشن کہاں ہوگی اور پھول کہاں لگیں گے؟"

"فرقان گھر اور گھوڑے میں بھی کچھ چیزیں مشترک ہوتی ہیں۔"

"گھر اور گھوڑے میں؟"

"ہاں..... گھوڑا ہمیں منزل تک لے جاتا ہے۔ صحرا اور جنگل عبور کرواتا ہے.....اب اگر ہم اس بات پر دنگا فساد شروع کر دیں کہ اس گھوڑے پر کون سے رنگ کی اور کون سے ڈیزائن کی کاٹھی ڈالنی ہے اور اس دوران گھوڑے کی خوراک کا خیال نہ رکھیں تو پھر کیا ہوگا فرقان بھائی؟"

"گھوڑا کمزور ہو جائے گا۔"

"اور اس کے بعد؟"

"گھوڑا مزید کمزور ہو جائے گا۔"

"اور اگر ہم اس کے باوجود آپس میں لڑتے جھگڑتے رہیں کہ گھوڑے پر ہم اس رنگ اور اس ڈیزائن کی کاٹھی ڈالیں گے اور اس کو خوراک نہ کھلائیں تو بالآخر کیا ہوگا؟"

"ظاہر ہے گھوڑا بے چارہ مر جائے گا۔"

"اور پھر وہ کاٹھی کہاں ڈالی جائے گی؟"

"کہیں بھی نہیں۔ کیونکہ گھوڑا ہوگا تو کاٹھی ڈالی جائے گی ناں۔"

"اللہ تمہارا بھلا کرے..... گھر کا بھی یہی حساب ہے۔ آپ اگر گھر کا خیال نہیں رکھیں گے تو....."

لیکن یار تم آج اتنے سنجیدہ موضوع پر کیسے گفتگو کر رہے ہو....."

بس آج میرا دل بہت دکھی ہے..... پہلے پہل غصہ بھی آیا لیکن اب میرے اندر صرف دکھ ہے..... تم نے بھی سنا ہوگا کہ ایک صاحب کی ایک شہر میں آمد کے موقع پر یہ نعرے لگائے گئے کہ توڑ دو پاکستان توڑ دو..... اور جو پاکستان کا یار ہے غدار ہے....

"ہاں میں نے اخباروں میں پڑھا تو ہے لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ ایسے نعرے بھی لگ سکتے ہیں۔"

"ہاں! اور اس جلسے کے منتظمین نے بھی فوراً تردید کی ہے کہ یہ نعرے ہم نے ہرگز ہرگز نہیں لگائے۔"

"تو پھر کس نے لگائے..... کسی نے تو لگائے..... شاید چند لوگوں نے شرارت کی..... مذاق کیا..... شاید کسی ایک شخص نے ایسا کیا....."

"نہ یہ شرارت اچھی اور نہ ایسا مذاق۔"

"بہر طور مجھے دکھ اسی بات کا ہے کہ نعرے لگے چاہے ایک شخص نے لگائے یا چند افراد نے۔"

"کیا خیال ہے ان افراد کے بارے میں...... ان سے پوچھنا چاہیئے۔ انہیں سزا ملنی چاہیئے۔"

"میرا خیال ہے اگر ان لوگوں کو کچھ شکائتیں ہیں تو وہ عوام بتائیں...... اگر حکومت سے اختلاف ہے تو بے شک اٹھیں۔ آزادی ہے کہ وہ حکومت کے بارے میں جو مرضی کہیں لیکن اس پاکستان کے بارے میں...... نہیں جناب یہ میرا گھر ہے...... میں اسے ٹوٹنے نہیں دوں گا"

"تم خواہ مخواہ جذباتی ہو رہے ہو......"

"خواہ مخواہ تو نہیں فرقان بھائی...... میرے پاس جذباتی ہونے کی بنیاد موجود ہے۔ میں نے ہمسایہ ممالک بھی دیکھ رکھے ہیں اور مجھے پتہ ہے کہ قدرت کی جو نعمتیں اور جو خوبصورتیاں اس ملک میں ہیں وہ وہاں خواب میں بھی میسر نہیں...... ہندوستان کے باشندے جب ہمارے ہاں آتے ہیں تو اپنی روائتی پاکستان دشمنی کے باوجود پاکستان کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس ملک کے صدر مقام میں اگر کوئی پاکستانی جاتا ہے تو دور سے پہچانا جاتا ہے۔ رنگ و اس کا رنگ روپ نکھرا ہوتا ہے۔ اس کی صحت بہتر ہوتی ہے۔ اس کا لباس صاف ستھرا ہوتا ہے اور وہ سر اٹھا کر چلتا ہے...... سیاسی اور حکومتی ڈھانچوں کے حوالے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ یوں آپ پاکستان کی تاریخ دیکھئے تو یہاں مختلف نظام سلطنت نافذ رہے۔ کبھی صدارتی اور کبھی پارلیمانی۔ چنانچہ یہ اختلاف کا حق تو ہر ایک کو حاصل ہے......"

"تو پھر ان نعرہ بازوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیئے؟"

"اول تو ایسے نعرہ باز موجود ہی نہیں۔ یہ صرف چند افراد کی شرارت ہے۔ جو قوم دشمن شرارت ہے اور اگر خدانخواستہ ایسے چند افراد موجود ہیں تو ان کو چاہیئے کہ وہ سامنے آئیں اور ہم سچے بھائیوں کی طرح ان کی بات سنیں گے۔ وہ ہمیں بتائیں تو سہی کہ انہیں یہ نعرہ لگانے کی ضرورت کیوں

پیش آئی۔ انہیں کیا تکلیف ہے؟ ان کے ساتھ کیا زیادتی ہوئی ہے......؟ ہم ان کی تکلیف دور کریں اور زیادتی کا ازالہ کریں......"

"اور اس نعرے سے جو ہمیں دکھ ہوا ہے اس کا کیا کریں؟"

"نعرے کا جواب تو نعرہ ہی ہو سکتا ہے۔"

"کون سا نعرہ؟"

"یہی کہ...... جی ہاں بالکل درست ہم قبول کرتے ہیں کہ......

ہم پاکستان کے یار ہیں......

یار ہیں۔"

"مائی پھیرے باز"

جب آپ سفر پر نکلتے ہیں تو ایک نئی دنیا میں داخل ہوتے ہیں۔ دراصل دنیا تو وہی ہوتی ہے لیکن وہاں کی زبان، موسم، خوراک اور لوگ مختلف ہو جاتے ہیں اور یوں وہ سب نئے لگتے ہیں...... سفر کی تصویر بے شمار مختلف رنگوں میں بنتی ہے۔ ناکامیاں، مشکلات، اداسیاں، مسرتیں، کامیابیاں یہ سب اس میں رنگ بھرتے ہیں۔ لیکن سب سے اہم رنگ سفر کی تصویر کا...... لوگ ہیں، عوام ہیں، وہ کردار ہیں جو اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی زمین پر سرگرداں ملتے ہیں۔ آپ گھر آ کر ان کرداروں کو یاد کرتے ہیں تو گویا انہی یادوں میں سفر کرنے لگتے ہیں جہاں اُن سے ملاقات ہوئی تھی اور اگر ان کرداروں میں سے کوئی ایک سچ مچ یہاں پاکستان میں آپ کے شہر میں آپ کے سامنے آ کھڑا ہو تو آپ کیا محسوس کریں گے؟

پچھلے برسوں میں دو تین مرتبہ ایسا ہوا کہ سفر کے دوران ملنے والا کوئی نہ کوئی شخص مجھے تلاش کرتا ہوا مجھ تک پہنچ گیا اور جب میں پہچان نہ سکا تو اس نے اپنا تعارف کچھ اس طرح کروایا۔ "یاد ہے جب تم ایران یا ترکی میں فلاں شہر میں گھوم رہے تھے اور ملاقات ہوئی تھی؟"

پچھلے برس ایک ایسا نوجوان میرے پاس پہنچ گیا جس نے دس برس قبل سوئٹزرلینڈ میں مجھے اپنی کار پر لفٹ دی تھی اور ہم دونوں نے پورا دن اس "مختصر جنت" میں سفر کرتے ہوئے گزارا تھا۔ اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ دراصل کراچی سے پشاور جا رہا تھا اور سفر کے دوران کچھ پاکستانی مسافروں کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے اس نے میرا نام لیا۔

حسن اتفاق یہ کہ وہ مجھے جانتے تھے۔ انہوں نے اُسے بتایا کہ میں لاہور میں ہوتا ہوں چنانچہ وہ دونوں یہیں اُتر گئے اور پھر ٹیلیویژن سٹیشن سے میرا پتہ حاصل کر کے مجھ تک پہنچ گئے۔ مجھے دس برس قبل کا وہ سوئس لڑکا یاد نہ تھا۔ لیکن جب اس نے تعارف کروایا تو پھر آہستہ آہستہ اس کا چہرہ آشنا ہوتا گیا۔ میں نے اپنا سفرنامہ "خانہ بدوش" نکال کر اسے وہ دو تین صفحے سنائے جو میں نے اس کے بارے میں لکھے تھے۔ ظاہر ہے میں اس سے مل کر بہت خوش ہوا...... "خانہ بدوش" کا ہی ایک اور کردار کل میرے پاس آ گیا۔

یہ مائی پھیرے باز تھی۔

مائی پھیرے باز جو "مسافر خانہ نادر" امیر کبیر سٹریٹ تہران میں ملی تھی اور دس برس پہلے ملی تھی۔ انتہائی مدبر اور بارعب خاتون جس کے سر کے بال برف سفید تھے۔ جو پورے روزے رکھتی تھی۔ ہر سال حج کرتی تھی۔ نماز قضا نہ کرتی تھی اور ایک ملک سے مال خرید کر دوسرے ملک میں جا بیچتی تھی۔ یعنی سمگلنگ کرتی تھی لیکن تہہ دل سے اس بات پر یقین رکھتی تھی کہ یہ نیک کاروبار ہے۔ ترکی سے کچھ خریدا اور عراق میں جا دکان لگا لی۔ ہر بڑے شہر میں وہ ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرتی، گاہکوں کو فون کر دیتی اور وہ ہوٹل ہی میں آ کے مائی سے مال لے جاتے۔ اور سال بھی۔ اس کے بیٹے بھی یہی کام کرتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ بڑی اماں اب کاروبار چھوڑ کر اللہ اللہ کریں۔ لیکن وہ کہتی تھی کہ میں اپنی روزی خود کماؤں گی۔ تہران میں اس مائی نے مجھے مزیدار سریاں کھلائیں اور پھر دمشق اور استنبول میں رہائش کے سستے ٹھکانوں کے پتے بتائے۔ مائی پھیرے باز "خانہ بدوش" کا ایک کردار تھی۔

دس برس بعد کل وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ کھڑی تو نہ تھی۔ کوشش میں تھی کہ کھڑی رہے۔ اس کے سر کے بال سفید تو پہلے ہی تھے لیکن اب وہ کم ہو چکے تھے۔ عینک کے شیشے بھی دبیز ہو چکے تھے اور اس کے ہاتھ میں رعشہ تھا۔ میں ظاہر ہے اُسے پہچان نہ پایا۔ اس نے کھڑے ہو کر مجھے دیکھا اور آگے بڑھ کر میرے سر پر پیار دیا۔ میں نے سمجھا

شاید کوئی دور کی رشتہ دار خاتون ہے جسے میں پہچان نہیں رہا لیکن ایک احساس ہے کہ یہ چہرہ دیکھا ہوا تھا۔

"مائی پھیرے باز؟" میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"پتر تم تو خاصے بزرگ ہوگئے ہو۔" وہ مسکرا کر کہنے لگی "پتہ ہے میں کون ہوں؟" میں نے انکار میں سر ہلایا لیکن مسکراتے ہوئے اُسے بیٹھنے کے لئے کہا۔

"میں آگئی ہوں واپس اپنے مکان میں۔۔۔۔ یاد نہیں مجھے تم تہران میں ملے تھے مسافر خانہ نادری میں۔۔۔۔"

"ختم ہوگئی پھیرے بازی پتر۔۔۔۔ پر تو سنا بال بچے راضی بازی؟ دو بیٹے ہیں ناں تمہارے؟ تم نے اپنے بٹوے میں تصویریں رکھی ہوئی تھیں۔"

"اب ایک بیٹی بھی ہے۔" میں نے کہا۔ میں کچھ نروس ہو رہا تھا کہ میں اس مائی کے ساتھ کس قسم کی گفتگو کروں اور ہاں میں خوش بھی ہوا کہ میرا سفر زندہ ہو رہا تھا۔۔۔ "اور آپ کے بیٹوں کا کیا حال ہے؟"

"وہ بھی راضی بازی ہیں خیر سے۔۔۔۔ مال، دولت، عزت سب کچھ ان کے پاس ہے۔ اب ذرا کسٹم والے زیادہ تنگ کرتے ہیں لیکن وہ نکل جاتے ہیں۔ ایران میں تو مولوی خمینی آگیا تو وہاں تو کاروبار بند ہوگیا ہے۔۔۔۔"

"آپ پاکستان کیسے آئیں؟"

"بس پتر۔۔۔۔ حج کر لئے، کھا کما لیا، اب بیٹے کام نہیں کرنے دیتے۔ انہوں نے بغداد سے جہاز پر بٹھا دیا اور جہازوں پر تو میری عمر گزری ہے۔ سبھی لوگ بڑا دید لحاظ کرتے ہیں میرا۔۔۔۔ کراچی سے لاہور کا جہاز لیا۔۔۔۔ یہاں لاہور میں میری ایک بہن ہوا کرتی تھی خالہ زاد۔۔۔۔ میں نے سوچا ایک دو دن اُس کے پاس رہوں۔۔۔۔ لو پتر میں وہاں پہنچی شاد باغ کے پاس تو پتہ چلا کہ بہن کو مرے ہوئے تو پانچ سال ہوچکے۔ بچے اس کے مجھے پہچانتے نہیں تھے اور نہ جانتے تھے کہ میں کون ہوں۔ ان کا بھی قصور نہیں، میں بھی بری

ہوگئے مجھے وطن سے نکلے ہوئے کبھی دوبارہ آئی نہیں۔ پیسے جو میرے پاس تھے۔۔۔ شاد باغ سے نکلی ہوں اور جانے لگی ریلوے اسٹیشن پشاور کی گاڑی پکڑنے کے لئے تو ایک دم تمہارا خیال آیا کہ تم بھی لاہور میں رہتے ہو۔ میں نے سوچا پتہ کرتی جاؤں کہ پتر ٹھیک ہے خیر خیریت سے ہے۔۔۔۔ کتنے سال ہوگئے جب تم تہران آئے تھے؟"

"تقریباً دس سال ہوگئے۔"

"بزرگ ہوگئے ہو۔" وہ پھر مسکرائی۔ "تب تو واہ واہ بال سے تھے، نوجوان۔"

"ہاں جی۔۔۔۔ دس سال بہت ہوتے ہیں۔ تب بھی میں بال تو نہیں تھا لیکن۔۔۔۔"

"تم گئے تھے دمشق؟ اور پھر اس سے اگلے روز وہ ہوٹل فروخت ہوگیا اور وہاں پر نئی مارکیٹ تعمیر ہونی تھی جو اب ہوچکی ہے۔۔۔۔"

"ہاں اور اس خندق کے کمرے ایسے تھے کہ دیواروں پر کھٹملوں کا وال پیپر تھا جو چلتا تھا۔۔۔۔"

مائی پھیرے باز ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ میں نے چائے کا پوچھا تو اس نے انکار کر دیا، کھانے کے لئے کہا تو کہنے لگی کہ کھا کے آئی ہوں۔۔۔۔ میں نے کہا آپ گھر چلیں اور کم از کم ایک دو روز تو میرے پاس رہیں لیکن وہ مسکراتی رہیں اور انکار میں سر ہلاتی رہیں۔۔۔۔

"آپ پکی پکی پاکستان آگئی ہیں یا واپس جائیں گی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں پتر آ ہی گئی ہوں۔۔۔۔ آئی بھی ہوں اور پوتے نے بھی بھیج دیا ہے۔۔۔۔"

"پشاور میں آپ کا گھر تو ہوگا؟"

"وہاں گھر ہوتا تو وطن چھوڑتے۔۔۔۔" وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ "وطن چھوڑا تو دس سال گزر گئے اب جاؤں گی اپنے محلے۔ وہاں کوئی مکان کرائے پر لے کر باقی زندگی گزاروں گی۔"

"آپ کا کوئی رشتہ دار یا عزیز تو ہوگا وہاں؟"

"نہ نہ کوئی نہیں..... بس میرے دونوں بیٹے ہیں اور وہ عراق میں ہیں....."

"آپ وہاں بالکل اکیلی رہیں گی؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"پتر میں ساری عمر اکیلی ہی رہی ہوں..... اب نہیں۔ چار سال خاوند زندہ رہا اور پھر میں اور میرے بیٹے نکل گئے..... استنبول، جرمنی، تہران، بغداد، دمشق، میں نے بیس برس ان شہروں میں پھیرے لگاتے گزار دیئے۔ سارے سفارت خانوں والے میرا احترام کرتے تھے اور ہم ان کو ان کا حق جو دیتے تھے۔ ایئرپورٹوں پر مجال ہے کسی کسٹم والے نے مائی کے سامان کو ہاتھ لگایا ہو۔"

"ظاہر ہے اب آپ کی عمر نہیں رہی یوں بین الاقوامی کاروبار کرنے کی..... اسی لیے وطن واپس آگئی ہیں۔"

"نہیں۔" مائی نے سر ہلایا۔ "نہیں بات یہ نہیں ہے۔"

"سفر کرنے کے لیے ہمت چاہیئے۔ مجھ میں کم ہو گئی ہے تو آپ بھی....."

"میں ابھی بالکل ٹھیک ہوں پتر..... پانچ چھ بڑے سوٹ کیس دے دو میں اب بھی اسی طرح سفر کر سکتی ہوں اور سامان بیچ سکتی ہوں..... تہران سے لے کر استنبول تک کون نہیں جانتا کہ مائی پھیرے باز نے آج تک کسی کے ساتھ دھوکا نہیں کیا۔ جو مال کسی نے مانگا لا کر دیا اور مناسب قیمت پر....."

"آپ بے شک بڑی باہمت ہیں..... تو پھر آپ نے کاروبار کیوں چھوڑ دیا؟"

"تم میرے ایک سوال کا جواب دو پتر..... ایک ملک سے مال خریدنا اور پھر دوسرے ملک میں جا کر فروخت کر دینا..... کوئی بری بات ہے؟"

"نہیں..... شاید نہیں۔"

"میں تو کسٹم والوں کو ان کا حق دیتی تھی۔ ویزا لگوانا ہوتا تو سفارت خانوں میں بھی

لوگ میرا خیال رکھتے تھے۔ میں سب کے کام کروا لیتی تھی..... لیکن پتر پتہ ہے کیا ہوا میرے ساتھ.....؟" یہاں پہنچ کر مائی نے عینک اتار دی اور آنسوؤں سے بھری ہوئی بوڑھی آنکھوں کو صاف کیا۔ "میرا ایک پوتا ہے ماشاءاللہ چودہ سال کا ہو گیا ہے..... وہ ایک دن کہنے لگا دادی جان آپ سمگلنگ کیوں کرتی ہیں؟ میں تو کانپ گئی۔ میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ نہیں سمجھا کہتا رہا کہ سب لوگ کہتے ہیں کہ تمہارا باپ اور تمہاری دادی سمگلر ہیں..... کسٹم والوں کو رشوت دے کر مال نکال لاتے ہو..... میں نے بہت کہا کہ یہ کاروبار ہے کسی کا حق نہیں مارتے، دھوکا نہیں دیتے۔ پر وہ نہ مانا..... کہنے لگا دادی اماں آپ کو شرم آنی چاہیئے..... پتر مجھے کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ یہ سمگلنگ ہے پر اس روز میرے پوتے نے مجھے شرمندہ کر دیا..... میں نے بیٹوں سے بات کی پر وہ نہیں مانے..... میں نے جہاز پکڑا اور وطن واپس آگئی۔ یہاں سے میں اپنے پوتے کو خط لکھوں گی کہ تمہاری دادی جان اب سمگلنگ نہیں کرتیں..... ٹھیک کیا نا میں نے؟"

"ہاں مائی جی....."

"اب کبھی باہر جانا ہو تو مجھ سے ایڈریس لے کر جانا ہوٹلوں اور خندقوں کے..... مائی پھیرے باز کو کون نہیں جانتا ادھر کے ملکوں میں....."

اس کے ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ اسے ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا تھا اور اس کا جسم زندگی کی مشقت کرتے کرتے کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اسے اب آرام کرنا تھا پشاور کے کسی محلے میں بالکل تنہا..... وہ اٹھی اور لرزتے ہاتھوں سے میرے سر پہ پیار دیا اور لاٹھی ٹیکتی ہوئی چلی گئی۔ مجھے یقین ہے کہ مائی پھیرے باز سے کم از کم یہ ملاقات آخری تھی۔

"گائے گھوڑا، بے کار ہے جی!"

فتح خان آئے تو بہت خوش تھے۔

"مجھے گائے گھوڑا مل گیا ہے۔۔" وہ سرگوشی سے بولے اور مسرت سے مغلوب ہو کر بولے.....

"آپ کا مطلب ہے کہ آپ کو گائے اور گھوڑا مل گیا ہے۔ کیا آپ کا گائے اور گھوڑا گم گئے تھے؟"

"نہیں نہیں..... کیا کہہ رہے ہیں آپ..... میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے آج بہت عرصے کے بعد اور بڑی تلاش کے بعد گائے گھوڑا مل گیا ہے۔"

"مبارک ہو" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ "ایک ایک کر کے ملے ہیں یا دونوں اکٹھے مل گئے ہیں؟"

"ایک نہیں تین مل گئے ہیں" وہ مسکراتے چلے جا رہے تھے۔

"گائے اور گھوڑا دو ہو سکتے ہیں تین کیسے ہو گئے؟"

"آہا" انہوں نے میرے کندھے پر ایک دھپ رسید کی۔ "اب سمجھا۔ آپ کچھ اور سمجھ رہے ہیں۔ حضرت گائے گھوڑا ایک بہت ہی نادر اور پرانے سکے کو کہتے ہیں۔ جس کے ایک جانب گائے بنی ہوتی ہے اور دوسری جانب گھوڑا ہوتا ہے۔"

فتح خان سے میں بہت بیزار تھا۔ بہت نفیس شخص ہیں، دوست ہیں لیکن ہر وقت کوئی نہ کوئی اوٹ پٹانگ شوق پالے رکھتے ہیں اور اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اس شوق کا

..... ان دنوں موصوف کا رخ سکوں کی طرف ہے..... دیر سے بہت جلد کروڑ پتی ہو جائیں گے۔ تقریباً ہر دوسرے دن تشریف لاتے ہیں اور ایک جیب میں سے چند سکے نکال کر میز پر رکھیں گے اور دوسری جیب میں سے ایک عدد محدب عدسہ یعنی میگنی فائنگ گلاس نکال کر کہیں گے: "تو جی ذرا چیک کرو..... ہندو شاہی ہے"

"کیا شاہی ہے؟" میں حیران ہو کر پوچھوں گا۔

"ہندو شاہی سکے ہیں..... جڑانوالہ کے قریب ایک دوست ہیں۔ ان کی نانی جان فوت ہوئیں تو ان کے لئے قبر کھودتے ہوئے ایک ٹھوٹھا نکلا جس میں یہ سکے تھے۔ میرا دوست بھی سکوں کا شوقین ہے۔ اس نے نانی جان کو بعد میں دفن کیا پہلے سکے محفوظ کر لئے..... یہ وہی سکے ہیں۔"

فتح خان اکثر بازار صرافہ میں پائے جاتے ہیں، لاہور کے بڑے ہوٹلوں میں ہینڈی کرافٹ شاپس پر دیکھے جاتے ہیں اور ہر وقت ان کی ایک جیب میں پرانے سکے ہوتے ہیں اور دوسری میں سکے خریدنے کے لئے نئے اور آج کے سکے..... انہوں نے بتایا ہے کہ اس ملک میں سکوں کے بڑے بڑے ماہرین ہیں جو سکے کو ایک نظر دیکھ کر نہ صرف اس کا عہد بلکہ اس کی ٹکسال کا نام تک بتا دیتے ہیں۔ بقول ان کے سب سے زیادہ قیمتی ان بادشاہوں کے عہد کے سکے ہیں جو بن کھلے مرجھا گئے۔ یعنی ادھر تخت پر بیٹھے ادھر اتار دیئے گئے یا مار دیئے گئے۔ ایسے بادشاہوں کی ٹکسال نے سکے ڈھالے تو ادھر بادشاہ سلامت کی ٹرانسفر ہو گئی۔ سکے جمع کرنے والوں کی ایک کوڈ آف ایتھکس ہوتی ہے بغیر نوادرات کی طرح اس میں دھوکے کا امکان کم ہوتا ہے۔ کیونکہ سکے جمع کرنے والا صاف صاف بتا دے گا کہ جناب یہ فلاں سکہ ہے۔ دو سو روپے کا لیا تھا اور آپ سے پانچ سو لوں گا۔

سب سے زیادہ سکے ظاہر ہے مغلیہ دور کے ہیں اور اتنے زیادہ پائے جاتے

ہیں کہ سکہ رائج الوقت لگتے ہیں۔

فتح خان کے ایک دوست ہیں جنہیں ہم مُبین کہہ سکتے ہیں۔ مُبین اسلام آباد میں کوئی کام کرتے ہیں۔ ہر ویک اینڈ پر بائی ایئر لاہور آتے ہیں۔ یہاں کی سکہ مارکیٹ میں گھومتے ہیں۔ دو چار سکے خریدے اور انہیں وہیں بیچ دیا اور کرائے کے علاوہ ہزار دو ہزار منافع کما کر چلے جاتے ہیں۔ اپنا عزیز پتھر بھی یہی کام کیا کرتا تھا اب جانے کس حال میں ہے۔ سکے جمع کرنے والوں میں ایک اور خوبی ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ان میں ذات پات اور سماجی اونچ نیچ کا بالکل اثر نہیں ہوتا۔ سکے جمع کرنے والا چاہے کلرک ہے چاہے جنرل ہے... سر جوڑے بیٹھے ہیں اور گائے گھوڑا، گائے گھوڑا کر رہے ہیں۔ فتح خان کا کہنا ہے کہ لاہور میں چند ایسے افراد ہیں جن کے پاس دنیا کے بہترین سکے ہیں اور ان کی تصاویر سکوں کی بین الاقوامی فہرستوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اگر کسی سکے کی تصویر کسی فہرست میں ہے تو اس کی قیمت بہت لگتی ہے۔

فتح خان صرف سکوں کے شوقین نہیں ہیں بلکہ پرانے ظروف، گندھارا مجسمے، لوٹے اور صراحیاں، تکیوں کے غلاف، چاندی کے زیور وغیرہ میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ بہت سال پہلے ایک روز میرے ہاں آئے اور کوٹ کی جیب میں سے ایک پتھر سا نکال کر میری میز کی گلاس ٹاپ پر زور سے رکھ کر بولے..... "لو جی پونے دو ہزار سال پرانا ہے"..... خان صاحب کی عادت ہے کہ ہر شے کو بڑے زور سے آپ کے سامنے رکھتے ہیں تاکہ آپ ذرا ہوشیار ہو جائیں..... میں نے دیکھا کہ مہاتما بدھ کا ایک چھوٹا سا مجسمہ ہے لیکن مہاتما کا ناک نقشہ کچھ سکندر اعظم سے مل رہا ہے اور یوں بھی ذرا ظریفانہ سی مسکراہٹ لئے ہوئے ہے۔

"یہ ٹھیک نہیں لگتا"، میں نے کہا۔

"سو فیصد ٹھیک ہے جناب عالی! میرے بہنوئی کو دیر کے ایک پٹھان نے دیا

تھا میں سر کٹا دوں گا اگر غلط ہو گا"۔

اس مجسمے کو عجائب گھر والوں سے چیک کرایا گیا۔ معلوم ہوا کہ مہاتما بدھ کا دھڑ تو ٹھیک ہے یعنی پونے دو ہزار سال پرانا ہے لیکن اس کا سر صرف بارہ برس پہلے کا ہے۔

"بے کار ہے یار!" فتح خان مایوس ہو کر بولے: "بے کار ہے۔" ان کا تکیہ کلام ہے اس جعلی مہاتما بدھ نے ان کی دلچسپیوں کا رُخ گندھارا آرٹ کی طرف موڑ دیا۔ چونکہ مجھے بھی اس موضوع سے خاصی دلچسپی ہے۔ اس لئے فتح خان ہر دوسرے روز میرے ہاں چلے آ رہے ہیں اور آ کر نہایت خُفیہ انداز میں کہیں گے: "ایک سر مل گیا ہے بہت سستا"۔

"کس کا سر؟" میں پوچھوں گا۔

"مہاتما بدھ کا اور کس کا!" یہ کہتے ہوئے وہ نہایت رازداری سے جیب میں سے چونے کا بنا ہوا ایک گولا سا سامنے رکھ دیں گے۔

"یہ بت ہے تو اس کی ناک اور کان اور آنکھیں وغیرہ کہاں ہیں؟"

"بس وہ نہیں ہیں باقی بالکل مکمل اور اصلی حالت میں ہے..... ایک دوست نے تحفے میں دیا ہے"۔ ایک روز شدید گرمی میں تشریف لائے اور چادر لپیٹ کر آئے جیسے برف پڑ رہی ہو۔

"کیسی ہے؟"

"کون؟"

"یہ چادر۔ رنجیت سنگھ کے زمانے کی ہے۔ ایک دوست سے کچھ رقم لینی تھی وہ یہ مجھے دے گیا ہے کہ ہزاروں بلکہ لاکھوں کی ہے سنبھال کر رکھو برٹش میوزیم والے خریدیں گے....."

میں نے چادر کو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ مری میں سیزن کے آخر میں جب سیل لگتی ہے تو پچاسی روپے میں بھی ڈیزائن مل جاتا ہے۔

"چڑیا گھر میں رہائش کا مسئلہ"

اکثر اوقات جب آپ کا کوئی عزیز دوست اپنے بچوں کے ہمراہ یا اکیلا چڑیا گھر دیکھنے کے بعد واپس آتا ہے تو آپ پوچھتے ہیں کہ کیوں جناب وہاں کوئی پنجرہ پسند نہیں آیا...... یا چڑیا گھر کی انتظامیہ کو آپ کی آمد کی خبر نہیں ہو سکی جو واپس لوٹ آئے۔ اس پر عزیز دوست عام طور پر مسکراتا ہے اور کہتا ہے کہ نہیں پنجرہ تو خالی تھا لیکن اس پر آنجناب کے نام کی تختی آویزاں تھی، آپ ہو آئیے .... لیکن مستقبل میں شاید اس قسم کی گفتگو نہ ہو سکے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ کے اس سوال کے جواب میں کہ کیوں جناب وہاں کوئی پنجرہ پسند آیا؟ عزیز از جان دوست نہایت متانت سے کہے کہ جی الحمدللہ ایک نہایت ہی نفیس قسم کا آرام دہ پنجرہ مل گیا ہے۔ بس یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے چڑیا گھر میں جگہ مل گئی ورنہ آپ جانتے ہیں کہ ان دنوں لوگ پنجروں کی تلاش میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ مجھے تو جناب آپ مبارک باد دیں۔ وہاں فلش سسٹم کا بھی انتظام ہے...... اور آپ حیران ہو کر پوچھیں گے کہ اے عزیز از جان دوست کیا آپ نے پنجرہ حاصل کرنے کے لئے سفارش کروائی تھی یا چڑیا گھر انتظامیہ میں تمہارا کوئی قریبی عزیز گھوڑوں کا ڈاکٹر لگا ہوا ہے۔ کیونکہ ان دنوں چڑیا گھر میں ایک ذاتی پنجرہ حاصل کرنا تو جان جوکھوں کا کام ہے...... اس پر عزیز از جان دوست آپ کو بتاتا ہے کہ بھائی میرے بجلی پانی کا انتظام ہے۔ صبح سویرے ناشتہ پنجرے میں ہی مل جاتا ہے۔ دوپہر کو بھنا ہوا گوشت جو بہت اعلیٰ قسم کا ہوتا ہے کیونکہ شیر کے لئے بھی اسی گوشت سے لنچ تیار ہوتا ہے اور ایک مرتبہ جب گوشت کی کوالٹی اچھی نہیں تھی تو شیر نے اسے لانے والے ویٹر کو چکھ لیا تھا۔ علاوہ ازیں دن بھر بچے لوگ جو ٹافیاں اور پھل وغیرہ میرے پنجرے میں پھینکتے ہیں وہ بونس ہے...... اور تنخواہ

بھی معقول ہے۔

آپ اس وقت یقیناً یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میں خواہ مخواہ ادھر ادھر کی ہانک رہا ہوں، بھلا مستقبل میں انسان چڑیا گھر کا مکین کیسے ہو جائے گا تو جناب آپ کی خدمت میں عرض ہے کہ امریکہ میں تو ایسا ہو رہا ہے۔ وہاں ایک چڑیا گھر میں دیگر درندوں اور پرندوں کے شانہ بہ شانہ ایک عدد حضرت انسان بھی پنجرے میں رکھے ہوئے ہیں اور اپنی من مرضی سے رکھے ہوئے ہیں۔ کیونکہ انہیں وہاں رہنے کی باقاعدہ تنخواہ ملتی ہے۔ بجلی پانی خوراک وغیرہ مفت ہیں...... وہ بڑے آرام سے صبح اٹھتے ہیں سب کے سامنے ناشتہ کرتے ہیں، سب کے سامنے شیو کرتے ہیں اور نہاتے ہیں اور ان کی یہ حرکتیں دیکھ کر پبلک بے حد خوش ہوتی ہے اور انہیں ٹافیاں اور پھل کھلاتی ہے۔

چنانچہ اگر امریکہ میں ایسا ہو رہا ہے تو پاکستان میں بھی ایسا ہو جائے گا۔ کیونکہ آدھر وڈیو گیمز کا رواج چلتا ہے تو ادھر بھی کروڑوں روپوں کی مشینیں امپورٹ ہو جاتی ہیں۔ آدھر لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہوئے "ہائے" کرتے ہیں تو ہم اپنا سلام بھول کر "ہائے" بلکہ "ہائے ہائے" کرنے لگتے ہیں۔

اس لئے یہ بعید از قیاس نہیں کہ مستقبل میں ہمارے چڑیا گھروں میں حضرت انسان بھی دیکھنے کو ملنے لگیں البتہ ایک قباحت ہوگی اور وہ یہ کہ یورپ اور امریکہ وغیرہ میں چونکہ ہر انسان بے حد پرائیویٹ قسم کی زندگی گزارتا ہے۔ پبلک میں صرف کام کرتا ہے، بس پر چڑھتا ہے خریداری کرتا ہے اور باقی سارے کام لوگوں سے اوجھل ہو کر اپنے گھر کے اندر کرتا ہے اور اس لئے امریکہ کے چڑیا گھر میں رکھا ہوا انسان لوگوں کی دلچسپی کا باعث بنا ہوا ہے کہ وہ سب کے سامنے وہ کام کرتا ہے جو بے حد پرائیویٹ ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص خود شیو کرتا ہے لیکن اس نے شاید کبھی کسی اور کو شیو کرتے نہیں دیکھا اخبار پڑھتے نہیں دیکھا۔

یہ سب کچھ تو ہوا امریکہ میں، اب پاکستان میں معاملہ بالکل الٹ ہے...... وہ دیکھئے اس کھڑکی میں جو شخص بیٹھا ہے اس نے پچھلے دو گھنٹے میں کوئی کام نہیں کیا، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے..... پھر پوچھا جاتا ہے کہ آپ کو کیسے معلوم ہے کہ اس نے پچھلے دو گھنٹے میں کوئی کام نہیں کیا۔ جواب ملتا

حیثیت سے نہیں بلکہ ایک پورے موسم، پوری تہذیب کی حیثیت سے زندہ رہتا ہے۔ میں نے اپنے شہر لاہور سے وعدہ کیا کہ میں دوبارہ آؤں گا۔ لیکن جونہی میں کھلی فضاؤں میں پہنچا، مال روڈ اور گلبرگ دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ توبہ توبہ پرانا شہر تو نرا ڈسٹ بن ہے، وہاں گندگی ہے، بھکاری ہیں، لوگ بدتمیز ہیں، مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔ وہاں مجھ ایسے تہذیب یافتہ ادیب اور دانشور کا کیا کام...... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں کبھی بھی پرانے شہر کا رُخ کروں۔

"عید کرسمس کے نزدیک آ رہی ہے"

اب کے عید عجیب رنگ میں گزری ہے۔

یہ بہت زیادہ دنوں کی بات نہیں ہے جب عید کچھ اور تھی، یہ نہیں تھی جو اب ہے اور میں فیصلہ نہیں کر پایا کہ ان دونوں میں سے کونسی عید اصلی ہے۔ یہ والی جو پچھلے دنوں گزری یا وہ والی جو بہت زیادہ دن تو نہیں ہوئے جب گزری تھی۔

ہوا یہ کہ انتیسویں روزے کی افطاری سے فارغ ہوتے ہی ہم لوگ جلدی سے اپنے گھر کی چھت پر پہنچے..... خیال تھا کہ چاند دیکھیں گے۔ میں نے بچوں کو بتایا کہ دیکھو بچو! عید کا آدھا لطف تو عید کا چاند دیکھنے میں ہوتا ہے اور شاید انہیں یاد بھی تھا کہ ادھر پرانے مکان میں ہم چھت پر پہنچ کر کیا اودھم مچاتے تھے..... کچھ پٹاخوں کا انتظام ہوتا تھا۔ کچھ برتن ساتھ لائے جاتے تھے جو بجانے کے کام آتے تھے..... آپ اپنے آس پاس دیکھتے تھے تو تمام چھتیں بھری ہوتی تھیں۔ شب کی نیم سیاہی میں کچھ چہرے نظر آتے تھے کچھ روپوش رہتے تھے۔ بس کچھ ہی خالی ہوتی تھیں۔ گرے مکانوں کے خالی ہوتے تھے اور خلقت چھتوں پر ہوتی تھی اور سب آسمان کو تکتے تھے، اگر چاند نظر نہیں آیا تو منہ لٹکائے نیچے آ گئے اور اگر نظر آ گیا تو پھر سارا شہر جاگ اٹھتا تھا۔ پٹاخے چل رہے ہیں اور برتنوں کو نقاروں کی طرح پیٹا جاتا..... جو لوگ چاند نہیں دیکھ پائے وہ غصے سے پوچھ رہے ہیں کہ کدھر ہے اور کس طرف ہے۔ کس ممٹی کے پاس ہے اور کون سے برج کے عین اوپر ہے..... جو نہیں دیکھ سکے وہ بھی جھوٹ موٹ اس چہکتی ہوئی مسرت میں شامل ہو رہے ہیں کہ ہاں نظر آ گیا۔ وہ رہا اس چمکتے ستارے کے عین نیچے..... ہاں ہاں نظر آ گیا۔ لیکن اب پتہ

نہیں کہاں گیا۔ چاند دیکھتے ہی عید مبارک کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔۔۔۔ جب آخری گاڑی گزر گئی تو چھتیں خالی ہوتیں اور پھر نیچے آ کر عید کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔۔۔۔ دو ایک گھر کی تیاریاں ہوتی ہیں سویاں، نئے کپڑے، چوڑیاں، مہندی۔۔۔۔ اور ہاں مہندی جسے گھول کر بنانے کا عمل بہت روز پہلے شروع ہو جاتا۔ ہر محلے یا گاؤں میں کوئی لڑکی کوئی میراثن ایسی ہوتی جو مہندی لگانے میں یکتا ہوتی، بیل بوٹے بنانے میں مہارت رکھتی اور سب لوگ اس کے گھر کے پھیرے لگاتے کہ وہ سب سے پہلے انہی کے گھر آئے اور لڑکیوں کے ہاتھ سجائے۔۔۔

یہ سطریں لکھتے لکھتے مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں کوئی بہت ہی قدیم اور خستہ حال مسودے کے کاغذات آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں حالانکہ ایسا نہیں ہے اس عید کو گزرے بہت زیادہ دن نہیں ہوئے۔

اور اس عید کی شب کو ہم سب اپنے گھر کی چھت پر پہنچے۔۔۔۔ ہمارے پاس چھاج اور برتن تو نہ تھے لیکن ہم شور مچانے اور ایک پُرمسرت ہنگامہ کھڑا کرنے کے لئے اوپر گئے تھے۔۔۔۔

اپنی چھت پر کھڑے ہو کر ہم آسمان دیکھنے لگے۔۔۔۔ ایک چمکیلا ستارہ تھا اور اس کے علاوہ وہاں فی الحال کچھ نہ تھا۔۔۔۔ اور تب مجھ پر صدمے اور خوف کا لمحہ اترا جس کی وجہ سے میں یہ کالم لکھ رہا ہوں۔۔۔۔

میں نے دیکھا کہ ہمارے علاقے کی تمام چھتیں بالکل خالی تھیں۔۔۔۔ جی ہاں آس پاس کے سینکڑوں گھروں میں سے صرف ہمارا گھر ایسا تھا جہاں کے مکین چاند دیکھنے کے لئے چھت پر آئے تھے ورنہ دیگر تمام چھتیں ویران پڑی تھیں۔ مجھے اپنے آپ پر کچھ شبہ سا ہوا کہ شاید آج انتیسواں روزہ نہ تھا اور ہم لوگ غلط شام میں اوپر آ گئے ہیں۔۔۔۔ لیکن ایسا نہیں تھا یہ وہی شام تھی جب شہر لاہور کی چھتیں آباد ہوتی تھیں اور قہقہوں کی دبی دبی آوازیں کونجوں کی طرح آس پاس پرواز کرتی تھیں۔۔۔۔ ہم اپنی چھت پر کھڑے کچھ کچھ مجرم محسوس کرنے لگے۔۔۔۔ ہم

یہاں کیا کر رہے ہیں! کیا ہم بے حد بیک ورڈ ہیں جو اپنی آنکھوں سے چاند دیکھنا چاہتے ہیں! کیا چاند دیکھنا اور اس کی خواہش کرنا متروک ہو چکا! بلکہ یوں بھی ہوا کہ آس پاس کے کسی گھر کی کوئی کھڑکی کھلی کسی نے جھانکا کہ یہ لوگ جو چھت پر کھڑے ہیں تو پاگل ہیں، کیا کر رہے ہیں۔۔۔۔!

چاند دکھائی نہ دیا اور ہم شرمندہ ہو کر نیچے آ گئے کہ کیا بے وقوفی ہے۔ جب ٹیلیویژن پر اعلان ہو جائے گا تو پھر ان بڈھوں کی طرح چھت پر جا کر اپنی آنکھیں خراب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔۔ اور جناب یہی ہوا۔۔۔۔ ٹیلی ویژن پر ساڑھے سات بجے کی خبروں کا آغاز ہوا۔۔۔۔ اور شہ سرخی یہی تھی کہ خواتین و حضرات رویتِ ہلال کمیٹی نے اعلان کیا ہے کہ پاکستان میں عید الفطر کا چاند نظر آ گیا ہے اور کل عید ہو گی۔۔۔۔ لیجئے اتنی سی بات تھی۔۔۔۔ بات تو اتنی سی تھی لیکن میں کچھ بجھ گیا۔۔۔۔ ہم اتنے مکینیکل کیوں ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔۔؟

رات کے کھانے کے بعد شور مچ گیا کہ جناب باہر چلنا ہے۔۔۔۔ "باہر چلنا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔۔۔۔ "جی ہاں آج عید رات ہے سارا لاہور جاگے گا اور ہم بھی جاگیں گے۔۔۔۔" چنانچہ ہم بھی باہر گئے اور واقعی سارا لاہور جاگ رہا تھا بلکہ کچھ زیادہ ہی جاگ رہا تھا۔ لبرٹی مارکیٹ کے آس پاس ٹریفک پولیس کے انتظامات اتنے وسیع تھے اور کاروں اور ویگنوں کی قطاریں یوں رینگ رہی تھیں کہ شک ہوا کہ ہم تو میکسیکو میں ہیں اور فٹ بال کے ورلڈ کپ میں شرکت کے لئے آئے ہیں۔۔۔۔ البتہ ایک فرق تھا کہ یہاں خوش لباس نوجوانوں کے غول کے غول گھومتے تھے۔ بھوکے، ندیدے، معصوم اور ایڈونچر کی تلاش میں کچھ دیکھنے کچھ دکھانے۔۔۔۔ اور یہ اتنے زیادہ تھے کہ انہیں دیکھ دیکھ کر میں اکتا گیا۔ یہ بھیڑیوں کی طرح گھومتے تھے۔ لوگ انہیں بھیڑیا سمجھتے ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہے یہ بھیڑیں تھیں۔۔۔۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ نوجوان ہیں۔ ان میں سے بیشتر گلبرگ میں رہائش پذیر نہیں ہیں بلکہ تنگ گلیوں اور غلیظ محلوں میں سے نکل کر آئے ہیں۔ خوب خوش لباس ہو کر آئے ہیں۔ ان

نوجوانوں کی کوئی ڈائرکشن نہیں۔ ان بے چاروں کو کچھ پتہ نہیں کہ انہوں نے کہاں جانا ہے یہ صرف بھیڑوں کی طرح گھومتے ہیں اور ان کی آنکھیں گھومتی ہیں..... یہ لوگ مجھے کچھ بیمار سے لگے..... ان کا علاج ہونا چاہیئے..... اور یاد رہے کہ عیدرات کی یہ گہماگہمی اور رونق ابھی شروع ہوئی ہے اور ابھی صرف بارہ بجے ہیں اور یہ صبح تک جاری رہے گی..... میرے ایک ڈاکٹر دوست، جو نماز بہت کم قضا کرتے ہیں عید کی نماز نہیں پڑھ سکے کیونکہ صبح پانچ بجے تک وہ شہر لاہور کی عیدرات میں گھومتے رہے۔

اور یہ سب کچھ صرف لبرٹی مارکیٹ میں ہی نہ تھا۔ مال پر نقی مارکیٹ بھی ایک نیا مرکز تھا۔ انارکلی کی جانب جانے کے لئے شرمن ٹینک درکار تھا اور ہندوستان نے بھی صرف خواب ہی میں یہ دیکھا تھا کہ ان کے ٹینک انارکلی میں گھوم رہے ہیں اس لئے ہم ادھر نہ جا سکے..... گلبرگ کی مین مارکیٹ میں بھی خوب رونق تھی..... اچھرے کے آس پاس بھی لوگوں کے ہجوم تھے اور فورٹریس سٹیڈیم میں تو کاروں کو رستہ نہ ملتا تھا۔

عید کی صبح کو حسب معمول نماز کے لئے خوب بھاگ دوڑ ہوئی..... کھیس یا دری بغل میں دابے، سر پر ٹوپی جمائے ہوئے ان مسجدوں کی جانب بھاگم بھاگ جہاں ذرا دیر سے نماز ہوتی ہے..... ایک مقام پر دیکھا کہ لوگ جلدی جلدی کاریں کھڑی کرتے ہیں اور ٹوپیاں سر پر رکھے ایک جانب چلے جاتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ بس یہاں ابھی نماز نہیں ہوئی اور ہم بھی اپنی کار سے اتر کر بھاگتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے..... آگے جا کر معلوم ہوا کہ قبرستان ہے اور یہ لوگ تو نماز سے فارغ ہو کر ادھر آئے ہیں..... عید کے روز بہت کم لوگ گھروں سے نکلے۔

ایک تو گرمی کی شدت..... اور دوسرے عیدرات کا ہنگامہ..... لوگ دیر تک سوئے رہے..... اب عیدرات کی وجہ سے عید کا دن ویران ہوتا جا رہا ہے..... ہم کچھ کچھ انگریز ہوتے جا رہے ہیں۔ انگلستان اور یورپ میں بھی کرسمس کی شام تو خوب شور ہوتا ہے

اور رونق ہوتی ہیں اور کرسمس کے دن شہر کیسے ویران پڑے رہتے ہیں۔ جیسے کوئی دیو پھر گیا [illegible] گیا ہو..... انگلستان میں پہلی کرسمس کے موقع پر ہمارے ساتھ بہت برا ہوا..... یہی ہوا کہ ہم سوتے رہے۔ کرسمس ایوننگ کو خوب ہنگامہ ہوا اور کرسمس ڈے کو سارا شہر چھان مارا لیکن کہیں سے ایک سوکھا ہوا سینڈوچ بھی نہ مل سکا جس کے ساتھ پیٹ کی آگ بجھاتے..... پورا شہر ویران تھا..... اگلے روز ہم نے اپنے انگریز دوستوں کو خوب لعن طعن کی کہ دیکھو ہماری جو عید ہوتی ہے اس پر تو رونق ہوتی ہے..... کیا پتہ تھا کہ صرف چند ہی برسوں میں ہمارا بھی وہی حال ہونے کو ہے۔

پہلے عید کے روز دوست آتے تھے۔ رشتے دار آتے تھے اور اب..... صرف عید کارڈ آتے ہیں..... آپ ان عید کارڈوں کو کارنس پر سجاتے ہیں اور ان کے سامنے بیٹھ کر عید کے تصور میں ڈوبے رہتے ہیں..... عید کارڈ بھی تو کرسمس کارڈ کی ایک شکل ہے..... ہم بہرحال کرسمس کے قریب ہو رہے ہیں اور مشرقی عید سے دور ہو رہے ہیں.....

مجھے تو عید کارڈ کی بجائے انسان درکار ہیں..... اور عید کے اعلان کی بجائے چاند دیکھنا زیادہ پسند ہے..... اور آٹومیٹک کیمیائی ٹھپوں کی بجائے اصلی اور دیسی مہندی زیادہ پسند ہے۔

لیکن.....

میرے بیٹے کو عیدرات کا ہنگامہ پسند ہے اور بیٹی اپنے ہاتھوں پر مہندی لگا کر رنگ چڑھنے کا انتظار نہیں کر سکتی اسے ٹھپوں کے بیل بوٹے زیادہ پسند ہیں..... اور چونکہ آئندہ عیدیں ان کے لئے ہیں میری عیدیں تو گزر چکیں..... اس لئے آئندہ وہی کچھ ہوگا جو انہیں پسند ہے..... میری پسند ناپسند کے دن اور عیدیں تو ختم ہو گئیں ◆

کی صدا جاری و ساری تھی۔ میری دوسری جیب میں پچاس روپے کا ایک نوٹ تھا (پٹرول بھی ختم ہونے کو ہے) اور لسٹ میں درج شدہ اشیاء کسی صورت بھی پچاس روپے کے اس بجٹ کے دائرہ اختیار میں نہیں آرہی تھیں۔ دور ڈیزنگ کے مالی جادوگروں کے لئے ایک چیلنج، تنخواہ دار ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو کھینچ تان کر اپنا بجٹ بنا لیتا ہے اور پھر اسے کھینچتا ہوا اگلی پہلی تک لے جاتا ہے چاہے اس کھینچا تانی میں وہ فوت ہی ہو جائے۔ لیکن میرے جیسے لوگوں کو ان کا رزق قسطوں میں ملتا ہے۔ کبھی ناشر سے، کبھی ٹیلیویژن سے، اور کبھی اخبار سے۔ چنانچہ ہم ایک طے شدہ بجٹ شدہ زندگی بسر کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ رزق آجائے تو سر اٹھا کے چلتے ہیں نہ آئے تو نظر چرا کے چلتے ہیں۔

کیا میرے ساتھ اس سڑک پر رواں دوسرے موٹر سائیکل سواروں اور کاروں والے حضرات کی جیبوں میں بھی اس قسم کے لیٹر ہیں۔ اور کیا وہ بھی اس وقت یہی سوچ رہے ہیں۔ کہ صابن، سالن، چینی پتی، آٹا آٹا..... اگرچہ چہروں پر تو اطمینان ہے۔ لیکن ان کے اندر بھی محدود ذرائع آمدن کے پھٹے ہوئے سائلنسر پھٹ پھٹ کر رہے ہیں..... کیا یہ بھی پٹرول پمپ پر جا کر صرف ایک لیٹر پٹرول کی فرمائش کرتے ہیں۔ اور پھیکے پڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ بھئی آج گاڑی سروس کے لئے دینی ہے اس لئے اتنا ہی کافی ہے۔ ٹینکی فل ہو تو مستری لوگ نکال لیتے ہیں...... اور کیا گوشت مارکیٹ والا قصائی انہیں بھی یہی کہتا ہے کہ صاحب یہ پوری ران تول دوں، دیسی بکرا ہے، اور وہ کہتے ہیں۔ نہیں بھئی فی الحال نصف کلو دے دو، ان دنوں بچے کراچی گئے ہوئے ہیں...... لیکن موٹر سائیکل کب تک سروس ہوتے رہیں گے، اور بچے کب تک کراچی میں ہی رہیں گے...... بہرحال پچھلی رات تیز ہوا کے ساتھ بارش بھی ہوئی تھی۔ اس لئے آج جیب کی تنگی کے باوجود موسم بے حد خوشگوار ہو رہا تھا۔ تب میں نے آٹے اور دال کے بھاؤ کو الگ رکھا اور چہرے پر پھسلتی نم آلود ہوا کا لطف لینے لگا۔

جناح باغ اور گورنمنٹ ہاؤس کے درمیان میں واقع سبزہ زار میں بے شمار لوگ جھکے ہوئے تھے، کچھ جھکے جھکے چل رہے تھے۔ کبھی کبھار ان میں سے کوئی سر اٹھا کر اوپر درختوں کی جانب دیکھتا

اور پھر جھک جاتا۔ جیسے کسی تالاب کے کنارے بے شمار بگلے مچھلیاں پکڑنے کے لئے جھکے ہوئے ہوں اور ان میں سے ایک صرف مچھلی نگلنے کی خاطر سر اٹھائے اور پھر جھکا لے۔ سکوٹروں، موٹر سائیکلوں اور کاروں کی بریکیں لگتیں کہ پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے۔ اور پھر ان میں ایک آدھ رک کر سواری سے اترتا اور اس جھکے ہوئے گروہ میں شامل ہو جاتا۔ میں نے بھی بریک پر پاؤں رکھ دیا کہ ایک نیم لاہوریا ہونے کے ناطے میں بھی کسی ایسے مقام سے بے دھیان ہو کر نہیں گزر سکتا تھا جہاں کسی قسم کے موج میلے، حادثے یا لڑائی مار کٹائی کا خفیف سا بھی امکان ہو۔

"کیوں صاحب کیا ہوا ہے؟" میں نے ایک سکوٹر والے سے دریافت کیا۔

"پبلک جامنوں کھا رہی ہے جی!" اس نے بتیسی نکال کر جواب دیا۔

"جامنوں؟"

"رات کی تیز ہوا نے جامنوں کے ان درختوں کو خوب جھونٹے دیئے جی..... وہاں گھاس پر ان کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں جی...... بازار میں تو چار روپے کلو ہیں۔" اس نے سکوٹر سٹینڈ پر کھڑا کیا۔ اور بڑی بے تابی سے اپنا حصہ بانٹنے کے لئے جامنوں کھاتی پبلک میں شامل ہو گیا۔

کمال ہے، پبلک جامنوں کھا رہی ہے..... کیا انہیں دنیا جہان کا اور کوئی فکر نہیں۔ کیا ان کے محدود ذرائع آمدن اور گرانی توڑ مہنگائی ہمہ وقت ان کے ذہنوں پر سوار نہیں رہتے۔ کیا ان میں سے کوئی عدالتوں کے چکر میں نہیں۔ کسی پولیس کیس میں پھنس کر گواہیاں نہیں بھگت رہا۔ انکم ٹیکس کے نوٹس وصول نہیں کرتا۔ کیا ان کی جیب میں ضروریاتِ زندگی کی فہرستیں نہیں اور اتنی رقم ہے، جن سے وہ خریدی جا سکیں..... اور کیا انہیں آئین، جمہوریت، مارشل لاء وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں۔ عجیب قسم کی پبلک ہے۔ جامنوں کھا رہی ہے اور اسے پرواہ ہی نہیں۔

میں نے اپنی فہرست جیب میں سے نکال کر اس پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ یہ ساری اشیاء صرف پچاس روپے کے ایک نوٹ میں سے..... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا..... میں نے موٹر سائیکل کھڑا کیا اور سبزہ زار میں گھس کر پبلک کے ہمراہ زمین پر پڑے جامنوں اٹھا اٹھا کر کھانے لگا۔

میں سنبھال کر لے گیا تھا تاکہ کسی ڈسٹ بن میں ڈال دوں لیکن پورے شہر میں کوئی اس قسم کا ڈسٹ بن ملا ہی نہیں۔

پھوون تو نے اپنے آپ کو صفائی کے عذاب میں مبتلا کیا اور دوستوں رشتہ داروں کے طنز کا نشانہ بنتا رہا لیکن اب میں بھی پاکستانی بن گیا ہوں۔ ولایت واپس پہنچ کر پھر صفائی پسند ہو جاؤں گا۔ میں نے اُسے بتایا کہ بھائی میرے میں بھی ایک زمانے میں بے حد احمق ہوا کرتا تھا سگریٹ کے ٹکڑے جیب میں دبائے دبائے پھرتا تھا۔ کہ کہاں پھینکوں کاغذ کے ٹکڑوں کو باقاعدہ جیب میں ڈال لیتا، پھلوں کے چھلکے سنبھال سنبھال کر رکھتا تھا۔ بلکہ ایک مرتبہ خربوزے کھاتے ہوئے ایک پہلوان کو ٹوک بیٹھا کہ پہلوان جی یہ ذرا چھلکے...... اور پہلوان نے جو مجھ سے کہا وہ میں تم سے کیا کہوں۔ اپنے گٹروں کے قریب سے گزرتا تو متلی ہونے لگتی۔ راہ چلتے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے اور پھلوں کے چھلکے اٹھا اٹھا کر نالیوں میں پھینکتا...... "تو پھر تمہیں کیا ہوا؟" اس نے پوچھا...... "مجھے...... بازار والے مجھے خبطی سمجھنے لگے اور پھر میں بھی پاکستانی ہو گیا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

مجھے یاد ہے کہ یورپ کے ایک پارک میں جب میں نے اپنا سگریٹ گھاس پر مسل دیا تو ایک بڑی اماں اپنے جوڑوں کے درد کے باوجود جھکیں اور سگریٹ کا ٹکڑا اٹھا کر اپنے پرس میں ڈال لیا۔ سوئٹزرلینڈ کے ایک قصبے میں سے گزرتے ہوئے جب میں نے جیب سے چاکلیٹ کا ایک پیکٹ نکال کر چاکلیٹ کھایا اور اس کا ریپر پھینکنے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھا تو اس چھوٹی سی سڑک پر دور دور تک کوئی کاغذ کوئی سگریٹ کا ٹکڑا نہ تھا۔ چنانچہ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑا کر اسے سڑک پر ہی پھینک دیا۔ کچھ دور آگے جا کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میرا پھینکا ہوا کاغذ اس صاف ستھری سڑک پر ایک ناسور کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے بے حد شرمندگی ہوئی اور میں نے واپس جا کر اُسے اٹھایا اور جیب میں رکھ لیا۔ اس قسم کے بے شمار ناسور ہماری سڑکوں، بازاروں اور گلی کوچوں پر بکھرے ہوتے ہیں اور ہم سب انہیں وہاں جان بوجھ کر پھینکتے ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ صفائی نصف ایمان ہے...... کیا ہم سب صرف آدھے مسلمان ہیں؟ یا ہم اب آدھے مسلمان بھی نہیں رہے؟

"پبلک جامنوں کھا رہی ہے"

میری خاتونِ خانہ ہر صبح مسکراتے ہوئے اپنے گھر سے رخصت کرتی ہے۔ میں موٹر سائیکل کی نشست پر بیٹھتا ہوں تو وہ چپکے سے میری جیب میں ایک خط ڈال دیتی ہے۔ جس پر ایسی باتیں لکھی ہوتی ہیں جن کا تذکرہ ہم بچوں کے سامنے نہیں کر سکتے۔ وہ میرے موٹر سائیکل کے سٹارٹ ہونے کا انتظار نہیں کرتی کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ یہ عمر رسیدہ مشین ابھی درجنوں کِکیں کھانے کے بعد ہنکارا بھرے گی اور اتنی دیر تک وہاں کھڑے ہو کر وہ مسلسل مسکرا نہیں سکتی۔ چنانچہ وہ اندر چلی جاتی ہے...... میں نہر کے کنارے تک پہنچتا ہوں اور موٹر سائیکل پارک کر کے پیڑوں کی جھکی ہوئی شاخوں کے نیچے بیٹھ کر وہ خط نکالتا ہوں، اور پڑھتا ہوں...... دال ماش ½ کلو...... کپڑے دھونے کا صابن ۲ کلو...... چینی گیلی نہ ہو، ایک کلو...... انڈے گندے نہ ہوں، نصف درجن...... اور اس لیٹر کے آخر میں ایک دو سطریں کچھ اس قسم کی بھی ہوتی ہیں، کہ آج حجامت ضرور کروا لیجئے گا، پڑوسن نے کل دیکھ کر شکایت کی تھی، کہ آپ کے میاں بالکل مراثی لگ رہے تھے...... اور گھر کی رکھوالی کے لیے السیشن نسل کا جو کتورا آپ کے دوست عنایت کر گئے تھے، اس کے کان ابھی تک کھڑے نہیں ہوئے۔ گھوڑا ہسپتال جا کر معلوم کیجئے کہ کان ابھی تک کھڑے کیوں نہیں ہوئے وغیرہ وغیرہ۔

آج صبح بھی میں حسبِ معمول روزانہ لو لیٹر کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے بغیر سائلنسر کے موٹر سائیکل پر پھٹ پھٹ کرتا ہوا مال روڈ پر جا رہا تھا اور جس طرح گاڑی کے سفر کے دوران پہیوں کا ایک مخصوص ردھم کے ساتھ ساتھ آپ کے خیالات بھی سفر کرتے ہیں۔ اسی طرح انجن کی پھٹ پھٹ کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں بھی دال دال، چینی چینی، انڈے انڈے، گوشت گوشت

کیونکہ مٹی کی تھی۔ اسے کسی غریب کسان نے بنایا تھا۔ اگر نیشنل کالج یا نیشنل کونسل کے کسی آرٹسٹ نے بنائی ہوتی تب یہ چلتی ...... اور اس کے بنانے والے کو "لوک آرٹسٹ" کا نام دیا جاتا۔

ہم باہر آئے اور پہاڑی نالے پر چلنے لگے۔ سید پور کے آخری گھر سے پرے ایک پگڈنڈی بلندی کی طرف جا رہی تھی۔ سامنے ایک سُرخ چٹان کھڑی تھی، چٹان کا چہرہ چھلا ہوا تھا اور ایک مزدور کدال کی مدد سے اُسے ڈھا دینے کی فکر میں تھا۔ داؤد نے بتایا کہ بجری بنانے کے لیے پہاڑ کے اس حصے کو ایک عرصے سے کاٹا جا رہا ہے البتہ یہ شخص ہمیشہ سے یہاں نہیں تھا شاید اس کے باپ دادا بھی یہی کام کرتے ہوں۔ اس کے بیٹے بھی یہی کام کریں گے اور چٹان موجود رہے گی کم نہ ہوگی۔ میں نے پوچھا اگر یہ چٹان اطالیہ میں ہوتی تو اس میں چھپے ہوئے مجسموں کو باہر نکالا جاتا لیکن یہاں ان مجسموں کی بجری بن رہی ہے۔

شام ہو رہی تھی بلند پہاڑوں پر کدال کی آواز گونج رہی تھی۔ اب ہم پہاڑی نالے کے کنارے کنارے ایک تنگ راستے پر چل رہے تھے جو نیم تاریکی میں ایک واہمے کی طرح دکھائی دے بھی رہا تھا اور پوشیدہ بھی تھا۔ کہیں چھوٹی چھوٹی آبشاریں بھی تھیں جن کے پاس سے گزرتے تو پانی کا شور ہماری آوازوں پر حاوی ہو جاتا۔ "برگد کہاں ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"اس قسم کے برگد تک پہنچنے کے لئے صرف جسمانی قوت کام نہیں دیتی۔ اس کے لئے دل کی حرارت درکار ہے۔ تم چلتے آؤ" اس نے کہا۔ داؤد باتیں کر رہا تھا۔ شفیق الرحمٰن کی تحریروں کی، سفرناموں کی، اپنی کہانیوں کی اور چلتا جا رہا تھا پہاڑوں کی اس نیم تاریک فضا میں، ندی کے آبشار کی سرسراہٹ میں وہ اپنی سیاہ جیکٹ میں ملبوس چلتا جا رہا تھا...... تب مجھے وہ ایک انسان کی بجائے وحشی جانور کی صورت دکھائی دینے لگا۔ اس کے چلنے، جھکنے اور مڑ کر دیکھنے میں ایک وحشت تھی۔ میں نے شہر میں، ہجوم میں، دفتر میں اور کافی ہاؤس میں بھی اس کے چہرے پر اس وحشت کے آثار دیکھے تھے اور ہمیشہ اس سے قدرے خوفزدہ رہا تھا۔ لیکن یوں لگتا تھا۔ جیسے آج وہ اپنے جنگل میں آگیا ہے اور آزاد ہے...... وہ بڑے بڑے پتھروں کو پھلانگتا ہوا چلا جا رہا تھا اور میں

تھکا ہوا اپنے ٹخنے اور گھٹنے بچاتا ہوا اُوپر چڑھ رہا تھا۔ میں تھک چکا تھا لیکن اپنے امیج کی خاطر چلا جا رہا تھا۔ ایک سیاہ چٹان نے ہمارا راستہ روکا۔ چٹان کی ساخت جاپانی باغوں میں رکھی ہوئی جادوئی چٹانوں کی طرح تھی۔ شاید کسی زمانے میں اُسے جان بوجھ کر تراشا گیا ہو اور اس کی یہ مخصوص شکل ظہور میں آئی ہو یا میں ہی اس نیم تاریکی میں اسے ایک انجانے روپ میں دیکھ رہا تھا۔

پہاڑوں سے چھوٹی جھاڑیاں اور درخت تاریکی میں مدغم ہو رہے تھے، تاریک ہو رہے تھے۔ سیاہ چٹان عبور کرنے کے بعد ہمیں چند جھاڑیوں میں سے راستہ بنانا پڑا...... پانی گرنے کی آواز پھر قریب آئی، جھاڑیاں ختم ہوئیں...... میں نے ایک طویل سانس کھینچا اور یخ بستہ ہوا میرے جسم میں اس طرح داخل ہوئی جیسے تمام دروازے اور کھڑکیاں کھلے تھے...... ہمارے اوپر ایک گھنے درخت کی تاریکی تھی۔ درخت کے تنے کے ساتھ ایک آبشار پتھروں میں گھرے ہوئے ایک تالاب میں گر رہی تھی۔ پتھروں کا رنگ سفید تھا اور تاریکی میں صرف پتھر اور وہ تالاب نظر آتا تھا جس کے کنارے برگد کا وہ درخت کھڑا تھا۔ جس کی تلاش میں ہم وہاں تک آئے تھے —— مہاتما بدھ کا برگد......

کہا جاتا ہے کہ گئے زمانوں میں چین سے ایک راستہ ان پہاڑوں اور وادیوں کے درمیان سے آتا تھا۔ بدھ کے پیروکار اس راستے پر سفر کرتے ہوئے ہنزہ اور گلگت میں سے گزر کر ادھر آتے اور اس درخت کے آس پاس رات بسر کرتے۔ یہ ان کی "کارواں سرائے" تھی۔ یہاں سے وہ ٹیکسلا کا عظیم درسگاہ کو جاتے...... یہ درخت ہمیشہ سے یہاں موجود تھا۔ پہاڑوں میں سفر کرنے والے اس کے نیچے پل دو پل کے لئے آرام کرتے، تالاب میں نہاتے اور اپنی منزل کو روانہ ہو جاتے لیکن پچھلے دنوں چند جاپانیوں کا ادھر سے گزر ہوا تو انہوں نے کچھ ایسے آثار دیکھے جن کی بنیاد پر یہ کہا گیا کہ مہاتما بدھ نے اپنے کسی سفر کے دوران یہاں قیام کیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس مفروضے کو ٹھوس حقائق کی بنیاد پر ثابت کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ البتہ بلندی پر واقع یہ آبشار، تالاب، برگد کا درخت اور اس کا سکون اور ماحول اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ یہاں کچھ تھا......

ہے کہ جناب میں بذاتِ خود پچھلے دو گھنٹے سے اسے دیکھتا رہا ہوں۔ چنانچہ یہاں ہر شخص دوسرے پر نظر رکھے ہوتے ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ چونکہ بیشتر لوگ مشترکہ خاندانی سسٹم میں زندگی گزارتے ہیں۔ اس لئے جو کچھ ہوتا ہے وہ سب کی نظروں کے سامنے ہوتا ہے بلکہ بہت کچھ ہوتا ہے جو سب کی نظروں کے سامنے نہیں ہونا چاہیئے۔ گلی محلے کا تو حساب کتاب ہی اور ہے۔ کس گھر میں آج کون آیا ہے، انہوں نے کیا پکایا ہے، بہو ساس میں جھگڑا ہوا ہے یا نہیں فلاں لڑکے کا کردار کیسا ہے، فلاں لڑکی کے پاس لباس کے کتنے جوڑے ہیں ایسی گرانقدر معلومات محلے کی مشترکہ میراث ہوتی ہیں۔

چنانچہ انسان کو چڑیا گھر میں رکھنے کا تجربہ ہمارے ہاں تو کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہم سب کے پنجروں میں تانک جھانک کرتے رہتے ہیں اور بغیر ٹکٹ کے یورپ اور امریکہ جیسے ملکوں سے اپنے انسانوں کو چڑیا گھروں میں رکھیں وہاں تو یوں بھی انسان اور حیوان میں بہت کم فرق رہ گیا ہے۔

"مہاتما بدھ کا برگد اور آبشار"

ہم سید پور کی چھوٹی سڑک سے نکل کر اسلام آباد کی ایک شاہراہ میں داخل ہوئے تو رات ہو چکی تھی۔ سامنے الٹرا ماڈرن مغربی طرز کے شاندار بنگلوں کی قطاریں تھیں۔ "یہ سب کتنے بدصورت ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس لئے کہ انہیں انسان نے بنایا ہے اور جو کچھ ہم دیکھ کر آ رہے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے۔" احمد داؤد کی چمڑے کی جیکٹ سے آواز آئی اور اس نے موٹر سائیکل تیز کر دی۔

سارا دن اسلام آباد کی شان و شوکت سے آنکھیں چندھیانے کے بعد جب شام قریب آئی تو داؤد نے اپنی موٹر سائیکل ایک چھوٹی سی سڑک پر موڑ دی جو مرگلہ پہاڑوں کے دامن کی طرف جا رہی تھی۔ میں تھکا ہوا تھا اور گھر جانا چاہتا تھا۔ لیکن احمد داؤد مُصر تھا کہ مجھے سید پور ضرور دیکھنا چاہیئے۔ ایک برگد کے نیچے ہم رک گئے۔ "یہی برگد ہے؟" میں نے پوچھا "نہیں" اس قسم کے برگد تک رسائی اتنی آسان نہیں ہوتی۔ تمہیں کچھ دور چلنا ہوگا۔ سفر ناموں میں تو تم سامان کاندھوں پر رکھے جنگلوں پہاڑوں اور صحراؤں کی خاک چھانتے نظر آتے ہو...... آج دیکھتے ہیں اس کی حقیقت کتنی ہے"......

وہ میرے آگے آگے چل رہا تھا۔ ایک پہاڑی نالے کے کناروں پر پختہ اور نیم پختہ مکان بلند ہو رہے تھے۔ چند بچے ہمارے پیچھے پیچھے چلنے لگے "گاڑی کہاں ہے؟" داؤد نے ان سے پوچھا۔ ان میں سے ایک ہمیں کچے گھر میں لے گیا...... مٹی سے بنی ہوئی ایک "منی ایچر" ریل گاڑی ایک شیلف پر رکھی تھی اگر کچے گھروں میں شیلف ہوتے ہیں تو، اس کے چھوٹے چھوٹے ڈبوں اور انجن کو رنگ چڑھا ہوا تھا۔ ایک سگنل بھی تھا جو ڈاؤن تھا لیکن گاڑی ساکت تھی۔ کہیں نہیں جاتی تھی

"گرد آلود نوادرات" جھاڑ پونچھ کر دکھا رہا تھا۔ اور بولتا چلا جا رہا تھا کہ جناب یہ پاندان دیکھو اور یہ
عطردان ملاحظہ کرو اور میں جان چھڑانا چاہتا تھا۔ تنگ آ کر میں نے ان صاحب سے کہا کہ بھائی ان
پاندانوں کے علاوہ کوئی خاص قسم کی چیز بھی ہے۔ وہ ایک کونے میں گئے اور ایک بڑی سی دیگ
اٹھا لائے۔ میں نے کہا کہ میری شادی ہو چکی ہے، مجھے دیگ کی ضرورت نہیں، وہ کہنے لگے کہ لالہ
جناب، پڑھے لکھے ہو اتنا بھی نہیں جانتے کہ یہ دیگ نہیں، ایک قدیمی مرتبان ہے۔ جس میں ایک ملکہ
شہزادی اچار ڈالا کرتی تھی۔ سونگھ کر دیکھئے، ابھی تک خوشبو آ رہی ہے، میں نے پوچھا کس کی خوشبو،
شہزادی کی؟ کہنے لگے نہیں، اچار کی..... اور جناب مجھے ان پڑھ نہ سمجھیں آپ، گورنمنٹ کالج کا پڑھا
ہوا ہوں۔ اگلے روز لال فیلڈ صاحب امریکہ سے آئے تھے تو ایئرپورٹ سے سیدھے میرے پاس آئے
تھے۔ میں نے سوچا کہ چچا انتظار حسین کو بتانا چاہیے کہ پاندان متروک نہیں ہوا بلکہ پاکستان سے نکل کر امریکہ
جا پہنچا ہے۔ وہ صاحب جب مجھے "نوادرات" دکھا دکھا کر ہانپ گئے تو کہنے لگے کہ آخر آپ کو خریدنا
کیا ہے؟ میں نے کہا کہ اجرک اور کھیس۔ وہ بے حد ناراض ہوئے کہ پہلے کیوں نہیں بتایا، خواہ مخواہ میرا
وقت ضائع کیا۔ میں نے عرض کیا کہ جناب آپ تو مجھے دبوچ کر تہ خانے میں لے گئے اور بذات خود
نوادرات کی نمائش شروع کر دی۔ اب یہ فرمایئے کہ اجرک اور کھیس کہاں سے ملتے ہیں؟ وہ اکتائے ہوئے
لہجہ میں بولے اعظم مارکیٹ سے پتہ کرو۔ میں نے جاتے جاتے پوچھا کہ سچ مچ لال فیلڈ آپ کی دکان
پر آئے تھے؟ کہنے لگے کہ ان کا دیا ہوا چیک دکھا دوں، میں نے کہا نہیں مجھے اب یقین آ گیا..... کیرے
بازار سے نکل کر میں کشمیری بازار میں آ گیا اور پھر اس تنگ راستے کے اندر داخل ہو گیا جو اعظم کلاتھ
مارکیٹ کی طرف جاتا تھا۔ یہاں ایک ایسی دنیا آباد تھی جس کے وجود سے ایک لاہوریا ہونے کے باوجود
میں لاعلم تھا۔ یہاں نہ دن تھا نہ رات، ایک چکاچوند تھی، سینکڑوں دکانیں تھیں، درجنوں گلیاں تھیں جن
میں صرف کپڑے کی مصنوعات فروخت ہو رہی تھیں۔ پاکستان بھر سے آئے ہوئے دکاندار اپنے علاقائی
لباسوں میں ملبوس ادھر اُدھر گھوم کر خریداری کر رہے تھے۔ یہاں وہ لوگ بھی تھے جو خالص پاکستانی
کپڑا خرید کر بعد میں اس پر میڈ ان انگلینڈ کی مہریں لگا کر بیگمات کے ہاتھوں چوری چھپے فروخت کر

دیتے تھے۔ میں نے ایسا گرینڈ بازار شاید دمشق اور استنبول میں بھی نہ دیکھا تھا۔ ایک دکان میں
اجرکیں پسند آئیں تو میں نے پوچھا کیا بھاؤ ہیں؟ دکاندار کہنے لگا، کتنے جوڑے؟ میں نے کہا کہ جوڑا
وغیرہ نہیں چاہیے، چادریں چاہئیں۔ وہ بولا جوڑے کا مطلب ہے چار چادریں، آپ کو کتنے
جوڑے درکار ہیں، میں نے کہا مجھے کل تین چادریں دے دو۔ اس پر وہ قدرے مایوس ہوا کہ جناب
ہم تو دو چار جوڑوں سے کم نہیں دیتے۔ میں نے کہا کہ بھائی صاحب آپ کی مہربانی میں اس عمر میں
جو کڑیاں تک نہیں بھر سکتا جوڑے کیا کروں گا۔ بہرحال انہوں نے مہربانی کی اور چادریں عنایت کر
دیں۔ واپسی پر میں اپنے حساب سے چلتا رہا لیکن گھوم پھر کر اسی دکان پر آ نکلتا۔ تمام راستے ایک
سے تھے۔ تمام چہرے ایک جیسے تھے۔ بڑی مشکل سے باہر کا راستہ تلاش کیا۔ لیکن سنہری مسجد کی
بجائے کہیں اور آ نکلا۔ قدیم شہر کا کوئی حصہ تھا۔ چھوٹی اینٹوں سے بنے ہوئے دیدہ زیب مکانات،
دروازے اور کھڑکیاں اتنے خوبصورت کہ ہر ایک میوزیم پیس تھا۔ ایک جگہ کوئی نیا مکان بن رہا
تھا اور بنیادوں کے نیچے کسی پرانی حویلی کی محرابیں دکھائی دے رہی تھیں۔ جانے کن زمانوں میں
کون لوگ اس میں رہتے تھے۔ اور آج یونہی راہ چلتے چلتے اس کی آخری جھلک دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ
مزدور اس پر کدالیں چلا کر اسے توڑ کر روڑی میں تبدیل کر رہے تھے..... کئی گلیاں، کئی محرابیں
ایسی تھیں جو میں نے قرطبہ اور دمشق میں بھی دیکھی تھیں۔ ان سب شہروں کا اصل ایک ہی تھا۔
میں ایلس ان ونڈرلینڈ کی طرح اس شہر کے قدیم گلی کوچوں میں گھومتا رہا۔ جس شہر میں پیدا ہوا تھا،
جہاں میں نے اپنی عمر عزیز کے درجنوں سال بسر کئے لیکن ان گلیوں، ان بازاروں کو پہلے کبھی نہ دیکھا۔
اور آج بھی اتفاق مجھے ادھر لے آیا۔ میں بھی ان دانشوروں میں سے ایک تھا جو اپنی تہذیب، اپنی
ثقافت کے بارے میں کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ ادھر اُدھر سے سنتے ہیں اور پھر سیمیناروں میں
لمبی لمبی تقریروں میں عوام کو بتاتے ہیں کہ دراصل ہماری ثقافت کیا ہے اور آج مجھے معلوم ہوا کہ
ہمارے شہر کے پرانے باسی ان گلیوں میں سے نکل کر جدید آبادیوں میں جانے سے کیوں ہچکچاتے
ہیں۔ یہاں وہ حسن تھا جو انسان کو زندہ رہنے پر ابھارتا ہے۔ یہاں انسان ایک اکائی کے

یہاں کچھ لوگ ٹھہرے تھے...... آبشار کے کناروں پر جنگلی فرن کے ایک پودے کو میں نے اکھاڑا۔ تالاب میں سے ایک پتھر لیا۔ برگد کا ایک پتا بطور آداب توڑا اور داؤد سے کہا "شام گہری ہو رہی ہے ہمیں چلنا چاہیے۔" واپسی پر ہم دونوں خاموش تھے۔ سرخ چٹان تک پہنچے تو وہاں بھی خاموشی تھی، وہ مزدور اپنی کدال سمیت نیچے گاؤں کو جا چکا تھا۔ ہم سستانے کی غرض سے رکے اور ندی کے کنارے ایک بڑے پتھر پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگے۔ پہاڑوں کی تاریک ہیبت پر طاری ہو رہی تھی۔ ہم اس وادی میں بالکل اکیلے تھے۔ داؤد ایک دم چوکنا ہو کر کہنے لگا: "یہاں پہاڑی شیر بھی ہوتے ہیں اگر کوئی شیر آ گیا تو؟" میں پہلے لرزا اور پھر ہنسا "فکر نہ کرو اگر وہ شیر ٹیلی وژن کا ناظر ہوا تو ہو سکتا ہے میری وجہ سے تمہیں بھی چھوڑ دے۔" داؤد کہنے لگا: "فرض کرو کہ وہ تمہاری اداکاری کو سخت ناپسند کرتا ہو یا پھر سرے سے ٹیلی وژن دیکھتا ہی نہ ہو!" میں نے کہا "پھر ایسے غیر مہذب شیر سے اور کیا توقع ہو سکتی ہے وہ ہم دونوں کو کھا لے گا۔"

سگریٹ ختم ہوا تو ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور سرخ چٹان کی طرف دیکھا جو سیاہ پہاڑوں میں ایک کتبے کی طرح ہمیں دیکھ رہی تھی...... "داؤد، ہزاروں برس پیشتر یہ چٹان یہیں تھی، کسی وحشی کے سامنے...... ہو سکتا ہے کہ مہاتما بدھ کی نگاہ بھی اس پر پڑی ہو اور آج ہمارے سامنے ہے، ہزاروں برس بعد کسی اور کے سامنے ہوگی۔ یہ چٹان وقت ہے...... ہم کتنے حقیر ہیں۔" داؤد جھلا کر بولا "تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" میں نے ایک پتھر اٹھایا اور اپنی پوری قوت سے چٹان کی جانب پھینکا...... "میں زیادہ سے زیادہ ایک پتھر مار سکتا ہوں" لیکن چٹان وہیں کھڑی رہی تب ہم نے وقت سے ہار مانی اور سید پور کی طرف اترنے لگے......

"یہ سب کتنے بدصورت ہیں" میں نے کہا...... "اس لیے کہ انہیں انسان نے بنایا ہے اور جو کچھ ہم دیکھ کر آ رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے۔" احمد داؤد کی چمڑے جیکٹ میں سے آواز آئی تو اس نے موٹر سائیکل تیز کر دی۔

"سکھ شہزادی کا مرتبان اور پاندان"

"یہ دیکھئے! یہ پاندان لکھنؤ کے کسی نواب کا ہے اور یہ دہلی کا بنا ہوا ہے اور یہ پاندان بھوپال کا ہے۔ ذرا پچی کاری ملاحظہ کیجئے، کیا عمدہ کام ہے۔ اس کی کٹوریاں اور پیالیاں بھی پوری کی پوری ہیں...... اور اس پاندان کو دیکھئے۔"

"بھائی صاحب میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ میں پان ہرگز نہیں کھاتا ہوں۔"

"واہ جناب واہ...... ان پاندانوں میں پان تھوڑے رکھے جاتے ہیں۔"

"تو اور کیا رکھے جاتے ہیں؟"

"یہ پاندان تو جناب ڈرائنگ روموں میں رکھے جاتے ہیں، ایٹیکٹ کے طور پر...... ویسے ۹۰ روپے کا ہے، لیکن آپ سے ۸۰ روپے لوں...... تول دوں ——؟"

ہوا یوں کہ میرے ایک دوست عازم انگلستان ہو رہے تھے اور مجھ سے فرمائش کی بھائی میرے تم ان گوروں کی پسند ناپسند سے واقفیت رکھتے ہو۔ مجھے کچھ ایسے تحائف درکار ہیں جو میں وہاں جا کر ان کی خدمت میں پیش کر سکوں۔ تحائف پاکستانی ثقافت کا مظہر ہوں اور سستے بھی ہوں۔ میں نے مشورہ دیا کہ بھائی میرے سندھی چادریں، یعنی اجرک اور چند ڈبی دار کھیس خرید لو۔ وہ کہنے لگے، یہی کیا خرید لوں، تم خرید دو۔ چنانچہ میں ان چادروں اور کھیسوں کی تلاش میں اعظم مارکیٹ کی طرف جا رہا تھا کہ گوری سمبھ کے پہلو میں واقع گسیرے بازار کے ایک دکاندار نے مجھے دبوچ لیا کہ جناب تارڑ صاحب کہاں گھوم رہے ہیں، اگر اصلی اور قدیم نوادرات درکار ہیں تو میرے تہہ خانے میں تشریف لائیے میرے پاس ڈھیروں ڈھیر پڑے ہیں۔ اب میں آلتی پالتی مارے تہہ خانے کے فرش پر بیٹھا ہوا تھا اور وہ مجھے

"مہتاب راشدی، موٹر سائیکل اور سرفراز سید"

خواتین و حضرات سرفراز سید ایک ٹھنڈے مزاج کا انتہائی شریف النفس قسم کا انسان ہے جو دنیا میں صرف دو چیزوں سے ایکسائٹڈ ہوتا ہے ایک مہتاب راشدی کی مسکراہٹ سے اور دوسرے اپنے پنکچر ہونڈے سے۔ جب سے اس مسکراہٹ پر دوپٹے کی پابندی لگی ہے سرفراز اپنے ہونڈے پر ہی اکتفا کر رہا ہے۔

کل دوپہر میں سر جھکائے ایک چور کی طرح چھپتا چھپاتا بلال گنج میں گھوم رہا تھا کہ سرفراز سید نے مجھے دیکھ لیا بلکہ میں نے اسے دیکھ لیا۔ لیکن اس کے باوجود ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچاننے سے انکار کر دیا، اور بوتھیاں اٹھائے قریب سے گزر گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر آمنا سامنا ہو گیا۔ میں نے ایک کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ اسے ہیلو کہا اور اس نے برابر کی کھسیانی مسکراہٹ لبوں پر لا کر مجھے ہیلو کہا اور ہم پھر ایک دوسرے کے قریب سے گزر گئے۔ جب تیسری مرتبہ بھی کوشش کے باوجود ہم ایک دوسرے سے ٹکرا گئے تو سرفراز نے پوچھا "تارڑ کیسے آئے ہو؟" میں نے کہا یار سرفراز سید سنا تھا کہ باقی شہر کی نسبت ادھر بلال گنج میں موسم زیادہ خوشگوار ہے۔ اس لئے سیر کر رہا ہوں...... اور تم؟ سرفراز نے دوپہر کی لو میں ایک طویل سانس لیا اور کہا میں بھی سیر کر رہا ہوں...... اتنی دیر میں ایک کباڑیا ہاتھ میں ایک ٹوٹا ہوا مڈگارڈ لے کر نمودار ہو گیا اور مجھے کہنے لگا "لو جی تارڑ صاحب بالکل برانڈ نیو ہے، جنوئن ہے آپ کے ہونڈے میں فٹ ہو جائے گا"...... میں نے پہلے تو سوچا اس کباڑیئے کے بچے کو پہچاننے سے انکار کر دوں لیکن اس کی صحت اچھی تھی اور ہاتھ میں

پرانا ہونڈا پکڑا ہوا تھا...... جس کے حصول کے لئے میں کئی دنوں سے اس کے ہاں آ جا رہا تھا۔ بہرحال میں نے مڈگارڈ خرید لیا اور مجرموں کی طرح سرفراز سید کی طرف دیکھا جو دانت نکال رہا تھا۔ یاد رہے کہ ایک زمانے میں وہ بالکل سنجیدہ رہتا تھا لیکن جب سے مہتاب راشدی اس کے باغ میں بوگن ویلیا کی بیل لگا کر گئی ہے وہ سدا مسکراتا رہتا تھا۔ حالانکہ اس کی بیل نے ابھی کبھی پھول نہیں دیئے۔ بہرحال سرفراز نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ یار کل میرے ہونڈے کا فنکشن ہے۔ آج صبح جو میں نے اسے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کی باڈی کے کسی بھی حصے پر ہونڈا کا نام نہیں لکھا ہوا...... میں نے کہا یہ کس طرح ہو سکتا ہے، کہ اس پر نام ہی نہ لکھا ہوا ہو۔ کہنے لگا لکھا ہوا تھا لیکن گھس گیا ہے۔ اب میں بلال گنج سے ہونڈے کا مونوگرام خریدنے آیا ہوں۔ یہ نہ ہو کہ وہ میرے موٹر سائیکل کو ہونڈا ماننے سے ہی انکار کر دیں...... اب اس وقت اس کے ہونڈے کو شیشے پر دیکھ کر مجھے تسلی ہو گئی ہے کہ وہ بلال گنج سے ناکام واپس نہیں لوٹا تھا۔

شروع شروع میرا خیال تھا کہ سرفراز بالکل پیدل ہے۔ میرا مطلب ہے جہاں بھی آنا جانا ہے پیدل آتا جاتا ہے۔ صرف ذرا جھک کر چلتا ہے اور قدرے تیز چلتا ہے۔ پھر ایک روز میں اپنے بزرگ موٹر سائیکل پر مال روڈ پر جا رہا تھا کہ سرفراز نے میرے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ سپیڈو میٹر پر نظر دوڑائی تو میں بیس میل کی رفتار سے جا رہا تھا۔ سبحان اللہ میں نے سوچا سرفراز کو اگلی اولمپک میں پاکستان کی طرف سے دوڑنا چاہیے۔ بہرحال سلام دعا ہوئی۔ کہاں جا رہے ہو کیا حال ہے وغیرہ وغیرہ اور میں نے اپنی رفتار تیز کر دی تب میں نے حیرت سے دیکھا کہ سرفراز اب بھی میرے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا۔ قدرے جھکا ہوا ہے لیکن چلا آ رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ شاہ جی! کمال ہے تم تو فلائنگ فن جان سے بھی زیادہ تیز دوڑتے ہو۔ سرفراز نے کہا دوڑ کب رہا ہوں، بیٹھا ہوا ہوں۔" میں نے کہا کس پر؟ کہنے لگا اپنے ہونڈے

پھر۔ میں نے کہا۔ وہ ہے کہاں؟ کہنے لگا فی الحال تو میں بیٹھا ہوا ہوں، جب اترونگا تو دکھا دے گا..... یہ میرا اور اس کے ہونڈے کا پہلا تعارف تھا۔

سرفراز ایک روز دکان پر آگیا۔ کہنے لگا کیا کر رہے ہو؟ میں نے کہا کچھ نہیں۔ کہنے لگا پھر اٹھو میرے ہونڈے کی پچھلی نشست پر بیٹھو۔ میں نے بہیترا کہا کہ میں نے کہیں جانا ہی نہیں تو کیوں بیٹھوں۔ اس پر مسکرا کر بولا یار اتنے نخرے تو فلاں خاتون بھی نہیں کرتی تھیں۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ اچھا وہ اس...... اس ہونڈے پر بیٹھی تھی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دکان سے باہر لے آیا۔ تم بیٹھو تو سہی میں تجھے بتاتا ہوں کہ اس پر اور کون کون بیٹھا تھا۔ سرفراز اس ناتواں شے پر بیٹھ گیا جس کو وہ ہونڈا کہتا ہے اور کہنے لگا بیٹھو۔ میں نے کہا، کہاں، جگہ ہی نہیں ہے۔ کہنے لگا بس آنکھیں بند کر کے 'اللہ' کا نام لے کر یا علی کہہ کر بیٹھ جاؤ۔ اگرچہ مجھے یہاں اس شیر کا حال یاد آیا جس نے مشکل میں یا علی کا نعرہ بلند کیا تھا لیکن میں آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ اور یقین کیجیے کسی معجزے کے تحت ایک چھوٹی سی نشست نمودار ہو چکی تھی۔ تب اس نے مجھے بتایا کہ وہ شہر کے گنے چنے لوگوں کو اپنے ہونڈے کی پچھلی نشست پر بٹھا کر ان کی فہرست تیار کر رہا ہے تاکہ بوقت ضرورت کام آئے۔ پردہ نشینوں کے علاوہ اس فہرست میں بڑے بڑے مشہور لوگ تھے۔ مثلاً گلوکار شوکت علی اور بقول سرفراز سید جب کبھی ہونڈے میں پٹرول نہیں ہوتا تو وہ شوکت کو پیچھے بٹھا لیتا ہے۔ جس کی بلند آواز سن کر ہونڈا چل جاتا ہے۔ شوکت کو سن کر تو بڑی دنیا چل جاتی ہے یہ غریب تو ناتواں ہونڈا ہے۔

سرفراز موسیقی سے گہرا شوق رکھتا ہے۔ اس کے ہونڈے کی آواز میں بھی ایک مخصوص ردھم ہے۔ کہتا ہے کہ آج سے سولہ برس پہلے فر فر بولتا تھا لیکن جب سے ہونڈا چلانا شروع کیا اس نے انجن کی آواز کے ساتھ تال لگاتے لگاتے اپنا یہ حال کر لیا ہے۔ یہ بھی کہتا ہے کہ اس ہونڈے کی ٹیوننگ وہ استاد شوکت اور طبلہ نواز تاری سے کرواتا ہے تاکہ سر تال درست رہے۔ گلوکار مہدی حسن نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ وہ کسی زمانے میں کار مکینک ہوا کرتے تھے اور انجن

سٹارٹ کر کے اس کے ساتھ کان لگا کر آواز سے بتا دیا کرتے تھے کہ رنگ پسٹن ٹھیک کام کر رہے ہیں یا نہیں۔ میرا خیال ہے سرفراز بھی ہونڈے کی آواز سن کر ہی سُر شناسی کی منزلوں تک پہنچا ہے۔

خواتین و حضرات آخر میں یہ عرض کر دوں کہ اگر سرفراز سید کے دل میں کہیں ایک موہوم سی امید اس قسم کی ہے کہ ہونڈا کمپنی کو اتنی زبردست اور مفت کی پبلسٹی مہیا کر کے انہیں قدر شناس کرے گا تو وہ غلطی پر ہے۔ ایک زمانے میں لاہور ٹی وی سے ایک مقبول سیریل ایک حقیقت ایک فسانہ ٹیلی کاسٹ ہوا کرتا تھا۔ جس میں ناچیز بھی اداکاری کرنے کی کوشش میں مصروف ہوتا تھا۔ اس ناچیز کے پاس ان دنوں نئی نئی ہونڈا ۱۷۵ تھی جسے میں اس سیریل کے ڈراموں میں ہفتہ وار استعمال کرتا تھا۔ جہاں اس سیریل کو شہرت نصیب ہوئی وہاں میری ہونڈا ۲۶۰۰ ایس جی اے بھی مقبول ہو گئی۔ مجھے زعم تھا کہ اس بے پناہ پبلسٹی کی وجہ سے کم از کم مزید دس بیس موٹر سائیکلیں تو ضرور فروخت ہوئی ہوں گی۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک روز ایک چھوٹا سا پرزہ کہیں گر پڑا اور میں اس کے حصول کے لئے ہونڈا کمپنی کے ایک ڈیلر کے پاس چلا گیا وہاں کچھ اس قسم کی گفتگو ہوئی۔

"جناب! فلاں پرزہ عنایت کر دیجئے۔"

"پچیس روپے پچاس پیسے۔"

"جناب میرا نام مستنصر حسین تارڑ ہے۔"

"ہو گا، پچیس روپے پچاس پیسے۔"

"جناب! اس ہونڈا کے لئے ہے جو ہر ہفتے ٹی وی پر آتا ہے۔"

"آہو گا۔ پچیس روپے پچاس پیسے۔"

"جناب کچھ رعایت نہیں ہو سکتی۔"

"تنا کی ختم ہو گیا ہے ہمارے پاس پرزہ نہیں ہے۔"

"جناب آپ پورے پیسے لے لیں لیکن پرزہ تو عنایت کر دیں۔"

"اوئے جاتے ہو کہ نہیں۔"

تو بھائی سرفراز سید کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔ اور ہاں دو سال پیشتر جب میں اپنے پرانے ہونڈے کو بیچنے کے بارے میں سوچ رہا تھا تو ایک بہی خواہ نے مشورہ دیا کہ میاں یہ کام نہ کرو۔ میں نے پوچھا کیوں؟ کہنے لگے دیکھو اس ٹوٹے پھوٹے کھنڈر پر گھومتے رہو اس طرح ہونڈا والوں کی بدنامی ہو گی کہ اچھا کچھ عرصہ بعد یہ حال ہوتا ہے ہونڈا کا اور وہ تمہیں ایک نیو برانڈ نیو موٹر سائیکل گفٹ کر دیں گے۔ مجھے یہ تجویز بے حد پسند آئی اور میں ڈھیٹ بن کر لاہور شہر کی سڑکوں پر پھٹ پھٹ کرتا زندگی گزارتا رہا۔ تب ایک دن میں نے سرفراز سید کا چوبیس برس پرانا اس کے ہونڈا دیکھا۔ میں نے پوچھا کتنے برس ہو گئے ..... کہنے لگا پتہ نہیں سولہ برس ہوئے ہیں یا چھبیس کچھ یاد نہیں۔ میں نے سوچا اگر اس مرد درویش پر ہونڈا کمپنی والوں کی نظر نہیں گئی جو سولہ یا چھبیس برس سے گھسٹتا آ رہا ہے تو پھر میری سات برس پرانی ہونڈا پر کسے ترس آئے گا۔ علاوہ ازیں سرفراز تو صرف پچاس سی سی ہے اور میں ایک سو پچیس سی سی کا ہوں۔ اگر پچاس والوں کی باری نہیں آئی تو میں تو بوڑھا ہو کر شاید فوت ہو جاؤں تب شاید تحفے کی صورت یہ گفٹ میری قبر کے سرہانے رکھ دیا جائے ..... چنانچہ آپ سب کی اطلاع کے لئے میں آج صبح پھر بلال گنج گیا تھا اور پہلی مرتبہ اپنے ہونڈے پر گیا تھا۔ جب میں نے اُسے فروخت کرنا چاہا تو کباڑیئے حضرات کا ہنس ہنس کر کباڑہ ہو گیا۔ کہ جناب آپ یہ بتائیں کہ پچھے سے کیا دیں گے۔ چنانچہ اب میں اپنا ہونڈا فروخت کرنے کے لئے پیسے جمع کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ سرفراز سید بھی یہ کام کرنے کے لئے اپنے مکان کو بیچنے کا سوچ رہا ہو گا۔

اور آخر میں یہ عرض کر دوں کہ کسی زمانے میں ہونڈا موٹر سائیکل کا ایک اشتہار

چھپا کرتا تھا۔ جس پر لکھا ہوتا کہ:

ALL THE NICEST PEOPLE RIDE HONDA

یعنی تمام اچھے اور خوشگوار لوگ ہونڈا چلاتے ہیں۔ مجھے اپنے سیت باقیوں کا تو نہیں پتہ البتہ سرفراز سید کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک خوبصورت اور خوشگوار شخص ہے جو ہونڈا چلاتا ہے اور ہمارا یار ہے۔

(سرفراز سید کے ہونڈا کی سولہویں سالگرہ کے موقع پر پڑھا گیا)

"بھولا، پچی اور لمپک کھیلیں"

میں یہ کالم لکھنے بیٹھا تو بھولے ریڑھی والے کو جلال آگیا اور وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر آواز دینے لگا "..... آہبشتاں دے میوے..... آثمر بہشت..... آلنگڑا..... آچونسہ....." کے نعرے لگانے لگا۔ میں نے قلم میز پر رکھ دیا تاکہ وہ اپنی آموں سے لدی ہوئی ریڑھی فروخت کرے اور اس کے بعد خاموش ہو جائے اور تب میں اپنا کالم لکھنا شروع کردوں لیکن وہ پورے دو گھنٹے آم آم آچونسے کے نعرے لگاتا رہا اور کسی راہگیر نے نظر اٹھا کر نہ دیکھا کہ بھولا آم بیچ رہا ہے یا گنڈیریاں..... تب میں نے بھولے سے مخاطب ہو کر کہا "یار بھولے میں نے اپنی روزی کے لیے کالم لکھنا ہے تم خاموش نہیں ہو سکتے؟" وہ کہنے لگا: "باؤ جی میں بھی اپنی روزی کے لئے گلا پھاڑ رہا ہوں..... آہبشتاں دے میوے..... آلنگڑا....."

"بھولے مجھے تو تمہارے آم دیسی دکھائی دے رہے ہیں اور تم انہیں لنگڑا اور ثمر بہشت کے خطاب دے رہے ہو۔"

"بھولا اپنی ریڑھی چھوڑ کر میرے پاس آگیا۔ "باؤ جی منڈی سے بند پٹیاں لے کر آیا تھا۔ آڑھتی نے ثمر بہشت اور لنگڑا کہہ کر یہ آم میرے آگے بیچے تھے۔ یہاں آکر کھولا ہے تو دیسی نکل آیا ہے..... میں تو مارا گیا جی۔" میں نے اُسے صلاح دی کہ وہ دیسی آموں کو دیسی آموں کی قیمت پر ہی فروخت کرے ورنہ سارا دن گلا پھاڑتے رہنے سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔ اس نے میری تجویز پر تھوڑی دیر کے لئے غور کیا اور پھر کہنے لگا۔ "خرید ہو گئی ہے لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ ٹھیک ہے میں چھ روپے کلو کے حساب سے بیچ

دیتا ہوں..... آپ کو کتنا تول دوں؟" ظاہر ہے تجویز میں نے پیش کی تھی اس لیے اس کی سزا کے طور پر مجھے دو کلو آم خریدنا پڑے۔ اس کے بعد جب بھولے نے "آچھ روپے کلو کا" نعرہ بلند کیا تو پبلک اُس کے آموں پر ٹوٹ پڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی ریڑھی خالی ہو گئی۔ بھولے نے آمدنی کا حساب کیا۔ مایوسی سے سر ہلایا اور پھر پچی پان فروش سے ایک سگریٹ خرید کر سلگایا اور اپنی خالی ریڑھی پر بیٹھ کر بازار کے نظارے کرنے لگا۔ میں نے اپنا قلم اٹھایا اور کالم کے بارے میں سوچنے لگا..... اسی دوران پچی پان فروش اپنے کھوکھے سے اٹھ کر بھولے کے پاس آ بیٹھا اور کہنے لگا: "بھولے رات کو ٹیلیویژن پر کھیڈیں دیکھی نہیں؟" بھولے نے سوٹا لگا کر پوچھا "کونسی کھیڈیں؟"..... کہنے لگا "وہی جو امریکہ میں ہو رہی ہیں..... لمپک!"

میں نے پھر اپنا قلم رکھ دیا اور بھولے اور پچی کے درمیان "لمپک" کھیلوں کے بارے میں ہونے والی گفتگو سننے لگا.....

"آہو....." بھولا خوش ہو کر بولا۔ "میں تو روز دیکھتا ہوں..... کیا بات ہے لمپک کی".... بھولے نے ذرا شرماتے ہوئے کہا: "وہ زنانیوں والا کام دیکھا تھا..... نہانے والا.....؟"

"آہو..... کیا بات ہے جل پریاں لگ رہی تھیں۔ پر عجیب بات ہے ٹیلیویژن والوں کا جب بتاتے ہیں کہ یہ لڑکی نہانے لگی ہے اور یہ نہانے کی تو وہاں سے کاٹ کر آگے شروع کر دیتے ہیں۔"

"بے شرمی کی وجہ سے میرے خیال میں۔" پچی نے دور کی کوڑی لاتے ہوئے فیصلہ دیا۔

"تو پھر بعد میں انہیں تیرتے ہوئے کیوں دکھاتے ہیں وہ نہیں ہے بے شرمی کی بات.... انہوں نے تو وہاں والی بال والا میچ بھی دکھایا عورتوں والا۔ نیکریں پہن کر کھیل رہی تھیں اور چھلانگیں مار رہی تھیں جیسے اُن کی ماں مرگئی ہو....."

"اچھا وہ عورتیں تھیں؟..... مجھے تو بندے لگے تھے۔"

"تو نے غور سے نہیں دیکھا ناں..... ہمارے ہاں لوگ کھیل کو تھوڑے ہی دیکھتے ہیں وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ کھیلنے والے بندے ہیں یا زنانیاں....."

"نہیں بھورے..... سب لوگ ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ وہ نہیں تھے بازیگروں والے تماشے..... ان میں لڑکیاں ہی تھیں پر مجال ہے۔"

"مجال کیا ہے؟"

مجال ہے انہیں دیکھ کر خیال آتا ہو کہ یہ لڑکیاں ہیں۔ ایسے عجیب کرتب دکھائے انہوں نے، کیا بات ہے۔"

"ابھی تک کشتی نہیں دکھائی انہوں نے..... میں تو اس کا انتظار کر رہا ہوں، جھارے نے بیڑا غرق کر دیا ہے سب پہلوانوں کا۔"

"جھارا تو گیا ہی نہیں، وہ تو انوکی کے پیچھے لگا ہوا ہے..... ویسے وہ بیمار تھا اب ٹھیک ہو گیا ہے؟"

"ہو ہی گیا ہوگا..... بھلا جھارے سے جا کر کون پوچھے کہ تو ٹھیک ہو گیا ہے کہ نہیں۔ پر کیوں نہیں گیا یہ اولمپک میں؟....."

"بھائی وہاں پر صرف وہ لوگ جاتے ہیں جو پیشہ ور نہ ہوں، اس لئے نہیں گیا۔"

"چلو وہ نہ سہی لیکن ہمارے پاکستان میں اور بھی تو بڑا بڑا پہلوان ہے..... بیا لکڑیا، گوجرانوالیا، رستم پاکستان، رستم زمان، ورلڈ چیمپئن وغیرہ..... اور ان کو تو پہلوانی کے علاوہ اور بہت سارے کام ہیں....."

"کون سے کام؟"

"لے میں نے مار کھانی ہے بتا کر..... تمہیں تو پتہ ہی ہے..... تو پھر ان پہلوانوں کا پیشہ تو کچھ اور ہے تو یہ کیوں نہیں جاتے اولمپک میں؟"

"اولمپک والے بے ایمان ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس نے پہلوانی کرنی ہے وہ اکیلا آئے اکھاڑے میں..... اپنے چاچے باپے لے کر نہ آئے۔"

"ہاں یہ تو زیادتی ہے ناں انگریزوں کی..... ویسے برباد کر دیں ہمارے پہلوان اگر اولمپک میں چلے جائیں..... یار ہماری طرف سے اور کون کون گیا ہے اولمپک میں؟"

"ہاکی گئی ہے۔"

"گئی ہے.....؟"

"ہاں..... پر عاطف صاحب کے فیصلے کی وجہ سے نیوزی لینڈ والے میچ میں جیت نہیں سکی۔"

"عاطف صاحب کے فیصلے میں کیا تھا؟"

"پتہ نہیں..... انہوں نے خود ہی کہا ہے کہ ہماری ٹیم ٹیمن کے مقابلے میں ایک سے جیت رہی تھی۔ تب میں نے اٹھنے کے لئے اپنا تھیلا اٹھایا تو یک دم نیوزی لینڈ والوں نے دو گول کر دیئے۔"

"پر تھیلا اٹھانے کی ضرورت کیا تھی؟"

"پر نیوزی لینڈ والوں کو میچ کے آخر میں مزید دو گول کر دینے کی کیا ضرورت تھی! ایسے ہی خواہ مخواہ سب کو بے سواد کر دیا۔"

"تو ہی آگے ہوئے تھے اولمپک کا میڈل جیتنے کے لئے۔"

"نہیں..... کیا انہوں نے اولمپک میں جانے سے پہلے یہ کہا تھا کہ بس گولڈ میڈل تو وہاں امریکہ نے رکھا ہے اور ہم نے جا کر لے آنا ہے؟..... ہماری ٹیم نے کہا تھا اس لئے نیوزی لینڈ کو گول نہیں کرنے چاہیئے تھے....."

"ہاں انہوں نے زیادتی کی ہے..... پر یار ایک اور بات ہے..... دوسرے ملکوں میں ایسا بھی تو نہیں ہوتا کہ ٹیم جیت کر واپس آئے تو پوری قوم پاگل خانہ ہو کر ان کے پیچھے لگ

جاتی ہے اور انہیں ہار پہنا پہنا کر انہیں ڈھیر یا بنا دیتی ہے اور اگر ہار کر واپس آئیں تو غریب کے بال چھپتے پھرتے ہیں اور ایک ایک کر کے واپس آتے ہیں۔۔۔۔"

"بھاجی! ہم بڑی جذباتی قوم ہیں۔ زندہ قوم ہیں۔ کون کہتا ہے کہ ہم ہار کر واپس آنے والوں کو ہار نہیں پہناتے۔ وہ نیازی صاحب جو ہیں مشرقی پاکستان کے شیر۔۔۔۔"

"اوئے چپ کر۔۔۔۔ بات اولمپک کی ہو رہی ہے اور تو ہاکی کھیلتا کھیلتا کون سے میدان میں نکل گیا ہے پاگل خانے۔۔۔۔ پر یار جب ٹیلیویژن پر دیکھتا ہوں کہ دنیا کے سارے ملکوں کے کھلاڑی وہاں کھیل رہے ہیں کبھی کسی ملک کا نام آیا ہے، کبھی کسی ملک کا جھنڈا اونچا کیا جا رہا ہے تو بڑا دکھ ہوتا ہے، یار کوئی ایسا وقت آئے گا کہ تمام کھیلوں میں پاکستانی بھی ہوں۔ بے شک ہار جائیں لیکن ہمارا نام تو ہو۔۔۔۔"

"ہمیں کرکٹ، ہاکی اور سکواش سے فرصت ہو تو باقی کھیلوں پر توجہ دیں۔"

"اور نیٹ سکواش؟"

"نہیں یہ بھی ہوتی ہے ایک کھیل۔۔۔۔ پی آئی اے والے کھلاتے ہیں۔۔۔۔"

"مجھے تو ویسے بڑی شرم والی بات لگتی ہے کہ سارے اخباروں میں صفحے بھرے پڑے اولمپک کے۔ ٹیلی ویژن والے روز دو گھنٹے کے لئے اولمپک دکھاتے ہیں اور ہمارا نام بھی نہیں ہوتا ان کھیلوں میں۔۔۔۔"

"ویسے تو ہندوستان کا بھی نہیں ہوتا۔"

"ہم نے ریس کرنی ہے ہندوستان کی۔۔۔۔ اُن کو تو اپنے آپ سے فرصت نہیں انہوں نے کھیلیں کیا کھیلنی ہیں؟"

"یار روس نہیں گیا اولمپک میں؟۔۔۔"

"نہیں۔۔۔۔"

"کیوں۔۔۔۔؟"

"امریکہ جو نہیں گیا تھا روس میں۔"

"کیوں؟۔۔۔۔"

"افغانستان کی وجہ سے۔۔۔۔"

"اور روس کیوں نہیں گیا امریکہ میں؟"

"وہ افغانستان کی وجہ سے نہیں گیا۔ وہاں اسے بہت مصروفیت ہے۔"

"یار پچھی۔۔۔۔ اولمپک میں ریڑھی لگا کر پھل بیچنے کا مقابلہ نہیں ہوتا۔۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔۔ یار بھولے اولمپک میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ پان لگانے کا مقابلہ نہیں ہوتا۔۔۔۔؟"

"نہیں۔"

"تو پھر مٹی ڈالو اولمپک پر۔ ہم نے کون سا جانا ہے وہاں پر۔۔۔۔ آؤ تمہیں ایک اور پان کھلاتا ہوں۔۔۔"

"ہاں اچھا۔۔۔۔ ویسے بھی باؤ جی ہمارا منہ دیکھ رہے ہیں کہ کب ہم چپ کریں اور کب یہ اپنا کام لکھنا شروع کریں۔۔۔۔ آؤ۔۔۔۔"

"آ چمن دے میوئے — اولمپک کھیلیں"

بھولا پاکستانی پہلوانوں کے سیول اولمپکس میں حصہ نہ لینے پر بڑا اپ سیٹ تھا.....

بھولا گوالمنڈی میں ریڑھی لگاتا ہے اور موسم اور حیثیت اور موڈ کے مطابق جو جی میں آئے بیچتا ہے۔ پھل فروٹ کے علاوہ کبھی وہ حلیم نان لگالیتا ہے اور کبھی شربت اور کبھی بکنگ بیئر بیچنے لگتا ہے۔ بھولے اور اس کی ریڑھی کے علاوہ جو چیز نہیں بدلتی وہ اس کی حب الوطنی ہے اگرچہ اس خوبی کو اکثر لوگوں نے قابل فروخت ایٹم کے طور پر اپنایا ہوا ہے۔ لیکن بھولا صرف پھل فروٹ بیچتا ہے اپنا عقیدہ اور محبت نہیں بیچتا۔ بہرحال وہ سیول اولمپکس میں پاکستانی پہلوانوں کی غیر موجودگی سے بڑا اپ سیٹ تھا۔ بہت دنوں بعد گوالمنڈی گیا تو بھولا اپنی خالی ریڑھی پر آلتی پالتی مارے آ چمن کے میوے کے نعرے لگا رہا تھا اور ساتھ ساتھ مسکراتا جاتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ بھولے ریڑھی تمہاری خالم خالی ہے تو "چمن کے میوے" کے نعرے لگا کر کیا بیچ رہا ہے؟

بھولا بدستور مسکراتا رہا "کچھ نہیں باؤ جی..... آپ بڑے دن کے بعد آئے ہو اسلام آباد بہت پسند آگیا ہے؟"

"یار بات یہ ہے کہ کسی لاہوریے کو کبھی کراچی اور شہر پسند نہیں آتا سوائے لاہور کے اور میں تو لندن اور پیرس بھی لاہور کے لئے چھوڑ آیا تھا۔ بہرحال اسلام آباد بھی اپنا شہر ہے پر لاہور لاہور ہے....."

"آہو جی نئیں ریساں لاہور شہر دیاں....." وہ کہنے لگا "پر باؤ جی آپ نے بڑی زیادتی

کی"

"میں نے زیادتی کی؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"آہو جی آپ جیسے باؤ لوگوں نے بڑی زیادتی کی..... آپ نے اولمپکس میں اپنے پہلوانوں کو نہیں بھیجا....."

"پہلوان تو گئے ہیں بھولے۔"

"او نہیں جی! میں وجے رنگ کے پہلوانوں کی بات کر رہا ہوں..... اپنے ملتان والے، گوجرانوالہ والے اور لاہوریے بادشاہ..... جھگڑا ڈالنے والے، سردائیاں پینے والے اور اکھاڑے میں ڈنڈ بیٹھک نکالنے والے پہلوان بادشاہ....."

"چھوڑ یار بھولے....." میں نے سر جھٹک کر کہا۔

"کیوں چھوڑیں جی....."

اب میں اسے یہ تو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ ہمارے پہلوان کسی اور زمانے اور کسی اور عہد کی یادگار ہیں..... وہ نہ کوئی کشتی لڑتے ہیں نہ کسی چیمپئن شپ میں حصہ لیتے ہیں اور خوراکیں کھا کر بڑھکیں مار کر خود ہی رستم زماں وغیرہ بن جاتے ہیں۔ اولمپکس میں مصیبت یہ ہے کہ اکھاڑے میں مات دے کر ہی انسان کچھ بن سکتا ہے..... بہرحال میں نے بھولے کا دل رکھنے کے لئے کہا کہ باقی دنیا جو ہے وہ ان دنوں فری سٹائل کشتی میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہے اور انہوں نے اپنے فائدے کے لیے صرف اسی قسم کی کشتی کو اولمپکس میں شامل کیا ہے اس لئے ہمارے پہلوان وہاں نہیں جا سکتے۔

"نہیں باؤ جی..... بھولے نے سر ہلایا "کہیں نہ کہیں تو ہمارے پہلوان جا کر ملک کا نام روشن کریں یہاں بیٹھ کر ڈھول بجاتے رہتے ہیں اور سردائیاں پیتے رہتے ہیں..... ویسے باؤ جی عجیب بات یہ ہے کہ یہ جو باقی ملکوں کے پہلوان ہوتے ہیں ان کی خوراک بڑی کم ہوتی ہے کل اک جو پہلوان آتا ہے وہ کہتا ہے جی میں آدھا بکرا اور دس ککڑ روز کے کھا جاتا ہوں....

"…… ایسا کیوں ہے؟"

"بس بھولے جس کو جو کام آتا ہے وہ وہی کرتا ہے۔"

"نہیں جی نہیں ہمارے پہلوانوں کو پہلوانی بھی آتی ہے، بس اُن کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی …… ان کو اولمپکس میں بھیجنا چاہیے تھا ……"

"ایک اور چھوٹی سی بات ہے اور وہ یہ بھولے کہ …… اولمپکس میں پیشہ ور کھلاڑی نہیں ہو سکتے …… اور ہمارے پہلوان پیشہ ور ہیں ……؟"

"چھوڑو جی …… باؤ جی یہ سب فراڈ ہے …… سارے ہی پیشہ ور ہوتے ہیں بس انہوں نے نام لکھا لیا کہ وہاں کام کرتے ہیں …… کسی بنک میں یا بڑی کمپنی میں …… چاہیے تو یہ کہ ہمارے پہلوانوں کے نام بھی درج ہو جائیں کسی جگہ …… تو پھر یہ بھی پیشہ ور نہ رہیں گے۔"

میں کوئی جواب نہ دے سکا …… بھولے نے بات سولہ آنے ٹھیک کی تھی …… یہ پروفیشنل اور نان پروفیشنل والا سب فراڈ تھا …… تمام کھلاڑی کہیں نہ کہیں "ملازم" ہوتے ہیں۔ لیکن سارا سال اپنی ملازمت سے غیر حاضر رہتے ہیں اور دنیا بھر میں غیر پیشہ ورانہ کھیل کھیلتے رہتے ہیں ……

"آ چن دے میرے …… آ چن دے میرے ……" بھولے نے مزید دو نعرے لگائے ……

"میں پھر پوچھوں گا کہ خالی ریہڑی پر بیٹھ کر آوازیں کیوں لگا رہے ہو؟"

"میں بھی یہی پوچھوں گا کہ پاکستانی پہلوان اولمپکس میں کیوں نہیں گئے؟ ویسے آپس کی بات ہے باؤ جی ہمارے پہلوانوں کے پٹھے بھی تو اور ہوتے ہیں …… اب میری زبان نہ کھلوائیں لیکن آپ جیسے باؤ لوگوں نے بڑی زیادتی کی ہے انہیں اولمپکس میں نہ بھیج کر ……"

مجھے تاؤ آ گیا: "سن بھولے ……" میں نے کہا "ہم لوگ قوانین کی پابندی نہیں کرتے اور یوں بقول تمہارے اپنے ملک کی بے عزتی خراب کرتے ہیں …… تمہارے پہلوان جو ہیں کیا کرتے

ہیں؟ جب دیکھا کہ ہار رہے ہیں تو جھگڑا ڈالتے ہوئے اکھاڑے میں آ گئے اور اپنے پہلوان کو چھڑا کر کندھوں پر اٹھا لیا اور بڑھکیں لگانے لگے۔ ریفری کی پٹائی کر دی …… جج حضرات کی بے عزتی کر دی اور اپنی شکست کو تسلیم نہ کیا …… یہ ہیں تمہارے پہلوان …… تو کیا ایسے لوگوں کو سیول بھیجتے؟"

"سیول والوں نے خود پتہ ہے کیا کیا ہے؟"

"کس نے؟"

"کوریا والوں نے ……"

"انہوں نے اولمپکس کا کامیابی سے انعقاد کر کے پوری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے ……"

"اس کے علاوہ بھی باؤ جی انہوں نے بہت کچھ کیا ہے۔ ہم تو جاہل لوگ ہیں۔ ہمارے پہلوانوں کو تمیز نہیں ہے۔ لیکن وہ تو پڑھے لکھے ہیں۔ عقلمند ہیں انہوں نے کیا کیا ہے؟"

"کیا کیا ہے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"باؤ جی میں نے خود وہ باکسنگ میچ ٹیلی ویژن پر دیکھا ہے۔ مقابلہ تھا کوریا اور بلغاریہ کے باکسروں کے درمیان …… کوریا کا باکسر اچھا تھا پر فاؤل کھیل رہا تھا …… ریفری نے بار بار منع کیا اور اسے وارننگ دی مگر وہ تماشائیوں کے نعروں کی شہ سے بپھرا ہو چکا تھا اور فاؤل کھیل رہا تھا …… چنانچہ جج لوگوں نے بلغاریہ کے باکسر کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ بس جناب کوریا والے باکسنگ کے اکھاڑے میں کود پڑے بڑھکیں لگاتے ہوئے کہ ہمارے باکسر کو کیوں ہرایا ہے۔ انہوں نے پہلے تو ریفری کی مرمت کی اور اچھی طرح پھینٹی لگا دی۔ پھر ججوں کو تھپڑ مارے اور اُن کے کاغذات پھاڑ ڈالے اور پھر جمنیزیم کی روشنیاں گل کر دیں تاکہ وہاں اور مقابلے نہ ہوں …… یہ کیا کوریا والوں نے اور ہمارے پہلوان تو اتنے برے نہیں ہیں۔"

بھولا پھر ٹھیک کہہ رہا تھا …… واقعی پاکستان کے پہلوان اگر ایسی حرکت کرتے تو پوری قوم ان کے خلاف بیانات دیتی۔ لیکن کوریا والوں کی اس سپورٹس مین سپرٹ کا کسی نے بھی برا نہیں منایا۔

"ویسے بھولے تم یہ بتا دو کہ خالی ریڑھی پر بیٹھ کر "آ چمن دے میوے" کے نعرے کیوں لگا رہے ہو؟"

بھولا مسکراتا ہوا کہنے لگا۔ "باؤ جی صبح انگور لایا تھا..... میں نے آ چمن دے میوے کی آواز لگانی شروع کر دی۔ ایک نامانیم باؤ آیا اور سارے ٹکا کر لے گیا..... تو میرا ٹھرک پورا نہ ہوا نعرے لگانے کا..... بس اسی وقت سے ذرا اپنے مزے کے لئے "آ چمن دے میوے" کے نعرے لگا رہا ہوں..... سارا دن گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے نہ لگاؤں تو میری صحت خراب ہو جاتی ہے..... آ چمن دے میوے۔"

تحصیل شکر گڑھ ضلع سیالکوٹ سے ایک کرم فرمانے کرم فرمائی کی ہے اور اپنے خط میں ذرا غصے سے لکھتے ہیں.....

محترمی! میں آپ کے کالم "کاروان سرائے" پڑھتا رہتا ہوں اور ماشاء اللہ آپ کبھی کبھار اچھا کالم لکھ لیتے ہیں اور آپ میں یہ خوبی ہے کہ آپ اپنے آپ پر ہنسنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ورنہ اکثر حضرات ہمیشہ دوسروں پر ہی ہنستے اور قہقہے لگاتے نظر آتے ہیں اس کے باوجود آپ بھی ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ آپ نے اب تک بہت سارے لوگوں سے "گفتگو" کی ہے جو ٹیلی ویژن کے انٹرویو کی شکل میں ہوتی ہے۔ ان میں مجھے اداکارہ گل لالہ موٹے اور پہلوان جی کے انٹرویو پسند آئے لیکن آپ کی اپنی بھی ایک حیثیت ہے کہ آپ کو سفرنامہ نگار جانا جاتا ہے تو آپ ذرا ایک سفرنامہ نگار کا انٹرویو بنائیں کہ وہ کس طرح ڈینگیں مارتا ہے اور اپنے آپ کو توپ چیز سمجھتا ہے..... مجھے پتہ ہے کہ آپ ایسا نہیں کریں گے کیونکہ آپ پر جو چوٹ پڑتی ہے....."

......آپ کا ایک کبھی کبھار قاری۔

تو جناب تحصیل شکر گڑھ ضلع سیالکوٹ کے میرے کبھی کبھار قاری صاحب پیش خدمت ہے ایک سفرنامہ نگار کا انٹرویو اور یہ انٹرویو کرے گی ٹیلی ویژن کی معروف اداکارہ مس صدف ناز شیخ.....

"ناظرین صدف ناز شیخ پروگرام "سچ اور سفرنامہ نگار" لے کر حاضر خدمت ہے..... آج ہمارے سٹوڈیوز میں ایک سفرنامہ نگار تشریف رکھتے ہیں اور عرفِ عام میں انہیں موچی دروازے کا مارکوپولو کہا جاتا ہے..... آیئے اُن سے ملاقات کرتے ہیں..... السلام وعلیکم مارکوپولو صاحب۔"

"وعلیکم السلام مس صدف ناز شیخ صاحبہ..... آپ کا ٹیلیفون نمبر کیا ہے؟"

"جی! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

"ٹیلیفون نمبر پوچھا ہے...... آپ اگر پسند کریں تو کسی روز شام کو...."

"مارکو پولو صاحب ہمارا پروگرام لاکھوں ناظرین ملاحظہ فرما رہے ہیں۔"

"مس صدناز شیخ لاکھوں ناظرین صرف آپ کو ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ سبحان اللہ..... تو پھر فون نمبر عنایت کیجئے گا؟"

"آپ کیا کریں گے میرے فون نمبر کو...... کیونکہ آپ کچھ کرنے جوگے تو ہیں نہیں...."

"دیکھئے صدناز..... میری ایک حیثیت ہے سفرنامہ نگار کی اس حیثیت میں میں نے مشہور کر رکھا ہے کہ میں جہاں جاتا ہوں وہاں لڑکیاں میرا انتظار کر رہی ہوتی ہیں اور مجھ پر فریفتہ ہو جاتی ہیں تو یہ میری ریپوٹیشن کا معاملہ ہے کہ میں آپ سے فون نمبر دریافت کروں۔ اور یقین کیجئے پروگرام کے بعد میں آپ کو ہرگز فون نہیں کروں گا کیونکہ آپ نے خود ہی تو فرما دیا ہے کہ میں کچھ کرنے جوگا تو ہوں نہیں......"

"بہر حال میں فون نمبر پروگرام کے بعد شاید..... تو فی الحال آپ سے چند سوال..... آپ سفرنامہ نگار کیسے مشہور ہو گئے؟"

"میں نے خود اپنے آپ کو مشہور کر لیا....."

"وہ کیسے؟"

"ایک تو وہی ہر صفحے پر ایک خاتون مجھ پر عاشق ہو جاتی تھی۔ اس طرح بہت مشہوری ہوئی..... آپ نے نوٹ کیا ہو گا کہ میں نے اپنے سفرناموں میں کبھی اپنے کسی پاکستانی عشق کا ذکر نہیں کیا..... صرف اس لئے کہ میں پکڑا جاتا..... پہلے تو اس لڑکی کے والدین پکڑ لیتے اور پھر قارئین خود صحیح صورتِ حال جان کر مجھے پکڑ لیتے کہ جھوٹ بولتے ہو۔ غیر ملکی خواتین سے عشق کے تذکرے میں یہی تو سہولت ہے کہ ان کی تصدیق نہیں کی جا سکتی بلکہ ایک بار مجھے جرمنی کی کسی خاتون کے ساتھ اپنا عشق بیان کرنا تھا اور ظاہر ہے مجھے خاتون کا نام ضرور بتانا تھا اور مجھے کوئی جرمن نام یاد نہیں آ رہا تھا۔ چنانچہ میں نے خاتون کا نام سہاگ بھری رکھ دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ

جرمنی میں یہ نام نہیں رکھا جاتا تو بڑی شرمندگی ہوئی۔"

"آپ کو شرمندگی بھی ہوتی ہے؟"

"ذہنی طور پر کبھی کبھار ہو جاتی ہے۔"

"اچھا ان جھوٹے عشقوں کے علاوہ آپ کس طرح مشہور ہوئے؟"

"میں نے اپنے ساتھ شائع شدہ مضامین جن میں فن اور شخصیت کے حوالے سے مضامین پڑھے گئے۔ ان مضامین میں شخصیت میری تھی اور فن مضمون نگار حضرات کا تھا۔ اس کے بعد میں ایک ادبی گروہ میں شامل ہو گیا۔ جس کے سربراہ جناب ادب کثیف تھے..... ادب کثیف کو اپنے گرد مداحین اور احباب جمع کرنے کا بڑا شوق ہے۔ میں چند مرتبہ ان محفلوں میں شریک ہوا، وہ چائے بھی پلاتے تھے اور گفتگو بھی سناتے تھے اور حاضرین صرف سر ہلاتے تھے..... ادب کثیف صاحب سے ملنے کا یہ فائدہ ہوا کہ میں ان کا سفرنامہ نگار ہو گیا۔"

"ان کا سفرنامہ نگار؟"

"جی ہاں! اردو ادب میں کئی گروپ ہیں اور ہر گروپ کا اپنا اپنا حلقہ ہے اور اپنی اپنی فہرست ہے..... سفرنامہ نگار، افسانہ نگار، نقاد وغیرہ سب اپنے اپنے ہیں۔ یہ گروپ اتنے ایماندار ہیں کہ جب کبھی ٹیلی ویژن، ریڈیو یا کسی مذاکرے میں ان کو بلوایا جاتا ہے تو صرف اپنے سفرنامہ نگاروں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کے نام لیتے ہیں...... اور اکثر اس قسم کے بیان دیتے ہیں کہ منیر نیازی کے بعد مجھے پوپٹ پتو کیو تم سے بڑی توقعات ہیں....."

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"جب ادب کثیف صاحب کے حوالے سے میں نے مناسب شہرت حاصل کر لی تو پھر میں ادب چھالیہ والوں کے ساتھ مل گیا۔"

"یہ کون ہیں؟"

"ادب چھالیہ صاحب دو تین ادبی پرچوں کے مدیر ہیں۔ شین قاف کا بہت دھیان رکھتے ہیں اور ان کا ایمان ہے کہ ادب صرف چھالیہ چباتے ہوئے لکھا جا سکتا ہے اور ادب

چھا لیہ ہی دکھی ادب کی خدمت کا ایک ذریعہ ہے...... میں نے ان کو بھی اپنے اعلیٰ مقاصد
کے لئے استعمال کیا اور پھر اپنا ایک الگ گروہ تشکیل کر لیا۔"

"آپ کے ادبی گروپ کا کیا نام ہے؟"

"ہم نام بدلتے رہتے ہیں لیکن ان دنوں اسے ادب غنیمت کہا جاتا ہے۔"

"مارکو پولو صاحب ہم سفر نامے سے ادب کی طرف نکل گئے یہ فرمائیں کہ سفر نامہ ادب ہے یا نہیں؟"

"اگر وہ میرا سفر نامہ ہے تو ادب ہے ورنہ نہیں ہے...... اور ہاں آپ کا فون نمبر......؟"

"آپ اپنے علاوہ اور کس کس سفر نامہ نگار کو جانتے ہیں؟"

"میرے علاوہ اور ہے ہی کوئی نہیں تو میں کس کو مانوں؟"

"یعنی میں نہ مانوں؟"

"نہیں میں تو نہ مانوں پر وہاں ماننے کے لئے کوئی ہو تو مانوں...... یا نہ مانوں؟"

"مارکو پولو صاحب....."

"جی صدناز شیخ صاحبہ....."

"آپ میرا نام اتنے...... اتنے پیارے نہ لیں۔ ٹیلیوژن پر لاکھوں ناظرین ہمیں دیکھ رہے ہیں۔"

"میں بھی تو لاکھوں میں ایک ہوں......"

"اچھا یہ فرمائیں کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نے سیاحت وغیرہ تو کی نہیں۔ ایک بار کہیں ملازمت کے سلسلے میں گئے تھے اور پھر دھڑا دھڑ سفر نامے لکھنے شروع کر دیئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ دوسرے سفر ناموں سے استفادہ وغیرہ کرتے ہیں؟"

"دوسرے سفر نامے کہاں...... میں نے بالکل کسی اور سے کچھ نہیں لیا۔ یہ جھوٹ ہے کہ میں روم نہیں گیا اور وہاں کا سفر نامہ لکھ دیا۔ یقین کیجئے کہ میری ٹرین وہاں سے گزری تھی

اور مجھے کسی کی نقل کرنے کی ضرورت ہے۔ میرے پاس انگریزی زبان میں بے شمار سفر نامے ہیں۔ مختلف ملکوں کے سفارت خانوں کے بھیجے ہوئے بروشر اور معلوماتی کتابچے ہیں...... تو مجھے کیا ضرورت ہے مقامی سفر نامہ نگاروں کی۔ ان کو تو پتہ بھی نہ چلے کہ میں کہاں سے کیا نقل کرتا ہوں۔ یہ کچھ پڑھتے تو ہیں نہیں میں چیلنج کرتا ہوں کہ یہ میرے ناروے کے سفر نامے میں سے ایک فقرہ ایسا نکال کر دکھائیں جس سے پتہ چلتا ہو کہ میں وہاں نہیں گیا......"

"یہ واقعی آپ کا کمال ہے کہ آپ پتہ نہیں چلنے دیتے...... مارکو پولو صاحب......"

"دیکھئے مجھے مارکو پولو نہ کہیئے۔"

"کیوں؟"

"میری بے عزتی ہوتی ہے......"

"آپ کی...... نہیں نہیں...... لیکن کس طرح؟"

"یہ مارکو پولو میرے سامنے کیا حیثیت رکھتا ہے۔ معمولی قسم کا سفر نامہ نگار تھا۔ صرف اس لئے کہ وہ انگریز تھا اس لئے آپ نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے......"

"مارکو پولو تو غالباً اطالوی تھا۔"

"نہیں انگریز تھا...... مجھے نہیں معلوم ہوگا تو اور کس کو ہوگا۔ میں نے ہی تو اس کے نام کو پھر سے زندہ کیا ہے......"

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ انگریز تھا؟"

"دیکھئے اس کے سفر نامے کا نام ہے "ٹریولز آف مارکو پولو" اور یہ انگریزی زبان میں ہے تو مارکو پولو انگریز ہوا ناں! اب میں پاکستانی سیاح ہوں تو کیا میں عربی میں لکھوں گا! واہ......"

"بہت خوب...... تو مارکو پولو...... معاف کیجئے گا...... تو آپ یعنی عظیم سفر نامہ نگار صاحب ان لوگوں کے لئے جو سفر نامہ نگار بننا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے کیا پیغام ہوگا؟"

"میرے پاس کچھ نہیں ہے......"

"نہیں پیغام ...."

"اچھا.... میرا بھی پیغام ہے کہ سفر کریں نہ کریں لیکن سفر نامہ ضرور لکھیں اور کبھی کبھی دنیا کا نقشہ بھی دیکھ لیں۔ کیونکہ ایک مرتبہ میں نے کہیں لکھ دیا تھا کہ تمبکٹو کا قصبہ کو بہت مشہور ہے اور یہ پیرس کے نزدیک ایک گاؤں ہے...."

"اچھا، تو وہ پیرس کے نزدیک نہیں تھا؟"

"نہیں، نقشہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ ٹمبکٹو تو تہران کے قریب ہے۔"

"تو ہمارے پروگرام "پیچ اور سفرنامہ نگار" کا وقت ختم ہو رہا ہے، تو سفرنامہ نگار جی..... ہم آپ سے بھی اجازت چاہیں گے۔"

"لیکن صدناز شیخ صاحبہ آپ نے ٹیلی فون نمبر دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔"

"آپ باز آتے ہیں کہ نہیں....."

"میں باز نہیں آ سکتا۔ میری ریپوٹیشن کا سوال ہے۔ کیوں کہ میں جہاں جاتا ہوں داستان چھوڑ آتا ہوں۔"

"آپ....."

"میں دراصل آپ سے ملاقات کا متمنی شرکت ہوں...... ٹیلی فون نمبر؟"

"میں جوتے لگاؤں گی اگر تم نے میرا نمبر پوچھا تو۔"

"کمال کرتی ہیں۔ میرے لاکھوں مداحین مجھے دیکھ رہے ہیں تو میں تو داستان چھوڑنا چاہتا ہوں۔"

"اوہو..... مس صدناز شیخ آپ نے تو سچ مچ سینڈل اتار لی..... دیکھیے یہ داستان لوگوں کے سامنے نہ دہرائیے کیونکہ میرے سفرناموں میں جو قصے درج ہیں۔ ان کا اصل یہی تھا..... بس ٹیلیفون نمبر..... ہائے آپ کی سینڈل تو بہت زور سے لگتی ہے۔"

"نقاد اور چارپائی"

میں نے مفاہمت کر لی ہے۔" عبداللہ حسین نے پائپ سلگاتے ہوئے کہا۔

"کس کے ساتھ؟" میں نے پوچھا۔

"اس حقیقت کے ساتھ کہ مجھے کبھی بھی میرے سائز کی چارپائی اور جوتے نہیں ملیں گے۔"

عبداللہ حسین ایک ایسا دراز قد شخص ہے جو دراز ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ کمرے میں داخل ہوتا ہے تو اپنی قامت کو سمیٹ کر اور جھک کر..... اور جب وہ کمرے کے اندر آ جاتا ہے تو پھر اس کا قد بڑھنے لگتا ہے...... اس نے اس دراز قامتی پر پردہ ڈالنے کے لیے چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے کا ایک خاص انداز اپنا رکھا ہے..... وہ ذرا جھک کر اور اپنے آپ کو ایک لچک دار ڈالی کی طرح سمیٹتا ہوا چلتا ہے..... وہ اپنی دراز قامتی پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے لیکن اس میں بُری طرح ناکام رہتا ہے..... اور اگر وہ ادب میں بھی اس کا یہی حال ہے اسے ابھی تک اس کے سائز کا نقاد نہیں ملا۔ ایک چارپائی اور نقاد میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ادب میں اپنی دراز قامتی کو چھپانے کی بہت کوشش کرتا ہے اور بُری طرح ناکام رہتا ہے..... جس شخص نے "اداس نسلیں" اور "باگھ" جیسے بڑے ناول تحریر کیے ہوں وہ کیسے چھپ سکتا ہے؟

یہ تقریباً بارہ تیرہ برس پہلے کی بات ہے کہ پاکستان نیشنل سنٹر میں کسی کتاب کی تقریب رونمائی تھی، شاید کسی ایسی کتاب کی جو میری لکھی ہوئی تھی اور وہاں تقریب کے بعد چائے پر میرے برابر میں ایک ایسا شخص بیٹھا ہوا تھا جو کچھ غیر ملکی لگ رہا تھا یا شاید

وہ نہیں اس کا پائپ پینے کا انداز غیر ملکی لگ رہا تھا...... اس نے آگے جھک کر کہا "مجھے جناب عالی! آپ کی کتاب "فاختہ" بہت پسند آئی تھی" میں نے شکریہ کہا اور اُسے بھول گیا۔

محفل کے اختتام پر میں نے ذرا خوشگوار ہونے کے لئے پوچھا کہ جناب کون ہیں اور کیا کرتے ہیں؟

"میں انگلستان میں رہتا ہوں اور میرا نام عبداللہ حسین ہے۔"

اس معلومات کے بعد میں نے کوشش کر کے اُسے دوست بنا لیا۔ کیونکہ مجھے اس کی تحریر پسند تھی اور ادب میں میری دوستی صرف تحریر کے حوالے سے ہوتی ہے...... مختصر یہ کہ وہ ایسا دوست ہوا کہ میں بھول گیا کہ وہ ادیب بھی ہے۔ کبھی کبھار جب مجھے یہ خیال آتا کہ موٹر سائیکل کی پچھلی نشست پر بیٹھا شخص "اداس نسلیں" کا خالق ہے تو مجھے جھرجھری سی آ جاتی ہے اور ہاں جب پہلی مرتبہ میرے موٹر سائیکل پر بیٹھا تو ایک عجیب لطیفہ ہوا...... میں موٹر سائیکل چلا رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ میرے دائیں بائیں جو گھٹنے ہیں وہ اگرچہ میرے ہیں لیکن وہ کچھ اجنبی سے ہیں...... معلوم ہوا کہ وہ میرے نہیں عبداللہ کے ہیں اور پچھلی نشست سے یہاں تک پہنچے ہوئے ہیں۔

عبداللہ حسین واپس انگلستان چلا گیا پھر وہ کچھ عرصے کے لئے لیبیا چلا گیا۔ ہماری خط و کتابت جاری رہی......

وہ جب بھی پاکستان آتا، ہم مل بیٹھتے اور ایک دوسرے کے ساتھ وہ باتیں کرتے جو ہم کسی اور کے ساتھ نہیں کر سکتے تھے...... ان باتوں میں ادب...... وطن...... مذہب اور محبت سب شامل تھے بلکہ ہم محبت کے بارے میں کچھ زیادہ ہی ہم خیال تھے۔ عبداللہ حسین ایک طویل عرصے کے بعد ان دنوں پھر پاکستان میں ہے اور ہم اکثر مل بیٹھتے ہیں اور پچھلے پانچ برس میں جو کچھ ہوا اس کے نقشے بناتے ہیں اور ان پر ان راستوں کی لکیریں کھینچتے ہیں

جن پر ہم چلنا چاہتے تھے اور چل نہیں سکتے تھے۔ اور ان ناہمواریوں کے بارے میں دل جلاتے ہیں جو ہمارے آس پاس ہیں۔

بہت کم لوگوں نے عبداللہ حسین کو دیکھا ہے...... بہت زیادہ لوگوں نے عبداللہ حسین کو پڑھا ہے۔ اتنے زیادہ کہ وہ پورا چین بھی ہو سکتے ہیں......

اسے اگر کہا جائے کہ عبداللہ فلاں ہوٹل میں ایک ادبی تقریب ہے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور کہتا ہے "جناب عالی! میں تو نہیں جا رہا۔" وہ اخباروں میں تقریبوں ملاقاتوں اور چھوٹی کاروں سے دور رہتا ہے کیونکہ وہ ان میں سما نہیں سکتا۔

پچھلے جمعہ کے روز صبح سویرے وہ میرے ہاں آ گیا اور ہم نے ایک الگ اور ٹھہرا ہوا پُرسکون دن گزارا۔

"میں نے سنا ہے کہ "اداس نسلیں" چینی زبان میں ترجمہ ہو گئی ہے؟" میں نے پوچھا۔ "ہاں" وہ ذرا شرمندہ ہو کر بولا۔ "بس ہو گئی ہے...... میرے پاس ایک کاپی ہے اب پتہ نہیں وہ میری کتاب ہے یا کسی اور کی...... مجھے تو جناب چینی زبان نہیں آتی مجھے کیا پتہ۔"

عبداللہ اپنے بارے میں بہت کم گفتگو کرتا ہے...... اس کی کتابوں کے ترجمے ہندی، پنجابی اور انگریزی میں بھی ہو چکے ہیں۔ محمد عمر نے ان کی کہانیوں "نشیب"، "واپسی کا سفر"، "دھوپ"، "سمندر" اور "پھول کا بدن" کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے جو کینیڈا میں شائع ہو رہا ہے...... پچھلے کئی برسوں سے وہ ایک انگریزی ناول - LOVE AMONG THE EXILES لکھ رہا تھا جو اب مکمل ہو چکا ہے اور برطانیہ کا ایک مشہور اشاعتی ادارہ اسے چھاپ رہا ہے اور اس ادارے کو فخر حاصل ہے کہ اس نے جیمز جوائس کا "یولیسس" اور لارنس کا "لیڈی چیٹرلیز لوور" شائع کئے تھے...... یہ عبداللہ حسین کے لئے اور پاکستانی ادب کے لئے ایک اعزاز ہے۔ اس ناول پر مبنی ایک فلم کا سکرپٹ بھی عبداللہ لکھ رہا ہے اور یہ فلم بھی برطانیہ کی ایک اہم فلم کمپنی بنائے گی۔

"اس ناول کو اردو میں کیا کہا جا سکتا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"جلا وطنوں کے درمیان محبت کی بازی" اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "ویسے اسے "جلاوطن محبت" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔"

میں ایک سوال پوچھنا چاہتا تھا اور مجھے خدشہ تھا کہ وہ ناراض ہو جائے گا۔ میں اس سے پیشتر دو تین قیمتی دوست صرف ایک آدھ سوال کرنے کی وجہ سے کھو چکا تھا اس لئے میں نے کچھ دھڑکتے دل سے یہ پوچھا کہ عبداللہ تم پاکستان کے ہو یا اس دھرتی کے سپوت ہو، اردو کے لکھاری ہو اور اب پچھلے بیس بائیس برس سے ملک سے باہر ہو اور اب انگریزی زبان میں لکھ رہے ہو تو تمہاری پہچان کیا ہے، تم کون ہو؟

"میں جناب عالی!" عبداللہ حسین نے پائپ کا ایک طویل کش لگایا۔ "میں ایک پاکستانی ادیب ہوں اور میں ایک اردو لکھنے والا ادیب ہوں یہ میری پہچان ہے۔ میں نے انگریزی ناشر کو زور دے کر کہا تھا کہ مجھے صرف اور صرف ایک پاکستانی ادیب کہا جائے، اور لکھا جائے۔"

"تم اتنے عرصے بعد وطن آئے ہو..... یہاں کیا محسوس کیا؟" میں نے بالکل اسی قسم کا سوال کیا جس قسم کا سوال ہر کند ذہن انٹرویو لینے والا کرتا ہے۔

"مجھے یہاں آکر احساس کمتری ہو گیا ہے۔" عبداللہ سنجیدگی سے بولا۔

"یہاں آکر کیسے ہو گیا ہے؟ یہ تمہارا اپنا ملک ہے؟"

"ہاں انگلستان میں مجھے یہ احساس کبھی نہیں ہوا..... یہاں میں نے اپنے آپ کو عزت کے بغیر محسوس کیا۔ ان ملکوں میں حکومت تمہیں عزت دیتی ہے۔ یہاں آپ کو دولت کمانے کے مواقع دیتی ہے لیکن عزت نہیں دیتی....."

"مجھے یاد آیا کہ مشہور اطالوی ادیب البرٹو موراویا نے اپنی ایک کتاب میں "غربت عزت کے ساتھ" کا فلسفہ بیان کیا تھا۔ عبداللہ بھی دراصل یہی کہنا چاہتا تھا۔

"زندگی میں تم نے اور کون سا کارنامہ سرانجام دیا ہے؟"

"میں کھانا بہت اچھا پکا لیتا ہوں۔ پلاؤ، دالیں اور قورمہ وغیرہ..... کیا یہ ایک عظیم کارنامہ نہیں ہے؟"

"تم اتنے سست مصنف کیوں ہو؟..... اتنے طویل عرصے میں صرف تین کتابیں؟"

"بس میرا دل نہیں کرتا لکھنے کو۔" اس کے لمبے بازو فضا میں یوں بلند ہوئے جیسے ایک پرندہ اڑنے پہ پر تولتا ہے۔

"لکھنے کو دل نہیں کرتا تو اور کس چیز کو کرتا ہے؟" "تمہیں خوبصورت چہرے اچھے لگتے ہیں؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

"ہاں۔"

"تو بس یہی دل کرتا ہے۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔

"کیا کبھی سیاست کی طرف بھی آؤ گے؟"

"ہر ادیب سیاست میں ہوتا ہے وہ اس سے الگ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"میرا مطلب ہے عملی سیاست میں..... ہمارے ملک میں بڑے بڑے شاندار لوگ سیاست میں ہیں۔ جاگیردار، سرمایہ دار، کاروباری اور ان پڑھ..... ایک ادیب بھی تو سیاست میں آ سکتا ہے؟"

"ہاں کیوں نہیں..... ویسے جوں جوں میری عمر بڑھ رہی ہے اس کے ساتھ سیاست میں دلچسپی بھی بڑھتی جاتی ہے..... پتہ نہیں میں سیاست میں آتا ہوں یا نہیں..... پتہ نہیں..... اگر کوئی خاص موقع ملا تو شاید۔"

"انگریزوں کی کونسی چیز نے متاثر کیا؟"

"جب کوئی پرانا درخت ختم ہو جاتا ہے وہ گرنے کو ہوتا ہے تو اسے کاٹنے کے لئے آ جاتے ہیں..... اور تب وہاں لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں ماتم کرنے کے لئے..... مجھے

بوڑھے اور جوان..... اور جب وہ درخت کٹتا ہے اور گرتا ہے تو وہ روتے ہیں۔ وہ ایک درخت کی موت پر روتے ہیں۔ ایک بڑھیا سے میں نے دریافت کیا کہ آخر اس درخت میں وہ کون سی ایسی بات ہے کہ اس کے کٹنے پر وہ روئے چلی جا رہی ہے۔ وہ کہنے لگی یہ درخت میری عمر سے زیادہ کا ہے۔ جب میں پیدا ہوئی تو یہ موجود تھا۔ اسے میں نے بچپن میں، جوانی میں اور اب بڑھاپے میں دیکھا اور اس نے مجھے دیکھا اور اب یہ رخصت ہو رہا ہے۔ بس مجھے انگریزوں کی یہ ادا پسند آئی۔"

"ہاں وہ درختوں اور پرندوں سے محبت کرنے والی قوم ہے۔"

"بالکل..... کبھی کوئی نایاب پرندہ کہیں سے آ جائے اور برطانیہ کے کسی علاقے میں آ کر بسیرا کرے تو وہاں پہرا لگ جاتا ہے جناب عالی..... اگر وہ پرندہ انڈہ دیدے تو کہرام مچ جاتا ہے...... ہاں وہ درختوں اور پرندوں سے محبت کرنے والی قوم ہے۔"

"لندن میں کس سے ملاقات رہتی ہے؟"

"میں بہت کم باہر نکلتا ہوں..... بس اپنی دکانداری کرتا ہوں اور شام کو لکھتا پڑھتا ہوں" لیکن ن م راشد سے دوستی تھی..... پچھلی بار فیض [illegible] آئے تو خاص طور پر ایک تصویر اتروائی اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے بھئی تم یہیں رہ گئے ہو واپس نہیں آنا؟"

"یہ جو صاحب ہیں سلمان رشدی "مڈنائٹ چلڈرن" اور "شیم" کے مصنف تو یہ کیا چیز ہیں؟"

"بھئی وہ انگریز ہیں، چودہ برس کی عمر میں انگلستان آ گئے رگبی سکول، پھر کیمبرج یونیورسٹی، پھر انگریز ہوئے..... ان کا کلچرل میک اپ اور نفسیات مکمل طور پر برطانوی ہے.....

ایک اور سوال جو بے حد دلچسپ ہے کہ جناب! پاکستان میں ناول کیوں نہیں لکھا جا

رہا..... مختلف لوگوں نے اس کے مختلف جواب دیئے..... تمہارا کیا خیال ہے؟"

"بھئی ناول لکھنا محنت کا کام ہے اور یہاں ادیبوں کو محنت کی عادت نہیں۔ ناول لکھنے کا سردیوں اور گرمیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ لاطینی امریکہ میں تو خوب گرمی ہوتی ہے اور بے پناہ حبس ہوتا ہے اور وہاں بڑا شاندار ناول لکھا جاتا ہے بلکہ سب سے زیادہ لکھا جاتا ہے..... پاکستان میں لوگ ادب میں شارٹ کٹ تلاش کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ محنت کم ہو اور عظمت زیادہ ملے۔ جو افسانہ نگاری اور شاعری کے ذریعے انہیں مل جاتی ہے۔ یہ ہمارا مزاج بن چکا ہے..... اسی مزاج کی وجہ سے ہم دولت کے حصول کے لئے بھی شارٹ کٹ تلاش کرتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کرتے کہ محنت سے، تحقیق سے ایک عمدہ سائیکل تیار کریں بلکہ ہم یہ کرتے ہیں کہ فوری طور پر باہر کے ملک سے سائیکل درآمد کر لیتے ہیں..... تو فوری عظمت اور مشہوری تو صرف سمگلنگ سے ہی مل سکتی ہے اور ناول نگاری میں مقام پیدا کرنے کے لئے محنت اور وقت درکار ہے..... وہی سائیکل والی بات!....."

"یعنی ناول اور بائیسکل کا آپس میں گہرا رشتہ ہے؟"

"بالکل جناب عالی!" وہ خوشدلی سے مسکرانے لگا۔

"پچھلے دنوں کسی نقاد نے کہا تھا کہ تم اور قرۃ العین حیدر کمزور لکھنے والے ہو اور "اداس نسلیں" اور "آگ کا دریا" بس یونہی سے ناول ہیں؟"

"اچھا!" عبداللہ نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "میں نے تو نہیں پڑھا..... بہر حال ہم ان نقاد صاحب کو کیا کہہ سکتے ہیں۔ ان کی کوئی اپنی پرابلمز ہوں گی..... اگر ایک کتاب بیس بائیس برس تک زندہ رہتی ہے اور آگے دو نسلیں قبول کرتی ہیں اور اس سے اثر لیتی ہیں تو پھر میں اب کیا کہوں۔ میرا خیال ہے کہ ایسے نقادوں کی تعلیم میں یا ویژن میں کمی ہوتی ہے یا شاید وہ اپنی مدد خود کرنا چاہتے ہیں۔ ہم تو ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔"

"اور وہی سوال جو فیض صاحب نے کیا تھا کہ واپس کب آؤ گے؟"

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب میں زیادہ وقت پاکستان میں گزاروں گا..... اگرچہ یہاں اب کاریں بہت زیادہ ہیں اس کے باوجود میں پاکستان واپس آؤں گا۔"

"اور ہم دونوں منہ وچلیں گے؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"ہاں جناب عالی!....." وہ قہقہہ لگا کر بولا "اور ہاں کسی کونے میں بیٹھ کر ہم دونوں ایک ایک ناول لکھیں گے؟"

عبداللہ حسین کے "باگھ" کی آواز ادب میں گونجتی ہے۔ اس کی اداس نسلوں نے دو نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ وہ اپنی درازقامتی پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے لیکن اس میں بری طرح ناکام رہتا ہے۔ اگرچہ نقاد اور چارپائی میں بہت فرق ہوتا ہے لیکن عبداللہ حسین کو دونوں میں اپنا سائز نہیں ملا اور وہ اس حقیقت سے مفاہمت کر چکا ہے۔

"باغِ بہاراں"

میں ایک عرصے کے بعد منہ اندھیرے جناح باغ میں داخل ہو رہا تھا۔

میں بھی باغوں میں رہنے والوں میں سے تھا۔ برس ہا برس سورج کی پہلی شعاعوں کو میں نے سڑکوں اور عمارتوں کی بجائے درختوں اور سبزہ زاروں میں اترتے دیکھا تھا۔ میں نے باغ کو ہر روپ اور ہر موڑ میں دیکھا تھا۔ خزاں کی پیلاہٹ میں، بہار کے رنگوں میں، سرما میں ٹھٹھرتے ہوئے گرمی میں گھٹتے ہوئے، بارشوں میں بھیگے ہوئے اور حبس میں دم روکے ہوئے۔ ایک صبح ایسی تھی جب ہوائیں تیز تھیں اور طوفان گرج رہا تھا۔ باغ کی سنسان اور اندھیری راہوں پر پانی گر رہا تھا اور درخت بے تھے اور میں گہرے گہرے سانس لیتا ان راہوں پر حسب معمول دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ جب گرج بارش اور ہوا کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ تو ایک سکوت تھا اور اس سکوت میں ایک ایسی خوشبو تھی جس کا کوئی نام نہیں کیونکہ یہ بے نام خوشبو درختوں کے ٹوٹے ہوئے تنوں، گیلی گھاس، زمین پر گری ہوئی ٹہنیوں سے مل کر بنی تھی۔ وہ خوشبو چلتی ہوئی گاڑی کی کھڑکی میں نظر آنے والے چہرے کی مانند تھی۔ جو بس چلی جاتی ہے اور آپ اسے دوبارہ نہیں دیکھ سکتے صرف یاد رکھتے ہیں۔ باغ کے سارے درخت میرے شناسا تھے اور یقین کیجئے میں ان سے باتیں کرتا تھا..... پھر ایسا ہوا کہ مجھے شہر کے ایک ایسے حصے میں رہائش اختیار کرنا پڑی جو باغ سے بہت دور تھا۔ پہلے پہل میں نے کوشش کی کہ میں دوری کے باوجود اس سے ملاقات کے لئے پہنچتا رہوں۔ لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا۔ گھر سے باغ تک، باغ سے گھر اور پھر گھر سے شہر کی جانب رزق کی تلاش میں اور وہاں سے پھر واپس آنا اتنا تھکا دینے والا عمل تھا کہ میں نے بے حد دل گرفتہ

ہو کر باغ کو چھوڑ دیا۔ کیونکہ میں تلاشِ رزق کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ البتہ کبھی کبھار جب بھی غمِ روزگار سے فرصت ہوتی میں وہاں چلا جاتا۔ لیکن یہ باغ بے حد مختلف ہوتا۔ لوگوں کا ہجوم اور دن کی تیز روشنی درختوں اور پودوں کو نڈھال کر دیتی ہے..... اور پھر کل صبح مجھے یاد آیا کہ موسم کی حدت بڑھتی جاتی ہے۔ چند دنوں میں بہار مرجھا جائے گی اور میں اس دوران ایک مرتبہ بھی باغ میں نہیں گیا۔ چنانچہ میں نے "سیر کا لباس" یعنی جاگرز اور ٹریک سوٹ پہنا اور.....

میں ایک عرصے کے بعد منہ اندھیرے جناح باغ میں داخل ہو رہا تھا۔

نیم تاریک راستوں پر قدیم درختوں کے سائے میں مَیں آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جسم کو اب بھاگنے کی عادت نہیں رہی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لے کر اس تازہ اور نم ہوا کو اپنے اندر کھینچا جس کے لیے میں ترس گیا تھا۔ تب باغ میں رہنے والا ایک کردار میرے قریب سے گزرا۔ ان صاحب کا نام پتہ نہیں تھا۔ دُبلے پتلے، چھوٹے قد کے اور ہمیشہ نیکر پہنے ہوتے۔ میں نے انہیں ہمیشہ بھاگتے ہوئے ہی دیکھا۔ بڑی خواہش تھی کہ ان حضرت کو کبھی ایک مقام پر کھڑا دیکھوں لیکن ہمیشہ یہی ہوا کہ یا تو سامنے سے بھاگتے ہوئے آئے اور اپنے آپ میں گم چلے گئے اور یا پیچھے سے ان کے قدم سنائی دیتے اور وہ ایک متعین رفتار سے سر ہلاتے ہوئے بھاگتے ہوئے تاریکی میں گم ہو گئے۔ انہیں عرفِ عام میں "جھنجھیری" کہا جاتا تھا۔ چنانچہ جب کبھی نظر نہ آتے تو کہا جاتا کہ خدا خیر کرے آج جھنجھیری نہیں آیا۔ اس کے بغیر باغ مکمل نہیں ہوتا۔ آج بھی وہ پچھلے کئی برسوں کی طرح اپنے آپ میں گم میرے قریب سے گزر گئے۔

جب میں جمخانہ گراؤنڈ کے قریب سے گزرا تو دور سے مثنوی مولانا روم کے اشعار ایک مترنم آواز میں بکھرتے سمٹتے میرے کانوں تک پہنچے۔ میں بے اختیار ان شعروں کی سمت روانہ ہوا۔ وہاں میر صاحب اپنے متناسب ڈیل ڈول کے ساتھ اچھلتے نظر آئے۔ میر صاحب محکمہ ٹیلی فون کے ریٹائرڈ کچھ ہیں۔ ظاہر ہے ساٹھ سے اوپر کے ہیں۔ روزانہ دس بارہ میل چلتے ہیں۔ سینکڑوں بیٹھکیں لگاتے ہیں۔ تمام عرصہ اپنے پاؤں پر ربڑ کے گیندوں کی طرح اچھلتے رہتے

ہیں اور بلند آواز سے علامہ اقبال اور مولانا روم کے فارسی شعر اتنی خوبصورتی سے پڑھتے ہیں کہ اگر درخت جھوم سکتے تو ضرور جھومتے۔ موصوف شاعری سے تو بے بہرہ نہیں لیکن کانوں سے بالکل بہرے ہیں اس لیے ان سے گفتگو اس طرح ہوتی: "میں صدقے تارڑ صاحب! اتنا عرصہ کہاں رہے ہو بھئی۔ یار آ جایا کرو فقیروں کا دل بہلا رہتا ہے۔ بال بچے کیسے ہیں، صحت کیسی ہے۔ آؤ پھر لگے دوڑیں۔ نہیں! ڈنڈ نکالتے ہیں۔ نہیں! تو اللہ تعالیٰ آپ کو راضی رکھے، اللہ خوش رکھے میں دو چار چکر لگا کر ابھی آتا ہوں....."

میر صاحب یقیناً رونقی آدمی ہیں۔ میں نے انہیں جب بھی دیکھا اچھلتے دیکھا، بھاگتے دیکھا، مسکراتے اور دعائیں دیتے دیکھا..... اُن سے بعد میں ملنے کا وعدہ کر کے میں آگے بڑھ گیا۔ اب مجھے اس درخت کا انتظار تھا جہاں حضرت چمگادڑ پائے جاتے تھے اور وہ وہاں پائے گئے۔ درخت کی ایک بڑی سی ٹہنی کو ٹانگوں میں پروئے وہ حسبِ معمول الٹے لٹکے ہوئے تھے اور باغ کا نظارہ کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے گردن سیدھی کی، مسکرائے اور پھر جھولنے میں گم ہو گئے۔ میں اُن کا نام نہیں جانتا لیکن باغ کے دیگر رہنے والے انہیں حضرت چمگادڑ ہی کہتے ہیں اور ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ باغ میں آنے والے کچھ تو اپنی الگ حیثیت میں پہچانے جاتے ہیں اور کچھ ہمیشہ گروہ یا منڈلی کی صورت میں چلتے ہیں۔ مثلاً ایک شاہ عالمی اور اعظم مارکیٹ کی منڈلی ہے۔ موٹے موٹے حضرات تیز تیز چلتے ہوئے اور تازہ ترین کاروباری صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے۔ آپ اگر ان کے نواح میں چل رہے ہوں تو کچھ اس قسم کی گفتگو سنائی دے گی: "شیخ صاحب! وہ چونگی والے پیسے نہیں آئے۔ خواجہ صاحب اُس نکمے مال کا کیا بنا؟ سات روپے کچھ آنے لگانے ہیں تو پانچ سو تھان بھیج دو..... نہ نہ سات روپے سات آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں اس گروپ سے قابلِ فہم طور پر قدرے دور ہی رہتا تھا۔

ایک سیاسی منڈلی ہے جس میں مجلسِ شوریٰ کے ممبر، کونسلر اور پرانے سیاستدان شامل ہیں۔ چلتے جاتے ہیں اور ایک دوسرے پر چوٹیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک "پہلوان گروپ"

ہے۔ جس کے لیڈر ایک بھاری تن و توش کے پہلوان ہیں اور باتیں پہلوانوں ایسی نہیں کرتے بلکہ دنیا کے ہر موضوع پر بے تکان بولتے چلے جاتے ہیں۔ ایک ناشتہ گروپ ہے جو نماز کے بعد کسی چھوٹے سے کھوکھے پر ناشتہ کرتے ہیں اور پھر باغ کا رُخ کرتے ہیں۔ گرمیوں میں کبھی کبھی صبح کو حلوہ پوری اور لسی وغیرہ باغ میں لا کر پارٹی ہوتی ہے۔

پھر کچھ جوڑے ہیں۔ ایک میاں بیوی ہیں موٹے موٹے پرانے ریلوے انجنوں کی طرح چھک چھک کرتے گزر جاتے ہیں۔ پتہ نہیں اتنے برسوں کی سیر کے باوجود ان کا وزن کم کیوں نہیں ہوا۔ ایک گھڑی ساز بھی ہیں جو چودھری صاحب کے گروپ کے ممبر ہیں۔ چودھری صاحب وکیل ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ بہترین یوگا ماسٹر ہیں۔ ایسی ایسی حالتوں میں معلق ہو جاتے ہیں کہ یقین نہیں آتا۔ گھڑی ساز ہمیشہ اپنے پیشے کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں۔ مثلاً جناب تارڑ صاحب آپ کی کلائی پر سٹریپ کا نشان ہے۔ سٹریپ بدل دیں ورنہ دورانِ خون میں گڑبڑ ہو گی۔ واپڈا کی بلڈنگ کا بڑا کلاک ایک مرتبہ خراب ہو گیا۔ جاپانیوں نے تو گھڑیوں کی صنعت کا بیڑہ غرق کر دیا ہے...... وغیرہ وغیرہ ..... یوگا کے حوالے سے یاد آیا کہ ان دنوں روزانہ ایک صاحب کے قریب سے گزر ہوتا تھا۔ جو سر کے بل بڑے مزے سے کھڑے ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ قریب جا کر غور سے دیکھا تو حضرت عبدالعزیز خالد تھے۔ پتہ نہیں وہ اس حالت میں شعر بھی کہہ رہے تھے یا نہیں......

باغ کے مختلف بنچ اور کونے بھی مختلف کرداروں اور گروہوں کے لئے مخصوص ہیں۔ شروع شروع میں سیر کے بعد میں کسی بھی بنچ پر بیٹھ کر سستانے لگتا۔ لیکن ایک اور صاحب بھاگتے ہوئے آ گئے۔ بنچ پر مجھے بیٹھا دیکھ کر قدرے پریشان ہوئے اور میرے ارد گرد منڈلانے لگے اور خاصی دیر تک منڈلاتے رہے۔

باغ کے ایک حصے میں کبھی گورنمنٹ کالج کا ایک بوٹانیکل گارڈن ہوا کرتا تھا۔ یہ حصہ میرا پسندیدہ ہے۔ کیونکہ یہاں لوگ بہت کم آتے ہیں۔ دو تین پرانے تالاب ہیں۔ جن میں کنول

ہے اور ایک پرانا لوہے کا بنا ہوا گرین ہاؤس ہے۔ جس پر بہت ہی کوئی جنگلی قسم کی بیل چھائی ہوئی ہے۔ اس گرین ہاؤس کے اندر چلے جائیں تو برازیل کے جنگلوں ایسی گھنی اور سبز خاموشی کا احساس ہوتا۔

میں آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ لوگ گزرتے رہے۔ پھر درخت پودے اور جھاڑیاں صبح کی ہلکی روشنی میں ظاہر ہونے لگے۔ پہلے وہ نیم تاریک جنگل تھے اور اب اُن کی علیحدہ علیحدہ پہچان اور شناخت سامنے آنے لگی۔ باغ میں رہنے والے لوگ بھی پہلے باغ کا ایک حصہ تھے۔ پرندوں اور ٹہنیوں کی طرح۔ اور اب بھی وہ الگ الگ چہرے ہو گئے۔ یہ وہ وقت تھا۔ جب میں باغ کو چھوڑ دیا کرتا تھا۔ میں باہر جانے والے گیٹ کی طرف چلنے لگا۔ گلابوں کے قطعہ کے اُوپر دھوپ اتر رہی تھی اور بنچ پر تین بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے۔ جن کے لئے گھر بڑھاپا تھا اور باہر زندگی.... بُدھا کے کانٹوں سے بھرے ہوئے شاندار درخت کے نیچے ایک لڑکی جھکی ہوئی کچھ تلاش کر رہی تھی۔ پتہ نہیں اس کا کیا گم ہو گیا تھا۔

میں گیٹ سے نکل کر شہر کی سڑک پر آیا تو وہاں ٹریفک کے شور کا اژدہا میرا منتظر تھا۔ میرا موٹر سائیکل اس اژدہے کے شور اور اعصاب شکن جسم کا ایک حصہ بن گیا۔ میں ایک سر سبز خواب سے الگ ہوا اور حقیقت کی دنیا میں گم ہوا۔ کاریں، سکوٹر، ویگنیں، ٹرک، تیز سیٹیاں اور شور... ... زندگی کا شور۔

"ابابیلیں گوالمنڈی میں"

ہم سب اس سرائے میں جو کہ دنیا ہے اپنے اپنے کارواں سے کر اترتے ہیں اس میں قیام کرتے ہیں۔ قیام کی مدت ہمارے بس میں نہیں ہوتی۔ اس کا اختیار اُوپر والے کے پاس ہوتا ہے۔ کئی آتے ہیں، سرائے کے دروازے میں داخل ہوتے ہیں اور لوٹ جاتے ہیں۔ کچھ داخل ہو کر اس کے مکینوں سے ربط بڑھاتے ہیں تو اسی وقت بلاوا آجاتا ہے۔ بیشتر ایسے ہوتے ہیں جو آتے ہیں اور قیام کے اتنے سامان لے کر آتے ہیں کہ ساری کاروان سرائے ان کے رعب اور دبدبے سے مرعوب ہوتی ہے۔ وہ سامان سو برسوں کا لاتے ہیں مگر پل بھر میں چلے جاتے ہیں۔ کئی مسافر اگر بستر کھولتے ہیں اور ان کو یقین ہوتا ہے کہ وہ تمام شب آرام کریں گے، لیکن نصف شب بلاوا آتا ہے اور ان کو اُٹھنا پڑتا ہے۔ خوش قسمت وہ ہوتے ہیں جو اگر اپنا قیام مکمل کرتے ہیں۔ اس دوران اپنے بلاوے کو یاد رکھتے ہیں۔ دوسرے مسافروں کا دکھ درد بانٹتے ہیں اور جب وقت آتا ہے تو تیار ہوتے ہیں، اُٹھتے ہیں اور مسکراتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ نہ چہرے پر رنج نہ ملال۔ وہ اس کی مرضی کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور رخصت ہو جاتے ہیں۔

ہر شخص ایک کاروان ہوتا ہے۔ جس میں دکھ سکھ اور کامیابی کے ساتھی ساتھ آتے ہیں۔ کچھ لوگ پورے قیام کے دوران دکھ کی رفاقت ہی میں جیتے رہتے ہیں۔ کوئی محرومی کے پاس وقت گزارتا ہے اور کوئی سکھ اور کامیابی کے قریب رہتا ہے لیکن بلاوا آنے پر سب کو جانا ہوتا ہے۔

سرائے میں قیام کا ایک اور سال مکمل ہوا اور اب اس کے دروازے پر نئے سال کی دستک ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ مکین کم ہوئے جنہیں ہم جانتے تھے۔ جن کے دم سے ہماری رونقیں

تھیں، ہم ان کا سوگ مناتے ہیں..... اس میں نئے مکین بھی آگئے جن کے دم سے کل رونقیں ہوں گی۔ ہم انہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ کوئی سال نیا یا پرانا نہیں ہوتا۔ ان دکھ پرانے ہو جاتے ہیں، بہار قدیم ہو جاتی ہے۔ سورج مکھی کے پھول کھلے رہتے ہیں لیکن ان کا رُخ ہماری جانب نہیں ہوتا..... اور سکھ نئے ہوتے ہیں اُوپر والے کی عطا کردہ نعمتوں کے سکھ..... روشنی، ہوا، پانی [illegible]..... اور بارش..... اور پرندے......

پرانے سال کے آخری دنوں ایک روز بچہ پان فروش میری دکان میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک پرندہ تھا۔

"باؤجی یہ کون سا پرندہ ہے؟"

پرندہ معصوم تھا، خوبصورت تھا اور ڈرا ہوا تھا۔

"تم اسے کہاں سے پکڑ لائے ہو؟"

"باؤجی باہر تو دیکھو..... پوری گوالمنڈی میں یہ پرندے آئے ہوئے ہیں۔"

"گوالمنڈی میں پرندے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"آپ ہر وقت سر جھکائے کاغذوں کو دیکھتے رہتے ہو کبھی باہر بھی دیکھا کرو..... باہر پرندے ہیں۔" میں باہر آیا تو دم بخود رہ گیا۔ بچہ سچ کہتا تھا۔ گوالمنڈی کے بازار میں سینکڑوں پرندے اُڑ رہے تھے۔ وہ دکانوں کے چھجوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سڑک پر بہتے گندے پانی پر اڑانیں کر رہے تھے..... یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی سدا بہار سرسبز اور گھنے جنگل میں ہیں۔ ان کو آس پاس کی گندگی اور گھٹن کا احساس تک نہ تھا اور وہ سینکڑوں کی تعداد میں تھے..... اور میں ان کا نام نہیں جانتا تھا۔ بھولا ہریسی والا ہمیں وہاں کھڑے دیکھ کر مسکراتا ہوا آگیا۔

"اوئے چھوڑ دے اس معصوم کو پرندوں کو پکڑتے نہیں..... چھوڑ دے۔"

بچے نے پرندے کے پروں کو ایک بوسہ دیا اور ہوا میں اچھال دیا۔

میں ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ "نہیں بچے مجھے ان پرندوں کے نام کا علم نہیں۔"

"میں بتاؤں باؤ جی!" بھولے نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ بھی ابابیلیں ہیں۔"

"ابابیلیں! گوالمنڈی میں! اور سینکڑوں کی تعداد میں؟"

"ہاں باؤ جی یہ ہر سال انہی دنوں میں آتی ہیں اور سنا ہے کہ خوش قسمتی لاتی ہیں۔ آپ نے انہیں پچھلے سال نہیں دیکھا تھا؟" "نہیں بھولے میں کاغذوں پر سر جھکائے بیٹھا رہتا ہوں اوپر نہیں دیکھتا....."

"باہر دیکھا کرو جی" بھولا اپنی ریڑھی پر کھڑے کسی گاہک کو بھگتانے چلا گیا۔ [illegible] چلا گیا اور میں حیرت سے ابابیلوں کو دیکھنے لگا..... ہاں وہ یقیناً ابابیلیں ہی تھیں..... مجھے وہ اطالوی لوک گیت یاد آگیا جس کے بول یہ ہیں:-

جب موسم بہار میں ابابیلوں کی ڈاریں
جب تم میرے پاس لوٹ آؤ گے،
کیپس ترانو کے ساحل کو واپس لوٹیں گی!

یہ وہی دن ہو گا.....

میں ابابیلوں کو اطالیہ، لبنان اور ایران میں تلاش کرتا رہا اور وہ یہاں تھیں، اپنے پاکستان میں یہاں گوالمنڈی میں اس کی چھتوں اور ممٹیوں پر پرواز کرتی ہوئیں سینکڑوں کی تعداد میں اور میں انہیں پہچان نہ سکا تھا اس لئے کہ میں اپنے کاغذوں سے سر اٹھا کر باہر نہیں دیکھتا تھا تو اپنے ملک سے باہر دیکھتا تھا..... وہ ہر سال گوالمنڈی میں آتی تھیں اور میں اپنے آپ میں مگن رہا..... میرا خیال تھا کہ وہ صرف اطالیہ میں کیپس ترانو کے قصبے میں ہی اترتی ہیں لیکن وہ میرے آنگن میں بھی آتی تھیں۔ صرف میرا دھیان نہیں جاتا تھا۔ کاروان سرائے میں قیام کرنے والے بیشتر مسافر میری طرح ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مختصر قیام کے دوران سر اٹھا کر سوہنے رب کی قدرت نہیں دیکھتے ورنہ خوش قسمتی کی علامت اور نیا سال مبارک کہنے کے لئے آنگنوں میں ابابیلیں اترتی ہیں۔ ہیپی نیو ایئر کہنے کے لئے۔

"سکھ آئے ہوئے ہیں"

میرے والد صاحب کا کہنا ہے کہ ایک زمانے میں ان کو یہ زعم تھا کہ دوسرے جاٹوں کی طرح کم از کم تارڑ جاٹ سکھوں سے مسلمان نہیں ہوئے بلکہ وہ کچھ اور تھے (پتہ نہیں کیا تھے) لیکن ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوا۔ اور یہ کوئی پچاس برس پیشتر کا قصہ ہے کہ ایک نہایت گرانڈیل قسم کا بوڑھا سکھ ان کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ پتر تیرا نام کیا ہے..... رحمت خان ہے؟ والد صاحب نے کہا کہ جی ہاں یہی میرا نام ہے — بوڑھے سکھ نے قریب ہو کر پوچھا، تارڑ ہو؟ انہوں نے سر ہلا کر اقرار کیا کہ بے شک تارڑ ہوں۔ اس پر سکھ بزرگ بے حد مسرور ہو کر بولے، تو پھر اٹھو اور مجھ سے گلے مل، میں بھی تارڑ ہوں..... والد صاحب اس واقعے کے بعد، خاصی مدت تک اپ سیٹ رہے کہ سکھ بھی تارڑ ہوتے ہیں۔

اب خدا کا کرنا کیا ہوا اور یہ کوئی تین چار دن پہلے کا قصہ ہے کہ میں آرٹس کونسل کے ہال میں ایک کتاب کی رونمائی کے سلسلے میں ہونے والی طویل تقاریر سنتے اونگھ رہا تھا کہ کہیں سے ایک سکھ وارد ہو گیا۔ سیدھا میرے پاس آیا اور کہنے لگا، بھائی جی، آپ مستنصر حسین تارڑ ہو؟ میں نے اقرار کیا تو بولا۔ پھر اٹھو اور مجھ سے گلے ملو..... ابھی ایک کھسیانی سی مسکراہٹ میرے لبوں پر تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اٹھوں یا نہ اٹھوں، تو اس سکھ نے مجھے دبوچ کر گلے لگایا اور کہنے لگا، بھائی جی مجھے آپ کی فلاں کتاب بے حد پسند ہے..... مجھے اگرچہ اس کے یوں گلے لگا لینے پر بھی اعتراض نہ تھا۔ لیکن ایک سکھ کا مجھے بھائی کہنا بھی مجھے اپ سیٹ کر رہا تھا..... میں نے ایک مناسب وقفے کے بعد ان کی گرفت

سے علیحدہ ہونے کی کوشش کی اور میں اس کوشش میں کامیاب ہونے کو تھا کہ انہوں نے ابھی دل نہیں بھرا بھائی جی کہہ کر مجھے پھر اپنی باریش آغوش میں لے لیا...... میں نے ان کی پگڑی کے اوپر سے جائزہ لیا تو بیشتر سامعین مقرر کی تقریر سننے کی بجائے اس بغلگیری سے لطف اندوز ہو رہے تھے...... بہرحال میں نے بڑی مشکل سے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ فی الحال میرے ساتھ والی نشست پر تشریف رکھیں اور فنکشن کے اختتام تک اس بغلگیری کو ملتوی کر دیں. یہ رندھیر سنگھ چاند تھے جو مشرقی پنجاب کی کسی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور پنجابی میں ڈاکٹریٹ کے علاوہ فارسی میں بھی ایم اے کی سند رکھتے ہیں.

اور چاند صاحب واحد سکھ نہیں ہیں جو لاہور کی سڑکوں پر آوارہ ہو رہے ہیں. ان دنوں ہر جانب سردار اور سردارنیاں اور ان کے بچے (وہ بھی سکھ ہوتے ہیں) انارکلی، مال روڈ اور شاہ عالم مارکیٹ میں گھومتے نظر آتے ہیں. ان کی آنکھوں میں وہی حیرت ہوتی ہے جو لندن کو پہلی مرتبہ دیکھتے ہوئے میری آنکھوں میں تھی. ان کا بس نہیں چلتا ورنہ وہ پورے لاہور کے بازار اور مارکیٹ خالی کر دیں. واٹر کولر، خواتین کے سوٹ، گھڑیاں، ریڈیو، میک اپ کا سامان. غرض کہ وہ ہر شے خرید رہے ہیں. اگلے روز میں اپنے قریبی سٹور پر گھریلو ضروریات کی چند اشیا خریدنے کے لیے گیا تو دکاندار نے کہا کہ فلاں صابن تو نہیں ہے. میں نے پوچھا کیوں نہیں ہے؟ کہنے لگا جناب سکھ آئے ہوئے ہیں. میں نے سوچا یہاں اگر وہ اشنان وغیرہ کرتے ہیں تو اس کے لئے درکار ہوتا ہے لیکن معلوم ہوا کہ نہیں. پاکستان ٹیلیویژن پر جتنے صابن، پاؤڈر اور دیگر اشیاء کے اشتہار چلتے ہیں، وہ سب سکھوں کے فیورٹ ہیں اور ان کی آمد پر پورے لاہور میں ان کا سٹاک ختم ہو جاتا ہے.

بیڈن روڈ پر ایک سکھ خاندان سے ملاقات ہوئی جو فوم کے گدے سر پر اٹھائے چلا جا رہا تھا. میں نے پوچھا ہندوستان میں نہیں ملتے؟ سردار صاحب کہنے لگے، ملتے ہیں پر ودیا نہیں ملتے...... سردارنی نے گدے کے علاوہ پاکستانی کپڑوں کا ایک پلندہ اٹھا

رکھا تھا. بچوں نے پاکستانی جینیں پہن رکھی تھیں اور آئس کریم کھا رہے تھے. دو تین برس پیشتر ایک کرکٹ میچ کے موقع پر ایک ہندو صحافی لاہور آئے اور مجھ سے ملنے کے لئے بھی آگئے. تھوڑی دیر کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں تو نہایت فراخدلی سے اپنے ملک کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا لیکن موصوف نہایت احتیاط پسند تھے اور ہندوستان کو دنیا کا بہترین ملک ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے. اس پر مجھے بھی تاؤ آگیا اور میں نے تمام تر لبرل ازم بالائے طاق رکھ کر ان سے سوال و جواب شروع کر دیئے. دورانِ گفتگو ان کی تان اسی بات پر ٹوٹی کہ جناب آپ تو سوئی جیسی چھوٹی سے بھی درآمد کرتے ہیں اور ہم ہوائی جہاز اور ٹینک بنا رہے ہیں. تھوڑی دیر بعد ان کی دھرم پتنی جو اب تک خاموش بیٹھی تھیں کہنے لگیں ہاں ہوائی جہاز تو بن رہے ہیں ہمارے ملک میں شرما جی ساٹن کریپ بنتی ہے؟ واٹر کولر بنتے ہیں؟...... لاہور والے تو لگتا ہے شہزادے ہیں. اچھا کھاتے ہیں، اچھا پہنتے ہیں بھوکنا ہے ہوائی جہازوں کو...... لوگ سکھی ہونے چاہئیں اور لوگ پاکستان میں سکھی ہیں...... اس پر شرما جی شرمندہ ہو گئے اور کہنے لگے. چلیے پھر ہمارے ساتھ چل کر کچھ شاپنگ ہی کرا دیجئے. سارے محلے کی فرمائشیں ہیں.

سکھ حضرات جو پاکستان آتے ہیں اس معاملے میں بہت کھرے اور سیدھے سادے ہیں. وہ کہتے ہیں کہ جناب لاہور آنے کے لئے جن کا نام نکل آئے اسے محلے والے آ کر مبارکیں دیتے ہیں. انڈیا میں کیلے بہت ہیں، پان بہت ہیں، کھدر بہت عمدہ ہے. لیکن جس شے پر میڈ ان پاکستان لکھا ہوا اسے باقاعدہ ڈس پلے کیا جاتا ہے. وہ لاہور پہنچتے ہی انارکلی دیکھنے کی خواہش کرتے ہیں. جس طرح پیرس پہنچنے پر لوگ سیدھے شانزے لیزے کا رخ کرتے ہیں. ہمارے ٹیلی ویژن کا ان کی نئی نسل پر اتنا اثر ہے کہ وہ ہمارے نیوز کاسٹروں اور اداکاروں کی طرح خالص اردو بولنے کی کوشش کرتے ہیں. ٹیلی ویژن کے اداکاروں کو ملنے کے چاؤ میں غیر قانونی طور پر سرحد عبور کرنے سے بھی باز نہیں آتے. چنانچہ امرتسر ٹیلی ویژن کے

آغاز پر جو ثقافتی یلغار کا غلغلہ اُٹھا تھا۔ اب حالت یہ ہے کہ ہمارے ڈراموں کی کیسٹیں بلیک میں فروخت ہوتی ہیں...... یہ نہیں کہ بھارت پاکستان کے مقابلے میں بالکل ہی گیا گزرا ہے۔ ٹھیک ہے انہوں نے بھی اپنے لیئے بہت کچھ کیا ہے لیکن ایک مدت کے بعد ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ بھارتی اب پاکستان کو رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور سکھ پاکستانی حکومت سے بے حد خوش ہیں کہ انہیں پاکستان آنے کے لیئے بے شمار سہولتیں دی جا رہی ہیں۔

بہر حال میں تو آرٹس کونسل کی اس تقریب کا تذکرہ کر رہا تھا جس میں ایک سکھ ندیم سنگھ چاند صاحب میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس دوران وہ کنول مشتاق کے ساتھ کھسر پھسر کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد پھر اُٹھے اور کہنے لگے۔ تارڑ صاحب اُٹھو اور مجھے گلے ملو۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک مرتبہ پھر انہوں نے مجھے دبوچ لیا۔ سنا تھا کہ جٹ کا جپھا بڑا سخت ہوتا ہے لیکن یہاں تو جپھا سکھ کا تھا جو بہت ہی شدید تھا۔ بہر حال فارغ ہو کر کہنے لگے۔ مجھے تو اب پتہ چلا ہے کہ فلاں ٹی وی سیریل آپ کی لکھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد بیٹھ گئے کچھ لمحوں بعد یکدم رخِ روشن میری جانب کیا اور خوش ہو کر کہنے لگے اوہو، مجھے تو ابھی ابھی کنول نے بتایا ہے کہ آپ نے فلاں ڈرامے میں تو اداکاری بھی کی تھی اور وہ ڈرامہ مجھے...... اٹھو اور مجھے گلے ملو...... ہم اب تک اتنی مرتبہ بغلگیر ہو چکے تھے کہ ہال میں کوئی خاتون اعتراض بھی کر سکتی تھیں۔ بہر حال مجبوری تھی۔ اس لیے کہ ایک نیم دلانہ قسم کا جپھا ڈال کر انہیں بیٹھنے کو کہا اور دل میں تہیہ کر لیا کہ اب نہیں اُٹھوں گا۔ ابھی چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ چاند صاحب اپنی نشست سے اُٹھے اور ہاتھ پھیلا کر بولے، اٹھو اور مجھے گلے ملو۔ میں نے کہا چاند صاحب آپ یقیناً بہت اچھے سکھ ہیں۔ جو میری حوصلہ افزائی کی خاطر مجھے بار بار جپھے مارتے ہیں۔ لیکن اب نہیں اُٹھوں گا۔ آپ بتائیے کہ بات کیا ہے۔ کہنے لگے۔ میں گوردوارے واپس جا رہا ہوں چنانچہ سردست مجھے بغلگیر ہونا پڑا۔ میں نے پوچھا، سیدھے گوردوارے واپس جا رہے ہیں؟ کہنے لگے، نہیں پہلے انارکلی سے واٹر کولر خریدوں گا کیونکہ ہمارے ہاں اب یہ کہا جاتا ہے کہ کیس، کچھ، کڑا، کرپان کے علاوہ

اِن سکھ کی پہچان کولر بھی ہے اور میں ایک مکمل سکھ بن کر واپس جانا چاہتا ہوں۔ واٹر کولر کا استعمال تو سمجھ میں آتا ہے۔ یعنی خاص طور پر ان دنوں سکھ حضرات قوم کے لیے کولر خرید رہے ہیں...... شاید اس لیے کہ آج کل ان کے لیے وہاں زمین سخت ہو رہی ہے۔

"لوٹ مارسیل"

اس شام میں گھر پہنچا تو بیگم ایک انتہائی شاندار کامدار ساڑھی میں ملبوس کندھوں ایک نئی شال ڈالے ڈرائنگ روم میں بیٹھی اور اس کے سامنے میز پر کاغذی اور مومی لفافوں کا ایک ڈھیر تھا۔ بچے کرسیوں پر براجمان تھے۔ اور نئے سویٹروں اور پتلونوں میں ملبوس تھے۔ میں شدید حیرتوں میں گم ہوا کہ کہاں تو ایک پتلون خریدنے کے لئے کئی ماہ کی منصوبہ بندی درکار ہوتی ہے اور کہاں یہ کہ ہر جانب عید کا سماں ہے اور نئے کپڑوں کی اجلی خوشبو ہر سو پھیلی ہے۔

"یہ سویٹر تمہارے لیے۔" بیگم نے میز پر سے ایک لفافہ اٹھا کر اس میں سے ایک دبیز اونی سویٹر نکالا اور اس کی باہوں کو میری باہوں پر پھیلاتے ہوئے کہا۔

"شکریہ! لیکن اب تو موسم گزر نہیں گیا اتنے موٹے سویٹر کے لیے؟" میں نے دریافت کیا....

"اگلے سال کام آجائے گا۔" اس نے کہا۔ "اور اس برس بھی اگر مری میں برف باری ہوگئی تو چند روز تو پہنا جا سکتا ہے۔ تم نے میری ساڑھی کے بارے میں کچھ نہیں....."

"بہت قیمتی لگتی ہے۔" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "کتنے کی ہے؟"

"اور یہ شال کیسی ہے؟" بیگم نے اپنی شال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور کچھ پیار کی نظروں سے میری جانب دیکھا۔

"یہ بھی قیمتی لگتی ہے۔" میں مزید ہکلایا۔ "کتنے کی ہے؟"

"تم نے بچوں کے سویٹر نہیں دیکھے، اٹھو بچو! ابو کو سویٹر دکھاؤ۔"

سب بچے اٹھے اور اپنے اپنے سویٹروں کی نمائش کر کے پھر بیٹھ گئے۔

"ڈرائنگ روم کا پردہ کیسا ہے؟" بیگم نے ایک شہزادی کی طرح شاہانہ طریقے سے ہاتھ ہلایا۔ واقعی نیا پردہ تھا اور بہت خوب تھا اور یہاں پھر مجھے پوچھنا پڑا کہ کتنے کا ہے اور بیگم یہ سوال سن کر صرف مسکرائیں کہ اے نادان ایسی بیش بہا اشیا کی قیمتیں پوچھ کر اپنے گھٹیا ذوق کی نمائش کرتا ہے۔

"اور یہ سویٹر بھی تمہارے لئے ہے۔" بیگم نے ایک اور سویٹر لفافے میں سے نکال کر میز پر پھیلا دیا۔

"لیکن بیگم جی یہ کیا ہو رہا ہے.....؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "یہ سویٹر بہت گرم ہیں اور سردیاں ختم ہو چکیں۔ تمہاری ساڑھی خوب ہے تو اس کا بھی کچھ فیشن نہیں۔ یہ پردے بھی پرانے لگ رہے ہیں اور تمہاری شال بھی اتنی گرم اور بھاری ہے کہ اس کے وزن سے تمہارا سانس اکھڑنے کو ہے اور ماتھے پر پسینے کے قطرے ہیں۔ یہ آؤٹ آف فیشن اور سیزن کپڑے خریدنے کا تک کیا ہے؟"

"اس جوتے کے بارے میں کیا خیال ہے؟" بیگم نے میز کے نیچے سے ایک برانڈ نیو جوتا نکالا۔

میں یکدم خوفزدہ ہو گیا کہ شاید یہ جوتا میری جانب پھینکنے کے لئے اٹھایا گیا ہے لیکن معلوم ہوا کہ یہ جوتا میرے لئے تو تھا۔ مجھے واقعی ایک مردانہ جوتے کی اشد ضرورت تھی لیکن یہ والا جوتا میرے سائز سے قدرے بڑا بلکہ خاصا بڑا تھا۔ بنایا عام چنا کے لئے تھا اور شاید وہ اسے پہننے نہیں آیا تو اسے بیگم لے آئیں۔

"کوئی بات نہیں اگلے سال پورا آجائے گا۔" بیگم نے تسلی دی۔

"اگلے سال؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔ "بیگم میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں نے جتنا بڑا

ہونا تھا ہو چکا۔ اب تو میری عینک کا نمبر بڑھا ہو سکتا ہے۔ میری تو نہ بڑھی، ہو سکتی ہے لیکن میں بڑا نہیں ہو سکتا۔ یہ جوتا تو ضائع ہو گیا اور کیا میں پوچھ سکتا ہوں یہ آؤٹ آف فیشن......"

"ایک تو تمہارے لیے اور تمہاری آل اولاد کے لیے اتنی مصیبتوں سے کپڑے خرید کر لائی ہوں اور اوپر سے ناراض ہوتے ہو۔" بیگم نے منہ پھلا لیا۔ "تمہیں پتہ ہے کہ یہ بالکل مفت میں آئے ہیں......"

"مفت میں آئے ہیں تو مجھ سے نہیں۔"

"بالکل مفت میں تو نہیں لیکن تقریباً۔"

"لیکن یہ آئے کہاں سے؟" میں نے تنگ آ کر کہا۔

"سیل۔ سیل کلیرنس سیل......" ایک بچے نے کہا۔

"اصلی لوٹ سیل...... بلکہ لوٹ مار سیل۔" دوسرے نے آواز لگائی۔

"اونے پونے سیل اور یاراں مہینے ساڈے تے ایک مہینہ تو ہاڈا۔" تیسرا بھی بول اٹھا۔

"یہ سارے کپڑے میں نے سیل میں خریدے ہیں۔" بیگم نے ہنس کر اصلاح کی۔ "بالکل سستے اور تقریباً مفت بلکہ دس کلو دیسی گھی بھی لائی ہوں۔ اس کی بھی سیل لگی ہوئی تھی۔ باقی سارا کچھ اگلے سال کام آ جائے گا اور گھی کے پراٹھے کھلاؤں گی تمہیں۔"

یکدم انہیں کچھ یاد آیا۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ بیٹھتے بیٹھتے ڈوبنے لگا اور میں نے بیگم سے کہا۔ "وہ آج صبح میں نے پوری تنخواہ جو تمہیں دی تھی پورے مہینے کا خرچ وہ......"

"بس اسی کا تو یہ سامان آیا ہے۔ اب تم اس ماہ کے لیے کہیں سے خرچ پانی کا بندوبست کر لو۔" بیگم نے کہا۔

"اصلی لوٹ سیل، بلکہ لوٹ مار سیل۔" میں نے ایک صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔ "بیگم اب تو میری سیل لگا دو۔ اگرچہ میں آؤٹ آف فیشن اور آؤٹ آف سیزن ہوں لیکن شاید بک جاؤں۔"

"بوبی بے ایمان ہے"

"بوبی بے ایمان ہے۔"

یہ بیان کسی فلمی اداکارہ کے بارے میں نہیں ہے جس کا نام بوبی ہے اور نہ ہی یہ کسی گیت کا اداس کر دینے والا مکھڑا ہے بلکہ یہاں "بوبی" سے مراد لندن پولیس کا وہ اتنی خوش اخلاق، خوش گفتار اور ایماندار سپاہی ہے۔ جسے انگلستان والے پیار سے "بوبی" پکارتے ہیں۔ تو پھر یہ بوبی بے ایمان کس طرح ہو گئی...... میرا مطلب ہے ہو گیا۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ سابق برطانوی پولیس کمشنر کی زیر قیادت ایک خود مختار تنظیم نے چار سال کی تحقیق کے دوران حاصل ہونے والی شہادتوں پر مبنی رپورٹ میں کہا ہے کہ برطانوی پولیس نسل پرست، شرابی، زانی اور گالی گلوچ کرنے والے افراد پر مشتمل ہے۔ گیارہ سو صفحات پر مبنی اس رپورٹ کی چار جلدیں ہیں لیکن اس کا لب لباب صرف ایک فقرے میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ "بوبی بے ایمان ہے۔"

یہ خبر ان افراد پر بجلی بن کر گرے گی جو بات بے بات پر یورپی اقوام کی ایمانداری اور خوش اخلاقی کے حوالے دیتے ہیں اور اپنے قومی اداروں اور ملکی اخلاقیات پر برستے ہیں۔ اس قسم کے "متاثرینِ مغرب" کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ جب وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے ہیں۔ "اجی ہمارے مقابلے میں کیا قومیں ہیں۔ انگریز کو دیکھیے...... میں ایک مرتبہ پیرس میں جا رہا تھا کہ راستہ بھول گیا...... امریکیوں کی ایسی خوش اخلاقی...... صاحب کا اعتبار کرنا تو وہ جانتے ہیں اور ہم...... بے ایمان، نکمے اور اخلاقیات سے عاری

پاکستانی ......"

ہم دراصل جو غریب غربا قسم کے ملکوں کے باشندے ہیں ایک عرصے کی غلامی کے بعد ابھی تک احساسِ کمتری کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ ادھر ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آتا اور اُدھر سب اچھا ہے۔ ہم میں سے بیشتر "متاثرینِ مغرب" ہیں۔ پاکستانی چیز پر غیر ملکی مہر لگی ہو تو...... واہ واہ سبحان اللہ کیا ڈیزائن ہے۔ کیا میٹریل ہے۔ میں نے تو دور سے ہی دیکھ کر یہ کہہ دیا تھا کہ ولائتی ہے۔ جس شے پر بھی ساختہ پاکستان کی بجائے کسی ایرے غیرے ملک کا نام درج ہو، ہم فوراً مراقبے میں چلے جاتے ہیں اور داد کے ڈونگرے برسانے لگتے ہیں۔ میں ایک ایسے صاحب کو جانتا ہوں جو انگلینڈ سے نہایت قیمتی قسم کے تین ریکٹ خرید لائے تھے اور یہاں آ کر معلوم ہوا کہ پاکستان کے ہی بنے ہوئے ہوئے ہیں۔ مجھے بھارت سے آئے ہوئے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے اور وہ ہماری بیشتر مصنوعات کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں کہ اچھا اچھا آپ کے ہاں تو درآمد کرنے پر پابندی نہیں ہے۔ یہ مال امپورٹڈ ہو گا اور جب انہیں بتایا جاتا ہے کہ یہ کپڑے کے تھان جو آپ بغل میں داب کر لے جا رہے ہیں اور یہ آرائش کا سامان (جن کے نام نہایت ولائتی ہوتے ہیں) اور یہ واٹر کولر وغیرہ سب اس بے چارے پاکستان میں ہی بنتے ہیں تو انہیں بے حد پریشانی ہوتی ہے۔ انہیں تو پریشانی ہونی چاہیئے۔ لیکن اپنے ہاں کے "متاثرینِ مغرب" کو کیا کہیئے گا جو پھر بھی اپنی مصنوعات کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دور سے ہی پتہ چلتا ہے کہ پاکستانی ہے......

میں ایک مرتبہ ولایت سے پاکستان آ رہا تھا چنانچہ شاپنگ کے لئے پکاڈلی سرکس کے قریب واقع ایک فرم "سوان سارینز لمیٹڈ" میں چلا گیا۔ میں نے اپنے خون پسینے کی کمائی بلکہ صرف پسینے کی کمائی سے کیونکہ میں ولایت میں کبھی زخمی نہیں ہوا تھا ایک فرج اور ایک ڈیک کا آرڈر دیا۔ رقم ادا کی اور ان سے رسیدیں حاصل کیں اس وعدے پر کہ وطن

پہنچنے پر مجھے ان اشیاء کے شپنگ ڈاکومنٹ روانہ کر دیئے جائیں گے اور یہ وہاں کا معمول ہے کہ آپ رقم ادا کر کے رسید حاصل کر لیتے ہیں اور خرید کردہ اشیاء آپ کے نام پر شپ کر دی جاتی ہیں۔ چنانچہ میں وطن واپس آ گیا اور یہاں بیٹھ کر شپنگ کے کاغذات کا انتظار کرنے لگا اور تقریباً ایک سال تک کرتا رہا۔ متواتر خطوط روانہ کئے۔ دھمکی آمیز تاریں بھیجیں مگر ادھر سے خاموشی۔ چنانچہ تنگ آ کر اپنی ایک کلاس فیلو لڑکی ایلن کو خط لکھا کہ بی بی یہ حالات ہیں تم ذاتی طور پر اپنے انگریز بھائیوں سے ملو اور کم از کم میری رقم واپس دلا دو۔ اگلے ہفتے میرے نام کا چیک آ گیا۔ ایلن نے خط میں لکھا کہ مجھے تمہاری رقم واپس لینے کے لئے تھوڑی سی غلط بیانی کرنا پڑی تھی جس کے بغیر وہاں کام نہ چلتا اور وہ تھوڑی سی غلط بیانی یہ تھی کہ میں مسٹر تارڑ کی بیوی ہوں، لاؤ میرے خاوند کی رقم۔ بہرحال اللہ بھلا کرے اس نیک بی بی کا اس نے چیک بھیج دیا۔

میں نے یہی چیک جب کیش کروانے کے لئے انگلستان روانہ کیا تو فوری طور پر "باؤنس" ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ اکاؤنٹ میں رقم نہیں ہے۔ بہرحال دوسری مرتبہ انگلستان جانے کا اتفاق ہوا تو میں کھولتا ہوا "سوان سارینز لمیٹڈ" کے دفتر جا پہنچا اور رسیدیں اور چیک وغیرہ ان کے سامنے رکھ کر اپنی رقم کا مطالبہ کیا۔ اس پر ڈائریکٹر صاحب مسکرائے اور کہنے لگے۔ "میں بے حد شرمندہ ہوں تارڑ صاحب لیکن جس فرم کے ساتھ آپ نے کاروبار کیا اس کا نام "سوان سارینز لمیٹڈ" تھا جسے آفیشل لیکوڈیٹر دیوالیہ قرار دے چکے ہیں۔ اب اس فرم کا نام "سوان برادرز لمیٹڈ" ہے۔ میں نے مزید کھولتے ہوئے کہا کہ جناب آپ ہی تو ڈائریکٹر تھے جنہوں نے مجھ سے رقم وصول کی تھی۔ انہوں نے میری بدتمیزی کا بالکل برا نہ مانا اور انگریزی اخلاقیات کا عمدہ مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ جناب آپ درست کہتے ہیں لیکن برطانوی قانون کے مطابق وہ فرم دیوالیہ ہو چکی اس لئے آپ اپنی رقم کا پانچ فیصد حصہ عدالت سے رجوع کر کے حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم "سوان سارینز" کی بجائے "سوان برادرز" ہیں جو بالکل مختلف

فرم ہے۔ البتہ میں وہی ہوں آپ کا خادم..... فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں، کوئی فرج یا ڈیک وغیرہ خریدنا ہو تو حکم دیجئے..... میں اسی طرح کھولا اٹھتا ہوں جب کوئی شخص انگریزوں کی عمدہ اخلاقیات کے بارے میں مجھے درس دیتا ہے۔ تو جناب آئندہ اگر کوئی صاحب آپ کو انگریز اور یورپی اخلاقیات کے بارے میں لیکچر دیں تو انہیں میرے پاس بھیج دیجئے گا۔ میرے پاس اور بھی بے شمار کہانیاں ہیں..... یورپ ہم سے زیادہ ایماندار نہیں ہے۔

"جانی جوکر اور پاکستان"

استنبول کے ایک قہوہ خانے میں میری ملاقات جانی جوکر سے ہو گئی۔ وہ پچھلے دو گھنٹے سے کرسی پر بیٹھا انگلیاں چٹخا رہا تھا۔ اور میز پر رکھی چینی چاٹ رہا تھا کیونکہ وہ بالکل "پھانک" تھا اور چائے پینے کے لئے اس کی جیب میں پیسے نہ تھے۔ چنانچہ میں نے اس کی سفید رنگت سے مرعوب ہو کر اسے اپنی میز پر مدعو کر لیا اور اس کے لئے چائے منگالی جانی جوکر ایک انگریز ہپی تھا۔ چائے کے دو کپ چڑھانے کے بعد وہ ترنگ میں آ گیا اور کہنے لگا، کہاں کے ہو؟ میں نے کہا، پاکستان' اس پر وہ مسکرا کر بولا، جنت' میں نے پوچھا کونسی جنت، کہاں کی جنت۔ کہنے لگا، پاکستان جنت ہے..... میں نے کہا کہ اے بھائی ہپی کہاں کی بات کرتے ہو۔ پاکستان کہاں کی جنت ہے نہایت فضول سا ملک ہے، پس ماندہ غلیظ اور بہت ہی بیہودہ، کیا بات کرتے ہو۔ اس پر جانی جوکر مسکرایا اور بولا، میں تمہارے ملک ہی کی بات کرتا ہوں۔ تم جنت میں رہتے ہو۔ میں اس کی اس بات پر بگڑا کہ یہ کیا کہتا ہے۔ کیوں میرے ملک کو جنت بتاتا ہے؟ تب مجھ پر کھلا کہ یہ مرد غلیظ ہپی ہے اور وہاں چونکہ چرس وغیرہ دستیاب ہو جاتی ہے اس لئے میرے ملک کو جنت ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے۔ چنانچہ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ "تمہارے لئے تو وہ جنت ہی ہے کیونکہ وہاں چرس آسانی سے مل جاتی ہے" اس پر اس نے سر ہلایا اور بولا۔ "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، میں چرس نہیں پیتا۔" میں اب مزید جھلایا کہ کیسا ہپی ہے چرس نہیں پیتا۔ ضرور اس کے دماغ میں فتور ہے، جو پاکستان کو جنت کہتا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ بھئی تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میں پاکستانی ہوں اور پاکستان ہرگز جنت نہیں ہے۔ اس پر وہ مسکراتے ہوئے مراقبے میں چلا گیا۔ جب

سر اُٹھایا تو کہنے لگا کہ اگر میں ثابت کر دوں کہ پاکستان واقعی جنت ہے تو پھر۔ مجھے چونکہ معلوم تھا کہ یہ بات تو ہمارے بڑے بڑے لیڈر ثابت نہیں کر سکے تو یہ غلیظ ہپی کیسے کرے گا۔ چنانچہ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ میں چائے کے ساتھ تمہیں کیک بسکٹ بھی کھلاؤں گا۔ کیک بسکٹ کا نام سن کر وہ چوکنا ہوا اور بولا۔ اچھا غور سے سنو۔ میں ایک برس تک لاہور کے بھاٹی دروازے کے اندر رہا ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہارے ملک میں سیب، کیلا، انار، امرود، مالٹے، انگور، شہتوت، جامن، آم وغیرہ ہوتے ہیں؟

میں نے کہا "ہوتے ہیں، پھر کیا ہوا؟"

کہنے لگا انگلینڈ میں نہیں ہوتے..... صرف سیب ہوتے ہیں وہ بھی کھٹے..... تمہارے ملک میں گندم، مکئی، گنا وغیرہ ہوتے ہیں؟

میں نے کہا "ہاں وہ بھی ہوتے ہیں مگر....."

کہنے لگا ہم اپنی ساری خوراک درآمد کرتے ہیں..... ولایت میں سوائے چند آلوؤں کے اور کچھ نہیں ہوتا..... کیلے ویسٹ انڈیز سے آتے ہیں۔ انار قبرص سے، مالٹے اردن اور اسرائیل سے، انگور سپانیہ سے.....

میں نے کہا ٹھیک ہے، لیکن تمہارے ہاں گوشت بہت عمدہ ہوتا ہے۔

وہ بولا۔ وہ بھی ارجنٹائن، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سے آتا ہے۔ بلکہ سارے یورپ کا وہیں سے آتا ہے۔ تمہارے ہاں تو میں نے بٹیر، مرغابیاں اور کبوتر بھی کھائے ہیں۔ یہ قدرے سٹپٹایا اور بولا۔ درست ہے کہ ہمارے ہاں خوراک بہت ہے لیکن موسم..... اتنی گرمی ہوتی ہے کہ تم روسٹ ہو جاؤ.....

جانی جوکر اپنی غلیظ ہنسی ہنسا۔ پاکستان میں ولایت کی طرح ایک موسم نہیں ہوتا۔ وہاں موسم ہوتے ہیں۔ کتنے روز شدید گرمی ہوتی ہے؟ پھر وہاں کی برسات اور موسم بہار۔ وہاں

جو پھول کھلتے ہیں۔ ان میں خوشبو ہوتی ہے۔ کیا تم نے کبھی کسی ولایتی پھول میں خوشبو محسوس کی! اور موسم سرما کی دھوپ جو تمہارے نصیب میں ہوتی ہے۔ جنت والوں کو بھی کہاں ملے گی! میں نے سوچا کہ میں تو بحث میں ہار جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے اپنا ٹرمپ کارڈ پھینکا کہ جناب ہپی صاحب وہاں غلاظت بہت ہے۔ مکھیاں بہت ہیں۔ وہ بولا۔ اس کی ذمہ داری تو عوام پر عائد ہوتی ہے نہ تھوکا کرو جگہ جگہ اور غلاظت نہ پھینکا کرو گلی کوچوں میں۔ اب مجھے خاصی دیر سوچنا پڑا کہ اس کمبخت کو اور کیا کہوں۔ تب میں نے ایک اور وار کیا۔ پاکستان بہت بور ملک ہے۔

وہ اس کے لئے بھی تیار تھا۔ کہنے لگا۔ تو کیا انگلینڈ دلچسپ ملک ہے۔ تمہارے ملک میں تو زمین کی اتنی مختلف شکلیں ہیں کہ انسان بور ہو ہی نہیں سکتا۔ میدان ہیں، جنگل ہیں، صحرا ہیں اور دنیا کے بلند ترین پہاڑ ہیں اور اتنا سرسبز ہے کہ آنکھیں دکھنے کو آتی ہیں۔ میں نے کہا انگلینڈ بھی تو سرسبز ہے۔ کہنے لگا وہاں آبادی اتنی ہے کہ سبزہ دکھائی ہی نہیں دیتا اور بارش اتنی ہے کہ کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ تمہارے ہاں کچھ لوگ برے ہوں گے لیکن جن لوگوں سے میں ملا ہوں وہ سب کے سب اچھے تھے۔ گاؤں میں کسی کے دروازے پر دستک دے کر کھانا مانگو تو مل جائے گا۔ انگلینڈ میں ملے گا؟ وہ درست کہتا تھا۔ انگلینڈ میں تو آپ سگے بھائی کے گھر کھانے کے وقت چلے جائیں تو وہ مزے سے ڈائننگ روم میں بیٹھا کھانا کھا رہا ہو گا اور بھولے سے "صلاح" بھی نہیں مارے گا۔ مختصر یہ کہ مجھے ہار ماننا پڑی اور جانی جوکر کو چائے کے ساتھ کیک بسکٹ کھلانے پڑے۔ جانی جوکر نے پاکستان کے بارے میں جتنی باتیں کیں وہ سب مجھے معلوم تھیں لیکن میں نے کبھی اُن کے بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ پاکستان میں قدرتی نعمتوں کی اتنی بہتات ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی ان کے بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچتا۔ جغرافیائی طور پر اتنا بے پناہ تنوع ہے کہ دنیا کے کم ہی ملکوں میں ایسا ہو گا کہ ایک حصے میں صحرا کا گرم ہوا ہے تو دوسرے حصے میں اسی لمحے برفباری ہو رہی

ہے۔ اور تو اور پاکستان کے باشندوں کے قد کاٹھ اور شکل و صورت بھی اتنے مختلف اور ان رنگ ہیں کہ ہر قسم کی رنگت اور ناک نقشے دکھائی دیتے ہیں۔ جب کبھی یورپ سے خشکی کے راستے وطن لوٹتا ہوں تو ہمیشہ راستے کی خشکی، بے آبادی اور بنجر پن کے بعد پاکستان میں داخل ہوتے ہی رونق اور سبزے کا سمندر میرا استقبال کرتا ہے اور میں شکر کرتا ہوں کہ میں بالآخر اپنے وطن میں ہوں۔ ایسا وطن جو دنیا کے بیشتر ملکوں سے بہت بہتر اور خوبصورت ہے۔ دراصل ہمیں یقین نہیں آتا کہ ہم جنت میں رہتے ہیں۔ جب تک کہ کوئی ولائتی صاحب بہادر ہمیں یہ نہ بتائے کہ دیکھو تم پیراڈائز میں رہتا ہے۔ یہ بھی درست کہ زندگی کے بیشتر شعبوں میں سانپ بھی ہیں جو اس جنت کو صرف ذاتی مفاد کی خاطر جہنم بنانے پر تلے ہوئے ہیں لیکن اس میں جنت کا کیا قصور!

"نادان فرنگن اور جنگلی بھینسیں"

کیا آپ یقین کریں گے کہ کل شام میں نے پرانی سبزی منڈی کے دروازے میں سے "وائلڈ بفلوز" یعنی جنگلی بھینسوں کا ایک ریوڑ باہر نکلتے دیکھا۔ جی ہاں! بالکل سیاہ شکتی ہوئی خونخوار قسم کی بھینسیں جن کے سڑک پر آتے ہی افراتفری مچ گئی، پکی پان فروش کا خوانچہ اُلٹ گیا، دو سائیکل سوار اشرف نیچوں والے کی دوکان میں جا گھسے اور ریڑھے والے کا گھوڑا ہنہناتا ہوا الف ہو گیا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کئی افراد نے دکانوں کے تھڑوں پر چڑھ کر جان بچائی۔ ان جنگلی بھینسوں کے متعدد ریوڑ دن میں کئی مرتبہ سبزی منڈی میں اپنی آماجگاہ سے نکلتے ہیں اور سڑک پر بھگدڑ مچاتے ہیں۔

میں بھی پہلے پہل آپ کی طرح ان بھینسوں کو عام سے معصوم جانور سمجھتا تھا لیکن ڈریلیا کی لاہور آمد کے دوران میرا نقطۂ نظر یکسر تبدیل ہو گیا۔ ڈریلیا میرے ایک سوس دوست کی بہن تھی جو اسرارِ مشرق دیکھنے کے شوق میں لاہور آئی اور کانپتی لرزتی واپس سوئٹزرلینڈ چلی گئی۔ لیکن اس سے پیشتر میں اسے ایک گائیڈ کی حیثیت میں قابلِ دید مقامات دکھاتا رہا۔ ایک روز اندرونِ شہر کے گرینڈ ٹور کے بعد ہم دونوں چیمبرلین روڈ کے راستے مال روڈ کی جانب جا رہے تھے کہ ایک دم اس نے ایک ہلکی سی مہذب چیخ ماری اور میرا بازو پکڑ کر کہنے لگی: "مستنصر مجھے بچالو!" میں نے سمجھا کہ شاید بی بی کو ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے یا انو بازار سے کھائی ہوئی چاٹ کی وجہ سے اس کے معدے میں اتھل پتھل شروع ہو گئی ہے۔ چنانچہ میں نے مشرقی آداب کے تحت فوراً اپنا بازو اس کی گرفت سے آزاد کیا کہ کہیں کسی الزام میں دھر نہ لیا جاؤں اور اس کی بے چینی کا

سبب پوچھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا۔ وہ بے حد خوف زدہ تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر میرا بازو تھام لیا اور گوالمنڈی چوک کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی: "وائلڈ بفلوز"۔ میں نے اس جانب دیکھا تو اُدھر سے چند بھینسیں خراماں خراماں چلی آ رہی تھیں۔ میں نے اسے بتایا اے نادان فرنگن یہ جنگلی بھینسیں ہرگز نہیں ہیں بلکہ بے ضرر اور دودھ دینے والی گھریلو پالتو بھینسیں ہیں جو کسی کو کچھ نہیں کہتیں۔ لیکن ثریا بدستور خوفزدہ تھی۔ کہنے لگی: "لیکن یہ بھینسیں تو اصل میں جنگلی ہوتی ہیں تم نے اگر انہیں سدھا کر گھروں میں رکھ لیا ہے تو اس سے ان کی فطرت تو نہیں بدل سکتی۔" میں نے بہتیرا سمجھایا کہ بی بی انہیں تو ہمارے ہاں بھولی بھینسیں کہا جاتا ہے جو بالکل بے ضرر ہیں لیکن وہ نہ مانی اور کہنے لگی کہ اچھا اگر تم شیر کو گھر میں رکھ لو اور اسے سدھا لو تو کیا وہ شیر نہیں رہے گا۔" میں نے کہا بالکل رہے گا لیکن شیر اور بھینس میں فرق ہے۔ وہ بولی کوئی فرق نہیں دونوں جنگل کے جانور ہیں اور کسی وقت بھی حملہ آور ہو سکتے ہیں...... اس کے بعد ثریا کا دل لاہور میں نہ لگا۔ وہ ہر وقت اِدھر اُدھر پھونک پھونک کر قدم رکھتی۔ جیسے شہر میں نہ ہو کسی پرخطر جنگل میں چل رہی ہو اور بالآخر وہ "بھینسوں کے شہر" لاہور سے کوچ کر گئی۔ ثریا کے جانے کے بعد میں بھی بھینسوں کو شک کی نظر سے دیکھنے لگا۔ کیا پتہ کہ کب اپنی فطرت کی طرف لوٹ جائیں اور حملہ آور ہو جائیں۔ الفریڈ ہچکاک کی مشہور فلم "پرندے" جو ڈیفنی ڈی موریئر کے ایک افسانے پر مبنی تھی میں بھی یہی کچھ ہوا تھا کہ یکدم ایک قصبے کے تمام پرندے انسانوں پر حملہ آور ہونے لگتے ہیں۔ ایک فلم میں کتوں کو بھیڑیوں میں بدلتے دکھایا گیا تھا۔ عام گھریلو بلیاں کئی مرتبہ بچوں پر حملہ کر دیتی ہیں۔ یعنی اُن کے اندر شیر سے رشتہ داری والا خون اُبلنے لگتا ہے تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ بھینسیں بھی کسی روز اپنی تمام تر شرافت بھول کر سچ مچ جنگلی ہو جائیں۔ مشہور امریکی مصنف ہیمنگوے نے اپنے ایک سفرنامے میں لکھا تھا کہ جب جنگلی بھینس حملہ کرنے کی نیت سے تمہاری طرف بھاگنا شروع کرتی ہے تو انسان فوراً اپنی خطاؤں کی معافی مانگنے لگتا ہے اور اس کا وہ سب کچھ خطا ہو جاتا ہے جو انسان کے علاوہ بھی خطا ہو سکتا ہے اور یہ

کہ جنگلی بھینسے کا شکار شیر کے شکار کی نسبت زیادہ خطرناک ہے۔ اب اگر بین الاقوامی آرا کی وجہ سے مجھے یہ شک ہو گیا کہ ہمارے ہاں کی بھولیاں بھالیاں "بھی جنگلی ہو سکتی ہیں تو اس میں میرا کیا قصور؟ اور ان میں بھینسوں کا بھی کیا قصور۔ جو صرف اپنے "اصل" کی جانب لوٹ جائیں گی۔ یہ شرف صرف حضرتِ انسان کو حاصل ہے کہ اس کے "اصل" کا کچھ پتہ نہیں چلتا وہ معاشرے کے جنگل میں اپنی شکلیں بدلتا رہتا ہے۔ جب کمزور سامنے ہو تو وہ شیر بن جاتا ہے۔ خود کمزور ہو تو گیدڑ بن جاتا ہے۔ طاقت کی حالت میں ہو تو ہاتھی، بے حیثیت ہو تو چیونٹی، امیر ہو تو منہ زور گھوڑا، غریب ہو تو نالی کا کیڑا...... لیکن قصہ تو جانوروں کا چھڑا تھا کہ اگر تمام جانور خونخوار ہو جائیں تو؟ بہرحال لاہور کی بھینسیں تو جنگلی ہو چکی ہیں اور ہماری گلیوں بازاروں میں دہشت پھیلاتی گھومتی رہتی ہیں۔ کچھ عرصہ پیشتر اخباروں میں بڑی بڑی سرخیوں سے اعلان کئے گئے تھے کہ بھینسیں شہر کے باہر پہنچا دی گئی ہیں۔ گوالوں کے چالان ہوئے تھے۔ انہیں ایک کالونی الاٹ ہوئی تھی اور اس کے بعد ایل ڈی اے چین کی نیند سو گیا اور اب تک سوتا ہے کیونکہ اسے تو معلوم ہی نہیں کہ بھینسیں پھر شہر میں آ چکی ہیں یا شاید ایل ڈی اے نے جان بوجھ کر صرف ٹورسٹ اٹریکشن کے لیے انہیں کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ دنیا بھر کے سیاح حضرات آئیں اور دیکھیں کہ کس طرح انسان اور وحشی جانور ایک ہی شہر میں رہتے ہیں۔ کیا جنگل میں منگل کا سا سماں ہے۔ دنیا کے کسی اور شہر میں ایسا نظارہ کہاں ہوگا۔ بلکہ ایل ڈی اے میری مانے تو ایک پوسٹر چھپوائے جس میں لاہور کے کسی بارونق بازار میں بھینسوں کا ہجوم مستی کے عالم میں چلا جا رہا ہے اور اس کے نیچے لکھا ہو "آئیے اور لاہور دیکھیے۔ بھینسوں کا شہر لاہور۔ لیکن بھینس کے آگے بین بجانے سے کیا ہوتا ہے؟

"ہچ ہائکنگ"

میں اپنے کھٹ کھٹارا موٹر سائیکل پر حسبِ معمول شہر سے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ ایک نوجوان نے مجھے ٹھینگا دکھا دیا۔ اس سے پیشتر بھی لوگوں نے مجھے لفٹ کے لئے روکنا چاہا تھا مگر میں رک نہ سکا۔ کیونکہ میری بریک قدرے عمر رسیدہ ہے اور رکتے رکتے دو چار فرلانگ فاصلے کر جاتی ہے لیکن آج موٹر سائیکل کی تازہ تازہ سروس ہوئی تھی۔ چنانچہ میں نے بریک پر پاؤں رکھ دیا تاکہ اس نوجوان کو لفٹ دے کر ان ہزاروں لفٹوں کا بدلہ چکا سکوں جو مجھے ایامِ جوانی میں دنیا کے بے شمار لوگوں نے دی تھیں۔۔۔۔ اور جن کی بدولت میں ان کے بارے میں لکھ سکا تھا۔۔۔ موٹر سائیکل رکی اور میں نے نوجوان سے مسکراتے ہوئے پوچھا کہ بھئی کہاں جاؤ گے؟۔۔۔۔

سڑک پر کھڑے ہو کر لفٹ لینے کا رواج یا ہچ ہائکنگ کہاں اور کس طرح شروع ہوئی۔ اس کے بارے میں کچھ بیان ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ دوسری جنگِ عظیم میں جب روسی محاذ بے حد گرم اور قاتل تھا۔ جرمن فوجی چھٹی پر واپس وطن آتے تو اپنے اپنے آبائی شہروں تک جانے کے لئے سڑکوں پر کھڑے ہو جاتے۔ ان کے ہم وطن جذبۂ تشکر کے تحت انہیں اپنی گاڑیوں یا موٹر سائیکلوں پر بٹھا کر ان کے قصبوں یا شہروں تک مفت میں لے جاتے۔ جنگ کے خاتمے پر یہ عادت نوجوان نسل نے اپنائی جو تنگ دستی کے باوجود سیر و سیاحت کی شوقین تھی۔ چنانچہ آہستہ آہستہ یہ رواج پورے یورپ میں پھیل گیا اور شاہراہوں پر کھڑے نوجوان سیاحوں کو لفٹیں دی جانے لگیں۔

میں پہلی مرتبہ ہچ ہائکنگ سے ایک انگریز لڑکے پیٹر وڈ کے ذریعے متعارف ہوا۔ پیٹر نے مجھے بتایا کہ کس طرح اس نے پورے یورپ کی سیر لوگوں سے لفٹیں مانگ مانگ کر کی ہے۔

اور اسے اس دوران کیسے کیسے تجربات ہوئے چنانچہ میں نے بھی سیاحتی تھیلا یا تھیلا یا تنگ بیک کاندھے پر ڈالا اور قسمت آزمائی کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ ولایت میں مقیم ایک بزرگ کو جب میرے اس ہائکنگ کے ارادے کی خبر ہوئی تو وہ خاص طور پر مانچسٹر سے لندن تشریف لائے اور کہنے لگے "برخوردار تمہارا دماغ خراب ہے۔ اچھے بھلے معزز خانوادے سے تعلق رکھتے ہو۔ کبھی سڑکوں پر کھڑے ہو کر گوروں سے لفٹ کی بھیک مانگو گے، شرم کرو۔۔۔۔" مجھ میں شرم کا کچھ فقدان تھا چنانچہ میں نے اپنا ارادہ نہ بدلا۔ جب پہلی مرتبہ اپنا سامان سڑک پر رکھ کر انگوٹھا دکھانے کی کوشش کی تو خاصی ندامت ہوئی اور بزرگ کی باتیں یاد آئیں۔ بہر حال اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ میں نزدیک ترین ریلوے اسٹیشن یا بس شاپ سے کوسوں دور تھا چنانچہ دستِ سوال پھیلا دیا۔۔۔۔ وہ دن اور آج کا دن۔۔۔۔ میں نے کچھ نہیں تو پچاس ساٹھ ہزار میل کا فاصلہ تو لفٹوں کے ذریعہ طے کیا ہوگا۔۔۔۔

ہچ ہائکنگ میں البتہ کچھ دشوار مقام بھی آتے ہیں۔ مثلاً آپ سارا دن ایک جگہ اکڑتے رہیں اور آپ کو کوئی لفٹ نصیب نہ ہو۔ یا پھر آپ کو کسی ویرانے میں اتار کر ڈرائیور گھر چلا جائے اور آپ کو میلوں پیدل چلنا پڑے۔۔۔۔ ایک کامیاب ہچ ہائکر کے لئے ضروری ہے کہ وہ خوشگوار طبیعت کا مالک ہو۔ کھڑے ہونے کے لئے ایسی جگہ کا انتخاب کرے جہاں گاڑیاں آسانی سے رک سکیں۔ مثلاً جہاں کوئی ذیلی سڑک شاہراہ میں آکر ملتی ہو۔ کسی پٹرول پمپ کے باہر وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔ اس کی دشواریاں اپنی جگہ لیکن اس طریقۂ سفر کی بدولت مجھے اتنے مختلف قسم کے لوگوں سے ملنے اور دور افتادہ دیہات اور قصبوں میں جا نکلنے کا اتفاق ہوا ہے کہ اگر بس یا ٹرین میں سفر کرتا تو شاید دنیا کے بارے میں میرا علم بہت ہی ادھورا رہ جاتا۔

پاکستان میں اس کا رواج گزشتہ چند برسوں سے مقبول ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اجتماعی مسئلوں کو اجتماعی طریقے پر ہی حل کرنے کا ایک خوبصورت طریقہ ہے۔ آپ اگر کار میں اکیلے

سفر کر رہے ہیں تو کسی کو ساتھ بٹھا لینے سے یا اسے اپنی منزل تک پہنچا دینے سے جو آپ کی منزل بھی ہے زیادہ پٹرول تو خرچ نہیں ہوگا البتہ اس فرد کا انسانیت اور بھائی چارے پر یقین بڑھ جائے گا اور وہ یقیناً شکر گزار بھی ہوگا۔ جس طرح میں آج بھی ان ہزاروں لوگوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے لفٹیں دیں۔ اسی طور ہم پاکستان میں ایک ایسا طریقہ بھی اپنا سکتے ہیں جو ایران اور ترکی وغیرہ میں ایک عرصے سے مقبول ہے۔ یعنی ہر وہ ڈرائیور جس کی گاڑی میں جگہ ہوتی ہے بس شاپ پر یا سڑک کے کنارے رکتا ہے اور اپنی منزل کا اعلان کرتا ہے اس جانب جانے والے مسافر اس کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں اور اسے مناسب کرایہ ادا کر دیتے ہیں۔ یوں ڈرائیور کے پٹرول وغیرہ کا خرچہ نکل آتا ہے اور آرام سے اپنی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔ سینما گھروں میں فلم کے خاتمے پر بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر پاکستان میں بھی یہ رواج مقبول ہو جائے تو رکشہ اور ٹیکسی والے فی الفور اپنے کرائے نصف کر دیں گے ..... آزمائش شرط ہے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی نہر کے کنارے کی جہاں ایک نوجوان نے لفٹ کے لئے مجھے ٹھینگا دکھایا اور میں نے موٹر سائیکل روک کر پوچھا کہ بھئی کہاں جاؤ گے؟..... جواب ملا جی نہیں میں موٹر سائیکل پر لفٹ نہیں لیتا اور پھر ایسی پھٹیچر موٹر سائیکل پر۔ ابھی کوئی کار آئے گی تو اس میں آرام سے بیٹھ جاؤں گا۔ چنانچہ میرے دیکھتے دیکھتے ایک شاندار کار رکی اور نوجوان اس میں سوار ہو گیا..... اب میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ اس فضول موٹر سائیکل کو طاق نہ پھینک آؤں اور کاروں میں لفٹیں حاصل کر کے آرام سے زندگی بسر کروں۔

"آئی لو پاکستان کا چیکو"

ان دنوں اظہار کا بہترین ذریعہ سٹکر ہیں..... سٹکر اس شے کو کہتے ہیں جسے کسی سطح پر چپکایا جا سکے۔ چنانچہ انہیں اردو میں چیپی یا چپکو کہا جا سکتا ہے۔ یہ چپکو زیادہ تر درآمد ہوتے ہیں اور ان کا مزاج خالصتاً امریکی اور یورپی ہوتا ہے اور اس میں جنس کی آمیزش بھی ہوتی ہے۔ یہ چپکو چونکہ انگریزی زبان میں ہوتے ہیں اس لئے درآمد کرنے والے ان میں پوشیدہ معانی سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں..... یہ چپکو عام طور پر کاروں اور نوجوان نسل پر چپکے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر چھوٹی کاروں کے لئے نہایت ہی مزیدار چپکو ملتے ہیں..... مثلاً یہ ایک طویل کار ہے" "میرے نزدیک آؤ گے تو قتل کر دوں گی"..... "جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو رولز رائس بن جاؤں گی"..... یا پھر "میں چھوٹی ہوں لیکن بڑی اچھی ہوں"..... اس طرح دفتروں، گھروں اور کمروں میں لگانے کے لئے طرح طرح کے چپکو دستیاب ہیں.....

ان میں ایک چپکو "آئی لو پاکستان" کا بھی ہے..... یعنی میں پاکستان سے محبت کرتا ہوں پچھلے دنوں ایک دوست کے ساتھ ملکی سیاست کے بارے میں ہلکی پھلکی لیکن سنجیدہ قسم کی بحث ہو رہی تھی وہ بڑے زور شور سے دلائل دے رہے تھے اور میں سن رہا تھا۔ بالآخر میں نے تنگ آ کر کہا کہ دیکھو بھائی میرا اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ اگر آپ اپنے وطن کے ساتھ لگاؤ رکھتے ہیں تو پھر آپ جو بھی کہیں قابل قبول ہے..... لیکن اگر آپ اس سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں تو پھر آپ کی گفتگو قبول نہیں کی جا سکتی....."

"کیا مطلب!" وہ منہ پر مکا مار کر بولے "کون کہتا ہے کہ میں پاکستان سے

کرتا۔۔۔"

"میں تو نہیں کہتا۔۔۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

"میں پاکستان سے محبت کرتا ہوں" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "کیا تم نے میری کار دیکھی ہے؟"

"ان دنوں آپ کے پاس کون سی کار ہے؟"

"ان دنوں میرے پاس ایک سلور مرسڈیز ہے..... اور تم بے شک ابھی جا کر دیکھ لو اس کے اگلے شیشے پر "آئی لو پاکستان" سٹکر لگا ہوا ہے..... وطن دوستی کی اس سے بڑی اور کیا مثال ہو گی....؟"

"یہ ثبوت ہے آپ کی پاکستان کے ساتھ محبت کا؟"

"تو اور کیا..... میں نے سٹکر لگا کر اپنا فرض پورا کر دیا ہے..... اب میں ملک کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا کر سکتا ہوں؟"

اور ہم میں سے بیشتر ایسا ہی کرتے ہیں۔ ہم اپنی کاروں، موٹر سائیکلوں اور کمروں میں "آئی لو پاکستان" کا چپکو لگا کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم فارغ ہو گئے ہیں۔

پچھلے برس ہنزہ کے صدر مقام کریم آباد میں ایک شام تھی اور اس شام سامنے سے ایک گورا چٹا درمیانی عمر کا شخص کاندھے پر سامان کا تھیلا اٹھائے سر جھکائے چلا آ رہا تھا اور اس کے گلے میں جوتوں کا ہار تھا۔ جی ہاں! اس نے اپنے دونوں فل بوٹ تسموں سے باندھ کر گلے میں لٹکا رکھے تھے۔ میں نے سوچا یہ نسل اور شکل سے جرمن لگتا ہے چنانچہ قریب سے گزرتے ہوئے میں نے ذرا لہک کر اسے "گڈ مارننگ" کہہ دیا۔ حالانکہ اس وقت شام گہری ہو رہی تھی..... اس نے جواب دیا اور قریب سے گزر گیا۔ میں نے سوچا جرمن بھی ہے اور بد دماغ بھی ہے..... چند لمحوں بعد وہ پھر آ گیا۔ "تارڑ صاحب! آپ نے مجھے گڈ مارننگ کہا تھا....."

مجھے حیرت ہوئی کہ یہ جرمن تو اردو بولتا ہے لیکن ظاہر ہے وہ پاکستانی تھا.....

"جی ہاں میں نے ہی آپ کو گڈ مارننگ کہا تھا....."

"کمال ہے آپ کی انگریزی اتنی غلط ہے..... اس وقت تو آپ کو گڈ ایوننگ کہنا چاہیے تھا۔ بہت افسوس کی بات ہے کہ آپ جیسے ادیب....." اس نے مجھے خاصی جھاڑ پلا دی۔

"آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟" میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"میں ادھر پہاڑوں میں گیا تھا ادھر سے آ رہا ہوں"

"کون سے پہاڑوں میں..... اور کدھر سے" آدمی دلچسپ معلوم ہوتے تھے۔ "چائے پئیں گے؟"

"پہلے مجھے رات کے لیے رہائش درکار ہے۔ پھر چائے بھی پی لیں گے۔"

ان صاحب کے لیے بڑی مشکل سے رہائش کا انتظام کیا۔ کیونکہ ان دنوں کریم آباد کے تمام ہوٹل فل تھے۔

"اب میں آپ کو چائے پلاؤں گا....." ان صاحب نے خوش ہو کر کہا..... "پہلے اپنا تعارف کرا دوں..... میں کراچی میں سکول ٹیچر ہوں..... ان تین مہینے کی چھٹیوں میں ادھر شمالی علاقوں میں آ جاتا ہوں اور آوارہ گردی کرتا ہوں"

"آپ کہاں اور کن پہاڑوں میں جاتے ہیں؟"

"میری کوئی منزل نہیں ہوتی..... کبھی کسی کوہ پیما ٹیم کے ہمراہ چلنے لگتا ہوں۔ اپنا خیمہ ہے اپنی خوراک بنا لیتا ہوں۔ کبھی کوئی وادی یا گلیشیئر پسند آ جائے تو ٹیم کو چھوڑ کر ادھر نکل جاتا ہوں..... یوں میں پاکستان سے محبت کرتا ہوں....."

"ہیں؟" میں نے چونک کر کہا۔ "یہ پاکستان کہاں سے آ گیا؟"

"میں جو کچھ دیکھتا ہوں وہ پاکستان ہی تو ہے..... پھر میں واپس جاتا ہوں اور اپنے شاگردوں کو بتاتا ہوں کہ میں کہاں کہاں بھٹکتا پھرا..... انہیں پہاڑوں اور برفانی تودوں کے بارے میں بتاتا ہوں جو میں دیکھتا ہوں دور افتادہ وادیوں میں رہنے والے لوگوں کے بارے

میں بتاتا ہوں اور یوں وہ بھی پاکستان سے محبت کرتے ہیں ؟.....

"پھر پاکستان ؟..... پاکستان سے محبت کا اس آوارہ گردی کے ساتھ کیا تعلق بنتا ہے ؟"

"دیکھیں جناب...... کیا آپ نے کبھی عشق کیا ہے ؟"

"لاحول ولا......" میں نے گھبرا کر کہا : "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں قبلہ...... میں شادی شدہ....."

"بہر حال..... کیا آپ کسی سائے سے محبت کر سکتے ہیں ؟...... محبت کرنے کے لئے جاننا ضروری ہے اگر آپ کو یہ معلوم نہیں کہ محبوب کا ناک نقشہ کیا ہے تو پھر آپ اس سے کس طرح محبت کر سکتے ہیں ؟"

"یہ تو بالکل درست فرمایا آپ نے..... میں نے قائل ہوتے ہوئے کہا۔

"تو جناب میں تو پاکستان کو جاننے کے لئے۔ اس کا ناک نقشہ دیکھنے کے لئے سفر کرتا ہوں....."

لوگ اپنے سینوں پر کاروں پر تحریروں پر، کالموں پر، "آئی لو پاکستان" کا چیکو لگائے پھرتے ہیں اور انہیں بالکل علم نہیں کہ ابھی پاکستان کا ناک نقشہ کیا ہے شباہت کیسی ہے..... وہ یہ چیکو لگا کر محب الوطنی کے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ کریم آباد کی شام میں ملنے والا وہ کراچی کا ٹیچر ان سے مختلف تھا۔ اس نے اپنے سینے پر کوئی چیکو آویزاں نہیں کر رکھا تھا لیکن وہ اپنے محبوب کے ناک نقشے کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اور پھر نئی نسل کو بتانا چاہتا تھا کہ ان کا وطن کیسا ہے۔ کتنا خوبصورت ہے..... اسے کسی "آئی لو پاکستان" کے چیکو کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اسے کچھ بھی ثابت کرنے کی ضرورت نہیں تھی...... اور کار کے عقب میں لگا ہوا "آئی لو پاکستان" تو سب دیکھتے ہیں۔

"آئی لو پاکستان" کے چیکو ضرور آویزاں کیجئے...... باہر بھی...... اور دل کے اندر بھی۔

ہرن مینار اور پیاسے ہرن

میرے ساتھ تین بچے تھے۔ بچہ نمبر ایک۔ بچہ نمبر دو اور بچہ نمبر تین...... اور تینوں بچے پیاسے تھے۔

ہم ایک جھیل نما تالاب کے کنارے بیٹھے تھے اور پیاسے تھے۔

ہم چاروں کی زبانیں باہر نکلی ہوئی تھیں اور ہم پیاسے جانوروں کی طرح ہانپے چلے جا رہے تھے۔ اور یہ صرف اس لئے ہو رہا تھا کہ مجھے اور میرے بچوں کو اپنا قومی ورثہ بے حد پیارا تھا۔

اس قصے کا آغاز کچھ اس طرح ہوا کہ بچہ نمبر ایک نے کسی اخبار میں پڑھا کہ محکمہ آثار قدیمہ کی عمارات کو قائم رکھنے کے لئے اتنے کروڑ روپیہ خرچ کرے گا۔ چنانچہ بچہ نمبر ایک نے حیرت سے پوچھا کہ ان پرانی پرانی عمارتوں پر اتنے روپے کیوں خرچ کرتے ہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ انہیں ڈھا کر شاپنگ پلازہ وغیرہ بنا دیئے جائیں۔ میں نے اسے بتایا کہ بیٹا جان اگرچہ تم نے قوم کی اجتماعی سوچ کی ترجمانی کی ہے لیکن یہ پرانی عمارتیں ہمارا قومی ورثہ ہیں۔ ہماری تاریخ کی تصویریں ہیں۔ ہمارے فن کی نمائندہ ہیں وغیرہ وغیرہ...... اس پر اس نے بڑے آرام سے پوچھا کہ مثلاً؟......

"مثلاً یہ کہ بادشاہی مسجد دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے....."

"ابو آپ بادشاہی مسجد کو آثار قدیمہ تو نہیں کہہ سکتے...... کوئی اور حوالہ دیجئے" بچہ نمبر ایک نے اپنی عینک درست کی۔

"مثلاً لاہور کا شاہی قلعہ، ہماری عظمتوں کا شاہکار، اعظم شالیمار باغ...... اور مقبرہ جہانگیر

وغیرہ ایسی عمارتیں ہیں جنہیں سنبھال کر رکھنا ہمارا ملی فریضہ ہے......"

اس دوران بچہ نمبر دو بھی کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ بھی گفتگو میں شامل ہو گیا۔

"اور یہ بھی آپ کا ملی فریضہ ہے ابو کہ آپ اپنی کہ آپ اپنی اولاد کو ماضی کے شاہکار دکھائیں۔"

"بالکل۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ ہر پاکستانی یہ فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اپنے شاندار ماضی سے آگاہ کرے اور آثار قدیمہ کی سیر کرائے...... اور میں یہ فرض ادا کر چکا ہوں۔"

"آپ نے ہمیں ہرن مینار دکھایا ہے؟" بچہ نمبر تین کسی فلمی ولن کی طرح کمرے میں داخل ہوا اور بڑھک لگا کر بولا۔ یہ دراصل ایک سازش تھی مجھے ہرن مینار لے جانے کی اور اب ہم جھیل نما تالاب کے کنارے بیٹھے تھے اور پیاسے تھے۔

لاہور سے روانہ ہوتے وقت بچوں کے ذہن میں ہرن مینار اور اس کی جھیل کسی خواب کی وادی میں تھے جہاں جنگلوں میں ہرن گھومتے تھے اور خنک چشمے ہر قدم پر ابلتے تھے۔ شیخوپورہ سے گزر کر ہم بائیں ہاتھ ہوئے اور ایک چھوٹی سی سڑک پر سفر کرتے ہوئے ایک روڈ بلاکیڈ پر پہنچ گئے۔ یہاں ایک برآمدے میں کرسی پر ایک کارندہ اکڑا ہوا بیٹھا تھا اور ہرن مینار میں داخل ہونے کے ٹکٹ منہ پر پھینک رہا تھا اور اگر بچہ دودھ پیتا تھا تب بھی یہاں پانچ تھا اور اس کا بھی ٹکٹ تھا۔ میں نے حساب لگایا کہ ٹکٹ کی رقم سے میں بچوں کو لاہور میں باقاعدہ عیش کروا سکتا تھا...... لیکن اب میں لاہور سے بہت دور تھا اور مجھے ایک ملی فرض ادا کرنا تھا چنانچہ میں نے ادائیگی کر دی۔ ٹکٹ جیب میں ڈال کر جانے لگا تو ایک "چھوٹا" نمودار ہو گیا۔ "باؤ جی گاڑی کا ٹکٹ دو......" میں نے بہت کہا کہ ہم شاید کہیں نہ جائیں گاڑی کے قریب ہی رہیں لیکن وہ نہ مانا اور مجھے یہاں بھی خاصی رقم ادا کرنا پڑی۔

ہرن مینار گرمی اور حبس کی زد میں تھا۔ ہم نے ایک نظر اس کرائے نامے پر ڈالی جو کہ ان موٹر بوٹوں اور کشتیوں کا تھا جو کہ تالاب میں کھڑی تھیں اور آگے بڑھ گئے بلکہ بچے کھڑے ہو گئے کہ آ ابو ہم موٹر بوٹ میں سیر کریں گے اور میں انہیں دھکیل کر آگے لے گیا ہرن مینار پر

پڑے اور ادھر اُدھر گھومنے کے بعد ہم نے ایک سایہ دار مقام پر بیٹھ کر کچھ شامی کباب اور ذرا روٹی وغیرہ نوش کی اور تب ہمارے گلے خشک ہوئے، ہمارے جسم خشک ہوئے، آنکھیں جلنے لگیں اور ہم ہرن مینار کے سبزہ زار میں ایک عام سا نل تلاش کرنے لگے۔ کسی ہینڈ پمپ کی جستجو میں گھومنے لگے اور وہاں کچھ بھی نہ تھا...... بوتلیں بیچنے والے تھے جو شیطانی مسکراہٹ سے ہمیں دیکھتے تھے اور چابی سے بوتلوں کو "ٹن ٹن" بجاتے تھے کہ ادھر آؤ مال خرچو اور بچوں کے حلق تر کرو...... یہاں کوئی پانی نہیں ہے۔ صرف ایک نل تھا جسے ہم نے جان بوجھ کر توڑ دیا ہے تاکہ لوگ بوتلیں پئیں یا پیاسے مر جائیں آؤ آؤ...... واقعی وہاں ایک نل تھا جو کسی نے توڑ دیا تھا......

ہم شیخوپورہ تک گرتے پڑتے پہنچے اور سڑک کے کنارے لگے ایک ہینڈ پمپ سے پیاس بجھا رہے تھے کہ بچہ نمبر تین یعنی میری بیٹی عینی کہنے لگی ابو یہ جو جہانگیر کا ہرن مر گیا تھا تو یہ پیاس سے مر گیا تھا؟"

"اور کیا۔" بچہ نمبر دو یعنی سمیر بولا " وہ ہرن مینار دیکھنے آیا ہوگا اور پانی اسے ملا نہیں ہوگا اس لئے مر گیا۔"

"ان ہرنوں کو ہرن مینار نہیں جانا چاہئے۔" میں نے سر جھکا کر کہا۔

"قوموں کی ترقی کا پنکچر شدہ ٹائر"

ان دنوں صبح کے وقت جو چند چھائی ہوئی دھند آلود دھوپ فضا میں ٹھہری ہوئی ہوتی ہے۔ اس میں نہر کے کنارے آہستہ سے موٹر سائیکل پر چلتے جانا کتنی بڑی نعمت ہے۔ کتنی آسودگی ہے۔ ہوا ہرگز نہیں کہ بدن کو کاٹے بلکہ اس میں ایک نرم حدت ہے جو جسم کے آس پاس پھیلتی ہے اور احساس دلاتی ہے کہ زندگی میں کچھ آسائشیں ایسی ہوتی ہیں جو رب کی طرف سے ساری مخلوق کے لئے ایک تحفے کے طور پر عطا ہوتی ہیں۔ کل بھی ایک ایسی ہی صبح تھی اور نہر کے کنارے خوشگوار دھوپ اور نرم حدت میں سانس لیتا شہر کی جانب آ رہا تھا۔ میں جان بوجھ کر موٹر سائیکل آہستہ چلا رہا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ چیئرنگ کراس عبور کرتے کرتے ہی مجھے یہ صاف اور شفاف ہوا نصیب نہ ہوگی۔ وہاں میں شہر کی آلودگی اور کثافت میں سانس لوں گا اور پھر سارا دن گوبر، گرد اور میکانکی ٹرانسپورٹ سے خارج ہونے والے دھوئیں کو اپنے اندر اتارتا رہوں گا۔ ہم جدید زندگی کی دوڑ میں یہ بھول چکے ہیں کہ اس طرز زندگی میں کچھ قباحتیں بھی ہیں۔ جن کا کچھ بندوبست کرنا چاہیے۔ ان میں سے ایک ہوا کی آلودگی ہے جو کارخانوں کی چمنیوں، کاروں اور رکشوں کے سائلنسروں اور گندگی کے ڈھیروں میں سے جنم لیتی ہے اور ہم اس میں سانس لیتے رہتے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ لاہور شہر کے گنجان آباد علاقوں میں پودے بھی سرسبز نہیں رہتے مرجھا جاتے ہیں۔ انسان پودوں کی نسبت قدرے ڈھیٹ واقع ہوا ہے لیکن ایک سٹیج ایسی آ جاتی ہے جب گوبر اور گرد کی تہہ اس کے جسم میں تہہ در تہہ جم کر اُسے ناکارہ کر دیتی ہے...... کیا ہمیں اُس وقت تک انتظار کرنا چاہیے...... بہر حال میں نہر کے کنارے صبح کی دھند آلود دھوپ کو اپنے بدن میں جذب کرتا شہر کی جانب آ رہا تھا کہ یک دم

موٹر سائیکل قدرے لڑکھڑایا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ٹائروں کو نشہ ہو گیا ہے اور وہ جھومتے جھومتے جا رہے ہیں۔ بمشکل ہینڈل کو سنبھالا اور اس کے ساتھ ہی موٹر سائیکل کھڑا ہو گیا۔ پچھلا ٹائر پنکچر ہو چکا تھا۔ موٹر سائیکل سوار برادران جانتے ہیں کہ اگر ٹائر کسی ایسی جگہ پنکچر ہو جائے کہ آس پاس پنکچر لگوانے کی سہولت میسر نہ ہو تو اس وقت چہرے پر کیسی قیامت برستی ہے۔ انسان کتنی بے بسی سے وہاں کھڑا ہوتا ہے۔ اور اپنے قریب سے شاں شاں کرتی گزرتی کاروں اور موٹر سائیکلوں کو کس حسرت سے دیکھتا ہے اور خاص طور پر اُن کے ہوا سے بھرے ہوئے ٹائروں کو جو سڑک پر تیزی سے گھومتے چلے جا رہے ہوتے ہیں...... کچھ حضرات اپنی گاڑی آہستہ کر کے آپ کی بے بسی کا نظارہ کرتے ہیں اور پھر ہوا ہو جاتے ہیں...... میرا موٹر سائیکل چونکہ بہت وزنی ہے اس لئے اُسے گھسیٹ کر لے جانا بھی ناممکن ہے۔ جہاں کھڑا ہو جائے بس کھڑا ہو جاتا ہے یعنی گل محمد ہو جاتا ہے۔ اس دوران کچھ ٹرک سواروں نے مجھے پہچانا اور مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا کر چلے گئے۔ اُن کا خیال تھا کہ تارڑ صاحب ادیب آدمی ہیں نہر کی خوبصورتی کو انجوائے کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں بے یار و مددگار وہاں کھڑا رہا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ نزدیک ترین پنکچر لگانے والے کا ٹھکانہ کہاں ہے...... تاریخ دان گبن نے ایک شکست خوردہ بادشاہ بایزید کے بارے میں لکھا ہے کہ جب وہ امیر تیمور کے سامنے پیش ہوا تو اس نے اپنی موجودہ صورتِ حال بھلا کر اپنی عزتِ نفس کو یاد رکھا۔" چنانچہ میں نے بھی اپنی پنکچر شدہ صورتحال کو بھلا کر شہر نہر کنارے پھیلی ہوئی خوبصورت دھوپ کو یاد رکھا اور گھاس پر بیٹھ کر اس سے لطف اندوز ہونے لگا...... میں نے سوچا کہ اگر کوئی سرکاری ایجنسی ایسا نقشہ تیار کرے جس میں لاہور شہر میں پھیلی ہوئی پنکچر کی دکانوں کی نشان دہی ہو تو ہم لوگوں کو کتنا آرام ہو جائے۔ جہاں موٹر سائیکل پنکچر ہوا وہیں پر نقشہ نکالا اور نزدیک ترین دکان پر چلے گئے۔

میرا موٹر سائیکل فٹ پاتھ کے کنارے کھڑا تھا۔ اس کا پچھلا ٹائر پنکچر ہو چکا تھا اور ہر طرف ایک ٹھہراؤ تھا...... ایک ایسا ٹھہراؤ جو کبھی کبھار قوموں کی زندگی میں بھی آ جاتا ہے

جب کسی ناگہانی آفت کی بنا پر اُن کی ترقی کا ٹائر پنکچر ہو جاتا ہے۔ ان آفتوں کا سبب انسان بھی ہیں اور قدرت بھی۔ کل پر نظر رکھنے والی اقوام ہمیشہ ان حادثوں کے لئے تیار رہتی ہیں۔ وہ فوراً ٹائر پر پنکچر لگاتی ہیں اور پھر سے منزل کی جانب رواں ہو جاتی ہیں۔ ٹائر پنکچر ہونے کے مختلف سبب ہوتے ہیں۔ دھیان رکھنا چاہیے کہ ٹیوب زیادہ پرانی نہ ہو۔ ٹائروں میں سوراخ نہ ہوں اور ہوا کا تناسب درست ہو۔ اس کے علاوہ سڑکوں پر بچھے کیل بھی سفر رکنے کا سبب بنتے ہیں۔ یہ کیل ایسی قومیں بکھیرتی ہیں جو چاہتی ہیں کہ چھوٹے ملکوں کے ٹائر پنکچر کس طرح لگانا ہے۔ کہاں سے گزرنا ہے۔ ایسی قومیں یہ بھی جانتی ہیں کہ وطن سے محبت وہ جذبہ ہے۔ جس سے ہر قسم کا پنکچر لگ سکتا ہے اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اس جذبے کو ابھرنے نہ دیا جائے۔ چنانچہ موٹر سائیکل ایک ہی جگہ کھڑا رہتا ہے جبکہ سڑک پر چلنے والے دوسرے حضرات شاں شاں کرتے اپنی منزل کی جانب لپک رہے ہوتے ہیں اور آپ اس ٹھہراؤ سے۔ اس بے حرکتی سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے ہیں...... یہ قصہ کل کا ہے جو گزر گیا۔ ایک راہگیر نے میری رہنمائی کی اور وہاں سے چند فرلانگ کے فاصلے پر واقع ایک دکان پہ لے گیا جہاں پنکچر لگتے تھے۔

آج صبح بھی کل کی طرح میں نہر کے کنارے خوشگوار دھوپ اور نرم حدت میں سانس لیتا شہر کی جانب چلا آتا تھا لیکن آسودگی اور سکون سے محروم تھا۔ ایک خوف تھا جو ہر وقت میرے ساتھ سفر کر رہا تھا جیسے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں ابھی اسی وقت میرا ٹائر پنکچر نہ ہو جائے۔ اس خوف نے آس پاس پھیلی ہوئی خوبصورتی میں زہر گھول دیا۔ چنانچہ میری رفتار آہستہ ہو گئی اور سڑک پر سفر کرنے والے دوسرے لوگ مجھ سے بہت آگے نکل گئے۔

اس پلیٹ فارم اور اُس پلیٹ فارم میں فرق

گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں نے اپنا سامان ڈبے میں رکھا اور باہر آ گیا۔ کیونکہ گاڑی کا انجن ابھی لگا نہیں تھا اور ابھی اسے کچھ دیر بعد حرکت میں آنا تھا...... انسان جب صبح سویرے گھر سے نکل کر ریلوے سٹیشن پر پہنچتا ہے تو ایک عجیب کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ وہ سنسان سڑکوں، نیم تاریک محلوں اور محو خواب بال بچوں کو چھوڑ کر جونہی ریلوے سٹیشن کے اندر آتا ہے تو وہاں وہ صبح ہو چکی ہوتی ہے جو ابھی شہر سے دور ہوتی ہے۔ یہاں زندگی جاگ رہی ہوتی ہے۔ اکا دکا مسافر، پورے خاندان، بچے بوڑھے...... قلی بھاگتے ہوئے۔ خوانچہ فروشوں کی آوازیں اور انجنوں کا مسلسل شور...... میری گاڑی چلنے میں ابھی پون گھنٹہ باقی تھا چنانچہ میں پلیٹ فارم پر گھومنے لگا......

پلیٹ فارم نمبر ایک کی چھت اونچی تھی اور یہاں حبس نہ تھا۔ روشنی آسانی سے آتی تھی۔ صفائی ہو چکی تھی اس لئے فرش صاف ستھرا تھا اور اس میں سے فینائل کی صحت مند بو آتی تھی...... مسافر جو اس پلیٹ فارم پر آ رہے تھے خوش لباس تھے۔ ان کی صحت کا معیار عمومی طور پر قابل رشک تھا۔ ان کے سوٹ کیس اور بیگ نئے تھے اور جدید ڈیزائنوں کے تھے۔ زیادہ تر بچے گول مٹول تھے اور انتہائی دیدہ زیب ملکی اور غیر ملکی ملبوسات میں تھے اور پیارے لگتے تھے...... دودھ کی بوتلیں بھری ہوئی تھیں۔ خواتین کی اکثریت بہت جدید اور مہنگے لباسوں میں تھی۔ مرد حضرات بھی بنے ٹھنے ہوئے تھے یوں لگتا تھا جیسے لاہور سٹیشن پر کوئی بارات اتری ہوئی ہے لیکن یہ تو روزمرہ کا معمول تھا۔ یہ عام پاکستانی تھے جو لاہور سے

باہر جارہے تھے۔ ان کے ملبوسات بھی ان کے لئے عام اور روزمرہ کے تھے۔ بیشتر کے ہاتھوں میں چمکتے ٹفن کیریر تھے۔ کچھ بچے آئس کریم کھا رہے تھے۔ مشروبات کے سٹالوں پر خاصا رش تھا اور تین تین روپے کی بوتلیں درجنوں کے حساب سے پی جارہی تھیں۔ مسافروں کے چہرے تندرستی اور سفر کے شوق سے دمک رہے تھے۔

ابھی گاڑی کے چلنے میں کچھ وقت تھا...... پلیٹ فارم نمبر ایک کا چکر لگا کر میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک اور پلیٹ فارم کی طرف نکل گیا...... اس پلیٹ فارم پر منظر کچھ مختلف تھا۔

اس پلیٹ فارم کی انتظار گاہ میں حبس بہت تھا اور تاریکی تھی...... یہاں گندگی تھی۔ فرش پر کاغذ اُڑتے تھے اور بے شمار لوگ...... بچے، بوڑھے اور عورتیں غلیظ اور پھٹی ہوئی چادروں میں لپٹے فرش پر کروٹیں بدلتے تھے...... بچوں کے بدن پر قمیضوں کی بجائے تعویز تھے اور وہ بہت دُبلے پتلے اور تقریباً بیمار لگ رہے تھے۔ بوڑھے بھی دُبلے پتلے تھے اور زیادہ تر سفید ڈاڑھیوں والے تھے...... اُن کی آنکھیں بجھی بجھی تھیں۔ خواتین ناکافی ساڑھیوں میں تھیں اور ان کے چہرے بے رونق اور بے رنگ تھے...... مرد بھی گندے اور پھٹے ہوئے پاجاموں میں تھے...... بدن پر ایک پرانی بنیان اور بدن کو کھجاتے ہوئے...... ان مسافروں کا سامان بھی مختلف تھا...... ان کے پاس ٹین اور لکڑی کے وہ پرانے سوٹ کیس تھے جنہیں اُٹھا کر پاکستان میں چلا جائے تو عوام مسکرانے لگیں کہ یہ کیا اُٹھائے پھرتا ہے...... ان کے بستر اور گٹھڑیاں اتنی بوسیدہ اور گندی تھیں کہ ہم عام طور پر ایسی چیزیں کوڑے کرکٹ میں پھینک دیتے ہیں۔ یہاں مشروبات کی بوتلوں کی کھنک بھی مفقود تھی۔ کیونکہ ظاہر ہے ان مسافروں کی جیب اس قسم کی "عیاشی" کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ ان کے پاس کائی آلود صراحیاں رکھی تھیں جن پر المونیم کے پچکے ہوئے گلاس اوندھے پڑے تھے۔

اس پلیٹ فارم اور اُس پلیٹ فارم کے مسافروں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ میں زیادہ دیر تک وہاں کھڑا نہ ہوسکا اور "اپنے" پلیٹ فارم کی طرف لوٹنے لگا۔ لیکن میں جاننا چاہتا تھا کہ یہ پلیٹ فارم کن لوگوں کا ہے...... ایک قلی پانی کے نل سے منہ ہاتھ دھو رہا تھا۔ "کیوں بھائی

اس پلیٹ فارم اور اُس پلیٹ فارم کے مسافروں میں اتنا فرق کیوں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ نہیں جانتے جی؟" وہ پگڑی سے چہرہ پونچھتے ہوئے بولا "ادھر ہندوستان کے مسافر ہوتے ہیں جی...... ہندوستان سے آئے ہوئے لوگ...... اور ادھر تو جی اپنے مسافر ہوتے ہیں پاکستانی۔"

میں نے آزادی کا ایک طویل سانس اپنے بدن میں اتارا اور اپنے پلیٹ فارم پر چلا گیا اس خواہش کے ساتھ کہ خدا کرے میں ہمیشہ اسی پلیٹ فارم کا مسافر رہوں...... اور وہاں زندگی تھی۔

چونی گم ہو گئی ہے

میں لوہاری چوک سے گزرا تو بنک کے باہر اس کی موٹر سائیکل کھڑی تھی ..... اور
اس کی موٹر سائیکل یہاں ہو نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ علیل تھا اور پندرہ دن کی رخصت پر تھا
میں نے کہا پتہ کرنا چاہیئے۔ اندر گیا تو وہ ایک ضخیم رجسٹر پر جھکا ہوا تھا۔ جس کا عکس اس
کی عینک کے دبیز شیشوں پر دکھائی دے رہا تھا..... مجھے غصہ آ گیا۔ عجیب شخص ہے۔
مجھے پیغام بھجوایا تھا کہ میں بے حد بیمار ہوں اور آخری دموں پر ہوں۔ ہو سکتا ہے تو مل
جاؤ ورنہ پھر ملیں گے مگر خدا لایا، اور اب یہاں ڈیوٹی دے رہا ہے، اچھا خاصا صحتمند
دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ میں اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن وہ ایک عالم استغراق
میں سر جھکائے رجسٹر کو پیار بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے ایک زوردار کھنگورا
مارا جس کی آواز سن کر بنک میں نقد رقم لینے والے چونکنے ہو گئے اور دیگر سٹاف نے
مجھے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا لیکن قاضی راشد جاوید احمد رجسٹر پر جھکا رہا۔ تب مجھے شک
ہوا کہ ہو نہ ہو اس رجسٹر کے اندر کچھ گرم قسم کی تصویریں ہیں جنہیں وہ چوری چھپے دیکھ
رہا ہے اور بے حد لطف اندوز ہو رہا ہے اور اسے کچھ پتہ نہیں کہ اس کے پاس کوئی کھڑا
ہے اور کون کھڑا ہے..... لیکن رجسٹر پر سوائے اندراج شدہ رقوم کے ہندسوں کے
اور کچھ نہ تھا۔ چنانچہ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ "برادرم! تم بیمار تھے،
چھٹی پر تھے اب یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے ایک ایسے شخص کی طرح ناگواری سے سر
اٹھایا جو اپنی محبوبہ کے ساتھ راز و نیاز میں مشغول ہو اور جسے ڈسٹرب کر دیا گیا ہو اور

بولا "یار چونی گم ہو گئی ہے۔" اور پھر رجسٹر پر جھک گیا۔ اتنی دیر میں بنک کے مرزا صاحب
جو اپنی فقرے بازی میں مشہور ہیں ادھر آ نکلے۔ میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ میں نے پوچھا
مرزا صاحب یہ آج راشد کو کیا ہو گیا ہے، بات ہی نہیں کرتا۔ انہوں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔
"چونی گم ہو گئی ہے۔" اور ایک اکاؤنٹ ہولڈر کو اٹنڈ کرنے چلے گئے۔ راشد حسب سابق
سر جھکائے ہاتھ میں بال پوائنٹ تھامے، رجسٹر کے صفحات کو پلٹ رہا تھا اور ایک عالم
فراموشی میں تھا۔

بنک کا چپڑاسی بھی مجھے جانتا تھا۔ اس نے سلام کیا اور میرا حال پوچھا۔ میں نے کہا
میں تو ٹھیک ہوں لیکن یہ بھائی صاحب کچھ ٹھیک نہیں۔

اس پر چپڑاسی نے بھی سنجیدگی اختیار کر لی اور کہنے لگا "چونی گم ہو گئی ہے۔"

مجھے احساس ہوا کہ آج پورا سٹاف گرمی کی وجہ سے شاید "چل" گیا ہے یا پھر کسی
سازش کے تحت مجھے چھیڑا جا رہا ہے۔

منیجر صاحب کچھ چیک ہاتھ میں تھامے ادھر سے گزرے تو ان سے بھی سلام دعا
ہوئی۔ انہوں نے بھی یہی خبر سنائی کہ چونی گم ہو گئی ہے۔

ہر دو تین منٹ کے وقفے کے بعد سٹاف کا کوئی نہ کوئی ممبر نعرہ لگاتا..... "کیوں
بھئی مل گئی؟" اور راشد سر ہلا کر پھر رجسٹر میں گم ہو جاتا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد راشد کی عینک کے شیشوں میں ایک چمک چوند ہوئی، وہ اٹھا
اور اپنی مختصر سی چھاتی کو ایک گوریلے کی طرح پیٹتے ہوئے نعرہ لگایا..... "مل گئی".... اس
پر تمام سٹاف ممبران بھاگم بھاگ میزیں، کرسیاں پھلانگتے اس کے پاس آئے اور باری باری
بغلگیر ہو کر اسے مبارکباد دینے لگے۔ اس خوشی میں چائے منگوائی گئی اور پی گئی۔ جب
یہ افراتفری ختم ہوئی تو راشد نے میری طرف دیکھا اور حیران ہو کر کہنے لگا۔ شاہ جی آپ
کب آئے۔ کمال ہے، کھڑے کیوں ہو، بیٹھ جاؤ۔ میں بیٹھ گیا اور پھر اس مرد ناداں سے

پوچھا کہ بھائی یہ کون سی چونی تھی جو گم ہوگئی ہے اور اب مل گئی ہے تو کہاں ہے؟ اور پھر تم تو مرد بیمار تھے، یہاں کیا کر رہے ہو.....؟" اس پر اس نے اپنی داستان چونی بیان کی..... کہنے لگا کہ گھر سے دوائی لینے گیا تھا ڈاکٹر کے پاس، واپسی پر سوچا کہ عرصے سے بینک دوستان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ذرا سلام دعا کر لیں۔ یہاں آیا تو معلوم ہوا کہ پچھلے تین چار روز سے بینک کے ٹوٹل میں ایک چونی کا فرق آ رہا ہے..... یہاں کے یاروں نے بہت زور مارا ہے لیکن چونی پوری نہ ہوئی۔ مجھے اگرچہ بخار تھا اور چھٹی پر بھی تھا۔ لیکن یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی بینکر کو آپ کہیں کہ ٹوٹل پورا نہیں ہو رہا اور وہ اطمینان سے گھر چلا جائے..... چنانچہ صبح سے حساب کر رہا تھا اور فرق نکال لیا ہے۔ اگر نہ نکال سکتا تو رات کو نیند نہ آتی۔

یہ بینکوں کے لوگ بھی عجیب و غریب مخلوق ہیں۔ ان کے دو گھر ہوتے ہیں۔ ایک عارضی جس میں ان کے بال بچے ہوتے ہیں اور دوسرا بینک جس میں ان کے رجسٹر رہتے ہیں اور اس گھر سے وہ زیادہ محبت کرتے ہیں.............. اگر آپ کو کسی برانچ کے اندر کچھ وقت گزارنے کا اتفاق ہو تو آپ دیکھیں گے کہ بینکوں والے بہترین فقرے باز ہوتے ہیں اور جہاں ان کا حکم چلتا ہے وہاں ان کی زبان بھی چلتی رہتی ہے..... یہیں پر ایک مرزا صاحب ہیں جو لوگوں کی زبانیں باہر نکلوانے کے ماہر ہیں۔ مثلاً کوئی صاحب بہت دور سے ہانپتے ہوئے بینک میں داخل ہوتے ہیں تو مرزا صاحب سے فرمائش کی جاتی ہے کہ ذرا ان کی زبان تو باہر نکلوائیں۔ چنانچہ مرزا صاحب ان کے پاس آجاتے ہیں جو گرمی کی وجہ سے بالکل بونترے ہوتے ہیں اور ان سے مندرجہ ذیل مکالمہ کرتے ہیں۔

"ہاں جی! کیا کام ہے؟"

"جی، بل جمع کرانا ہے۔"

"کہاں سے آئے ہو!"

"سرکلر روڈ سے۔"

"اچھا تو پھر زبان دکھاؤ۔"

یہ گفتگو اتنی تیزی سے ہوتی ہے کہ جونہی مرزا صاحب کہتے ہیں کہ اچھا تو پھر زبان دکھاؤ ..... وہ صاحب بلا سوچے سمجھے اپنی زبان باہر نکال کر دکھا دیتے ہیں..... مرزا صاحب ذرا ان کا کام کر کے انہیں فارغ کر دیتے ہیں اور وہ بیچارے گھر جاتے ہوئے سوچتے رہتے ہیں کہ ان کے کہنے پر اپنی زبان باہر نکال دی۔

یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی صاحب جلدی جلدی اپنا حساب ختم کرنے کے لئے رجسٹر پر لکھ رہے ہیں اور مرزا صاحب قریب جا کر کہتے ہیں "السلام علیکم" وہ صاحب "وعلیکم السلام" بڑبڑاتے ہیں اور اپنے کام میں گن رہتے ہیں۔ تب مرزا صاحب ہاتھ آگے بڑھا کر کہتے ہیں۔ "یار ہاتھ ملاؤ۔" وہ صاحب مجبوراً سر اٹھا کر ہاتھ ملاتے ہیں اور اس دوران ٹوٹل بھول جاتے ہیں..... دوبارہ شروع کرتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد ایک مرتبہ پھر مرزا صاحب سلام کرنے کے لئے پہنچ جاتے ہیں۔

بینک کے لوگوں کی تنخواہیں کام کی نسبت بے حد قلیل ہیں مگر پھر بھی بہت کم لوگ بینک چھوڑ کر کسی دوسری جگہ ملازمت کرتے ہیں۔ یہ اپنے ہی خون کے ذائقے میں خوش رہتے ہیں اور ویج بورڈ ایوارڈ کے انتظار میں بوڑھے ہو کر فوت ہو جاتے ہیں..... گلبرگ نمبر ۳ کے ایک بینک میں داخل ہونے پر منیجر صاحب باقاعدہ آپ کے استقبال کے لئے دروازے پر آتے ہیں۔ بل جمع کروانے کے لئے سٹاف نے اپنے خرچ پر ایک کولر خرید رکھا ہے اور انہیں جلد از جلد فارغ کر دیا جاتا ہے..... یہ نہیں کہ تمام بینکوں والے فرشتے ہوتے ہیں۔ ان میں بھی "بڑا بڑا کاریگر" ہوتا ہے۔ لیکن وہ بالآخر پکڑا جاتا ہے۔ جبکہ دوسرے محکموں میں یہ کاریگر اپنی "کاریگریاں" دکھاتے رہتے ہیں اور کبھی پکڑے نہیں جاتے..... میرا چھوٹا بھائی بھی ایک بینک میں ملازم ہے۔ کئی سال کی سروس ہے مگر تنخواہ صرف اتنی ہوگی کہ عید کے لئے

اپنی بچیوں کے دو فراک اور دو جوتیاں خریدے اور بس..... کئی مرتبہ سمجھایا کہ بھائی میرے چھوڑو اس پیشے کو۔ کوئی اور کام کرو۔ کچھ نہیں تو مرغ چھولے لگا لو، بوٹ پالش شروع کر دو بینک سے زیادہ کماؤ گے۔ لیکن بینک میں جانے کیا افیون ہے کہ چھٹتی ہی نہیں۔ صبح سے رات تک ایک فلیٹڈ بلڈنگ میں کام کرتا ہے۔ ویسے ایڈورڈ ڈیوارڈ کی باتیں کرتا ہے اور بسوں اور ویگنوں میں دھکے کھاتا ہے...... لیکن بینک چھوڑنے کو تیار نہیں۔

بات چونی سے شروع ہوئی تھی۔ وہ چونی جو گم ہو گئی اور جسے بڑی مشقت کے ساتھ تلاش کر لیا گیا۔ بینکوں کے علاوہ پاکستان میں اور بھی بے شمار محکمے ہیں جن میں چونیاں گم ہوتی رہتی ہیں اور کوئی انہیں تلاش نہیں کرتا۔ چنانچہ وہ چونیاں اٹھنیوں میں بدلتی رہتی ہیں، پھر روپوں میں اور پھر لاکھوں اور کروڑوں روپوں میں..... اور تب سڑکیں اکھڑ جاتی ہیں۔ سکولوں، کالجوں، ہسپتالوں کی عمارتیں نامکمل رہ جاتی ہیں۔ اگر ان محکموں میں بھی ایسے لوگ موجود ہوں جو چونی کے گم ہو جانے پر فوراً اسے تلاش کرنے کے لئے بیٹھ جائیں تو پھر ہم ایک بہتر پاکستان میں رہ سکتے ہیں۔

عاشق اور انشورنس ایجنٹ

کہا جاتا ہے کہ عاشق اور انشورنس ایجنٹ کا اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔ دونوں کا پسندیدہ موضوع موت ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ میں..... میں تمہارے لئے جان دے دوں گا مر جاؤں گا اور جب میرا جنازہ جا رہا ہو گا تو تم وضو میں مشغول ہو گے اور میری قبر پر اگر بتی جلانے آؤ تو مرغ دو پٹے کر آنا وغیرہ وغیرہ۔ ادھر انشورنس ایجنٹ آپ کو دیکھ کر ہی اِنّا لِلّٰہ پڑھنے کا موڈ بنا لیتا ہے اور موضوع سخن کوئی بھی ہو وہ اسے موت کی طرف لے آتا ہے۔ شادی کے سہرے دیکھ کر اسے قبر کی چادر نظر آتی ہے اور وہ آپ کو یقین دلاتا رہتا ہے کہ "دلا غافل نہ ہو یک دم یہ دنیا چھوڑ جانا ہے۔" لیکن اپنے دوست خان صاحب ذرا مختلف ہیں۔ انہوں نے دوستوں کے علاوہ سینکڑوں شوق پالے ہوئے ہیں اور ان میں سے ایک شوق یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ کسی نہ کسی طریقے سے سدھر جائے۔ بہت سمجھایا کہ خان صاحب یہ شوق فضول ہے کچھ حاصل نہ ہو گا لیکن وہ باز نہیں آتے اور جب ملتے ہیں کیا؟ کب؟ اور سب سے زیادہ کیوں؟ کا استعمال کرتے ہیں.....

ہماری قوم اتنی گندی کیوں ہے؟ ہم رشوت کیوں دیتے ہیں؟ اگر قانون کہتا ہے کہ ویگنوں میں ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر نہیں لگائے جا سکتے تو پولیس والے کیوں!..... اخباروں والے کیوں! لگے روز میں بچوں کو سکول سے اٹھانے یعنی پک کرنے مال پر گیا اور فٹ پاتھ پر خوشگوار دھوپ میں کھڑا بچوں کا انتظار کر رہا تھا کہ خان کی سوزوکی "مشوں" کر کے مال پر سے گزر گئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر نظر آئی اور دوسری جانب چلی گئی۔ پانچ منٹ بعد کیا دیکھتا ہوں کہ ان کی کار پھر چلی آ رہی ہے۔ انہوں نے جو کر اپنی چھوٹی سی گاڑی کی پشت پر "جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو رولز رائس بن جاؤں گی۔"

کا سٹکر لگا رکھا ہے اس لئے دور سے پہچانی جاتی ہے۔ میں نے ہاتھ دیا تو وہ رک گئے پریشان حال، پسینے سے تر اور سانس چڑھا ہوا کار میں بیٹھے بیٹھے کہنے لگے میں تو مدار میں گھوم رہا تھا تم نے خواہ مخواہ روک لیا اور اب دوبارہ مدار میں کیسے جاؤں گا! میں نے سوچا کہ تیز دھوپ کی وجہ سے خان صاحب کچھ متاثر ہو گئے ہیں۔ "ٹھنڈا پیئں گے یا گرم؟" میں نے پوچھا "ہائیں؟" انہوں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا یہ کیا کہہ رہے ہو؟ اندر کروانا ہے؟ روزوں میں ایسی بات کرتے ہو؟

میں نے بھی اقرار کیا کہ جناب روزہ رکھنے کے باوجود یہ عادت نہیں جاتی۔

"تمہیں پتہ ہے کہ ایک صاحب کی کار گرم ہو گئی تو وہ اُسے کھڑی کر کے بونٹ اٹھا کر اس میں ٹھنڈا پانی ڈال رہے تھے تو پکڑے گئے۔"

"کس الزام میں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہی کہ روزوں میں آپ کسی کو پانی کیوں پلا رہے ہیں اس لئے..... اب تو یہ ہے کہ لوگ پے ہمراہ نہیں لاتے کہ اگر گرمی سے بے ہوش بھی ہو گئے تو کہیں سے پانی نہیں ملے گا۔"

"لیکن آپ کہاں گھوم رہے ہیں؟"

"بتایا تو ہے کہ مدار میں گھوم رہا ہوں۔ دراصل گھر والوں نے عید کی خریداری کرنی تھی انہیں انار کلی لایا تو....."

"جہاں رہتے ہو خریداری وہاں نہیں ہو سکتی تھی؟"

"ہو سکتی تھی" انہوں نے عینک صاف کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن میری ساس صاحبہ کا کہنا ہے کہ پچھلے پتہ نہیں کتنے برسوں سے انار کلی سے دوپٹہ لاتی ہوں تو اب بھی وہیں جاؤں گی۔"

"تم عید کے قرب و جوار میں ساس کو قریب نہ آنے دیا کرو" "ہا" انہوں نے قہقہہ لگانے کی ناکام کوشش کی۔ "اگر میں ایسا کروں تو وہ مجھے اپنی بیوی کے قریب نہ آنے دے۔ بہرحال خاندان بھر کو انار کلی کے قریب اتارا اور پھر کار پارک کرنے کے لئے جگہ تلاش کرنے لگا اور مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ پاکستان میں کاروں کی تعداد مکھیوں سے زیادہ ہے۔ کیونکہ مکھیوں کو بیٹھنے کے لئے

بڑی آسانی سے مل جاتی ہے لیکن کار پارک کرنے کے لئے جگہ ناپید ہے۔ جگہ جگہ تلاش کرتا ہوا بڑے ڈاک خانے تک آیا پھر ریگل تک اور پھر گورنر ہاؤس سے چکر لگا کر واپس گیا کہ کہیں میرے بچے انتظار کر رہے ہوں۔ اب چونکہ کہیں بھی کار روک نہیں سکتا تھا اور پارکنگ کے لئے جگہ نہ تھی اس لئے میں آہستہ آہستہ انار کلی سے گورنر ہاؤس کے مدار میں داخل ہو کر گھومنے لگا۔ یہ انار کلی کو نو ٹریفک زون کیوں نہیں بنایا جا سکتا؟ بالآخر انہوں نے اپنے پسندیدہ لفظ "کیوں" کو استعمال کر ہی دیا۔

"پتہ نہیں" میں نے بور ہو کر کہا۔

"اور سارے سال میں ایک ہی تو تہوار آتا ہے جسے ہم ذاتی طور پر کماتے ہیں" یعنی روزے رکھ کر عید کماتے ہیں تو نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر ایک عید نہیں ہو سکتی؟"

"پتہ نہیں" میں نے کندھے جھٹکے۔

"تمہیں پتہ کس بات کا ہے؟" وہ جھنجھلا گئے "تمہیں پتہ ہے کہ ہم میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ہم اپنی خامیوں کا اعتراف نہیں کرتے۔ اپنی غلطیوں کو نہیں مانتے۔ پُوری دنیا میں ہم شاید واحد قوم ہیں جو ہر وقت اپنے دفاع میں مصروف رہتے ہیں۔ جیسے اکثر چوکوں میں آپ دیکھتے ہیں اگر ٹریفک سارجنٹ نے کسی شخص کو اشارہ کاٹتے ہوئے پکڑ لیا ہے تو وہ شخص پچھلے پندرہ منٹ سے یہی بحث کر رہا ہے کہ نہیں میں نے اشارہ نہیں کاٹا....."

"کئی مرتبہ اس نے اشارہ نہیں کاٹا ہوتا" میں نے مسکرا کر کہا "اور کئی بار کاٹا ہوتا ہے" انہوں نے فوراً کہا "مثلاً آج ٹولنٹن مارکیٹ کے قریب سورج آنکھوں میں پڑ رہا تھا اور میں سرخ روشنی عبور کر گیا۔ سارجنٹ نے پوچھا تو میں نے کہا کہ جناب بالکل کاٹا اشارہ کاٹا ہے اور غلطی سے کاٹا ہے۔ معاف کر دیجئے یقین کرو کہ سارجنٹ ہکا بکا رہ گیا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر مجھے سیلوٹ مار کر بولا — "میری بائیس سالہ سروس میں آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنی غلطی تسلیم کی ہے میں آپ کو سلام کرتا ہوں اور آپ تشریف لے جائیں"....."

"کیا واقعی ایسا ہوا تھا؟"

"ہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے" انہوں نے ماتھے پر سے پسینہ پونچھا۔

یہ ساری گفتگو یوں ہوئی کہ وہ کار میں بیٹھے تھے۔ کار سڑک کے کنارے کھڑی تھی اور فٹ پاتھ پر کھڑے ایک سارجنٹ صاحب آ گئے۔ "آپ یہاں سڑک پر کار کھڑی نہیں کر سکتے۔"

"جی بالکل سارجنٹ صاحب! یہ میری غلطی ہے آپ درست فرماتے ہیں۔" خان صاحب مسکرا کر کہنے لگے۔

"درست فرماتا ہوں تو لاؤ ناں کاغذات تمہارا چالان کریں۔ پڑھے لکھے ہو کر قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ہاں جی ہم ایسا کرتے ہیں۔" سارجنٹ نے چالان بک نکالتے ہوئے کہا۔

میں نے مسکراتے ہوئے منہ دوسری طرف کر لیا کہ کہیں خان صاحب یہ نہ پوچھ لیں کہ کیوں۔۔۔!

"فینسی ڈریس"

میرے سر پر ایک مرغی بول رہی تھی۔

کٹ کٹ۔ کٹ کٹ ......

کٹ کٹ کرتی آئی مرغی ......

میں نے چار و ناچار آنکھیں کھول دیں۔ چھٹی کا دن تھا اور میں حسبِ معمول رضائی میں خیمہ زن اونگھنا چاہتا تھا لیکن مرغی کی کٹ کٹ نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔

"ابو میں مرغی ہوں" میرے سر پر عینی کھڑی تھی۔ سفید جھالردار میکسی میں ملبوس ناک پر سفید گتے سے بنی ہوئی ایک چونچ چپکائے اور سر پر انگریز گوالنوں ایسی سفید ٹوپی سجائے۔

بیٹے ٹھیک ہے آپ مرغی ہیں لیکن مجھے تو سونے دیں...... شاباش جائیے اور امی کے سرہانے کٹ کٹ کیجئے......"

"لیکن ابو آج تو میرے سکول میں فینسی ڈریس کا مقابلہ ہے اور آپ نے مجھے لیکر جانا ہے۔" وہ چونچ ہلا کر بولی۔ پچھلے کئی دنوں سے ہمارے گھر میں فینسی ڈریس کا ہنگامہ چل رہا تھا۔ میں نے شروع شروع میں تو کوشش کی کہ اس بے جا خرچ سے اجتناب کروں لیکن روزانہ عینی میرے سر پر کھڑی ہو جاتی: "ابو سب بچے فینسی ڈریس میں حصہ لے رہے ہیں پلیز مجھے کچھ نہ کچھ بنا دیجئے۔ بس کہتی ہیں کرو نہیں لنگر کر شہزادی بن جاؤ۔" میں نے سمجھایا کہ بیٹے لڑکیاں شہزادی نہیں بنا کرتیں۔ کم از کم شادی سے پہلے نہیں بنا کرتیں۔ پھر اس نے ملکہ بننے کی خواہش کی لیکن حبیرٹ موٹ کی ملکہ بنانے کیلئے بھی سینکڑوں روپے درکار تھے۔ ریشمی لباس ہیرے جواہرات اور تاج وغیرہ۔ دلہن بنانے کے لئے بھی

اصلی دلہن جتنا خرچہ تھا۔ چنانچہ مرغی بننے کے حق میں فیصلہ ہو گیا۔ جس کے لئے سفید سلکی کا جوڑا تھی اور صرف ایک عدد چونچ اور ٹوپی کی ضرورت تھی۔ اس روز کے بعد عینی دن رات "کٹ کٹ کرتی آئی مرغی۔ دال کا دانہ لائی مرغی" یاد کرتی رہتی۔ البتہ مجھے یاد نہ رہا کہ میرے واسطے جس روز یہ فینسی ڈریس شو منعقد ہونا ہے اور مجھے اپنی گرم رضائی چھوڑ کر عینی کو ساتھ لے جانا ہے اب وہ میرے سر پر کھڑی کٹ کٹ کر رہی تھی۔

"بیٹے اگر آپ سکول نہ جائیں تو میں دوپہر کو آپ کے لئے ڈھیر سارے چاکلیٹ خرید لاؤں گا۔" میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

عینی نے اپنی ناک اور ٹوپی اتاری اور رونے کی تیاری کرنے لگی..... "ہائے ابو میرے چوزے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میری مس مجھے مارے گی۔ میں نے جانا ہے۔" چنانچہ مجھے بستر سے باہر آنا پڑا۔

سکول پہنچے تو عینی کے "چوزے" اِدھر اُدھر گھوم پھر رہے تھے۔ انہیں فوراً اکٹھا کیا گیا اور مس ذکیہ چارلس کی نگرانی میں ریہرسل شروع ہو گئی۔ سٹیج کے عین سامنے فینسی ڈریس میں حصہ لینے والے بچے اور اُن کی اتالیاں جنہیں یہاں مسیں کہا جاتا ہے براجمان تھیں اور پچھلی نشستوں پر والدین اپنے بچوں کی نوک پلک درست کر رہے تھے۔ شو کا آغاز ہوا تو پہلی اور دوسری جماعتوں کے بچے سٹیج پر آنے لگے۔

"میں فقیر ہوں۔ دے جا بابا اللہ کے نام پر۔" پھٹے ہوئے کپڑے اور نقلی داڑھی جو بہت بڑی تھی اور تالیاں۔

"میں قلی نمبر ۲۰۴ ہوں سامان اُٹھا لوں۔"

"میں ہمٹی ڈمپٹی ہوں" ایک گول گپا سٹیج پر آ گیا۔ بچوں کے قہقہے اور تالیاں۔

"میں مالن ہوں" ایک بچی پھولوں کی ٹوکری اٹھائے سٹیج پر آئی اور پھولوں کی پتیاں ہوا میں اچھالنے لگیں۔

"میں ملنگ ہوں..... میں پائلٹ ہوں..... میں سندھی بچہ ہوں..... میں پہلوان ہوں..... میں لال پری ہوں..... میں دلہن ہوں..... میں مہاراج کرشن ہوں..... میں پوپ پال ہوں....." اور یوں روپ بہروپ کا سوانگ جاری رہا جس پر کئی ماہ کی محنت اور ہزاروں روپے خرچ کئے گئے۔

علامہ اقبال کی نظم "ماں کی دعا" کلاس ٹو بی نے پیش کی اور بے حد خوبصورتی سے پیش کی۔ پھر مشاعرہ شروع ہو گیا جس میں میر تقی میر، غالب، اقبال، بہادر شاہ ظفر کے بعد صادق جی اور ڈاکٹر شار جیسے مشہور شعراء نے اپنا کلام پڑھا..... یہ تمام شعراء سات سے آٹھ سال کی عمر کے تھے.....

اس کے بعد وہ آئٹم پیش کی گئی جس کے لئے مجھے صبح صبح یہاں آنا پڑا تھا۔ قرۃ العین نادر نے اپنی چونچ درست کی اور اپنے درجن بھر چوزوں سمیت سٹیج پر جا کر "کٹ کٹ کرتی آئی مرغی" سنانے لگی اور پھر ایک بڑی ساری چیل اس کے چوزوں پر حملہ آور ہوئی اور بی مرغی نے اپنے پروں میں سمیٹ کر چوزوں کو بچا لیا..... میں نے بھی خوب تالیاں بجائیں۔

ایک ٹیبلو میں "حضرت عمرؓ کا انصاف" پیش کیا گیا۔ لمبی داڑھیوں والے دو عرب سٹیج پر گھومنے لگے اور ایک ایسی لڑکی کو انعام دیا جس نے اپنی ماں کے کہنے کے باوجود دودھ میں پانی ملانے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ خلیفہ اگر موجود نہ ہو تو تب بھی ملاوٹ کرنا اسلام میں حرام ہے.....

سب سے عمدہ اور سبق آموز ٹیبلو تحریک پاکستان کے بارے میں تھا جس میں تحریک کے تمام زعماء کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا تھا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ تمام بچے جو قائداعظم، علامہ اقبال، لیاقت علی خان، محترمہ فاطمہ جناح بنے گھوم رہے ہیں، صرف دوسری جماعت میں پڑھتے ہیں۔ علامہ اقبال شعر پڑھتے اور سٹیج پر ان کے شعروں کی تصویر ظاہر ہو جاتی۔ شاہین نمودار ہو جاتے۔ یہ غازی تیرے پُراسرار بندے سامنے آ جاتے۔ لیاقت علی خان کی عینک اگرچہ بہت بڑی تھی لیکن انہوں نے اسمبلی میں پاکستانی پرچم لہرایا۔ "علامہ اقبالؒ کہہ

مونچھیں کبھی کبھار گر جاتیں اور وہ انہیں فوراً لگا لیتے..... ستاروں سے آگے جانے والے سیارے بھی دکھائی دیتے جن کے گرد بے شمار ستارے تھے اور بے حد پیارے تھے. تقریب کے اختتام پر پرنسپل گلیڈسن داس نے میزبانی کے فرائض سنبھال لیے اور لاہور کے بشپ کی بیگم نے بچوں کو انعام تقسیم کیے. شکایت یہ ہے کہ صرف بچوں اور استانیوں کو ہی انعام کیوں دیئے گئے. بچوں کے والدین بھی تو مہینے کے امتحان میں بمشکل پاس ہوئے تھے. انہیں بھی کوئی ٹافی یا چاکلیٹ تھما دیا جاتا.

ہم گھر واپس آ رہے تھے تو مینی پوچھنے لگی "ابو آپ جب چھوٹے تھے تو فینسی ڈریس ہوتا تھا؟"

..... میں نے کہا: "ہاں ہوتا تھا..... کئی بچے فقیر ہوتے تھے، قلی ہوتے تھے، غریب ہوتے تھے اور ایک دن کے لئے نہیں ہمیشہ کے لئے ہوتے تھے."

"ابو!" اس نے ایک دم میرا کندھا پکڑ لیا. "مجھے یاد آیا مس کہہ رہی تھیں کہ ایتھوپیا کے بچوں کے لئے امداد چاہیے گھر سے پیسے لے کر آؤ..... ابو یہ ایتھوپیا کہاں ہے؟" میں نے اسے بتایا کہ افریقہ میں ایک ملک ہے جسے حبشہ کہتے ہیں: "اچھا تو ابو!" وہ معصومیت سے کہنے لگی: "ایتھوپیا کے بچوں کو پیسے اس لئے بھیجتے ہیں تاکہ وہ بھی فینسی ڈریس شو میں حصہ لے سکیں؟"

"ہاں بیٹے..... وہ بہت دنوں سے فینسی ڈریس میں حصہ لے رہے ہیں..... بھوک کے فینسی ڈریس میں."

"نجا خاکروب"

ہر گلی ہر کوچہ ہر بازار اپنے آپ میں ایک مکمل دنیا ہوتی ہے. پیدائش سے شروع ہو کر مرگ تک کے تمام مراحل آنکھوں کے سامنے آتے رہتے ہیں. محبتوں، ذلتوں، محرومیوں کے مارے لوگ، کامیابیوں، خوشیوں اور توانائیوں سے دمکتے چہرے..... آپ بے شک ساری عمر اس گلی کوچے یا بازار سے باہر قدم نہ رکھیں صرف دیکھتے رہیں اور آپ کو کل دنیا کا عکس اس میں نظر آتا رہے گا. میں بھی اپنے بازار میں دیکھتا رہتا ہوں اور لوگ گزرتے رہتے ہیں. مجھے معلوم ہے کہ کون سا چہرہ دفتر سے کتنے بجے واپس آتا ہے اور میرے سامنے سے گزرتا ہے. فٹ پاتھ پر سے گزرنے والے بچوں کے بارے میں جانتا ہوں کہ انہیں کتنے بجے چھٹی ہوتی ہے. ان لوگوں کو میں اس ہجوم سے علیحدہ پہچانتا ہوں جو اپنے کام کاج اور روزگار کے سلسلے میں ضرور یہاں سے گزرتے ہیں. صرف اسی ایک روز..... بازار کا خاکروب بھی ایک چہرہ ہے جسے میں مدتوں سے دیکھ رہا ہوں. بازار میں جھاڑو دیتے ہوئے، گندی نالیوں میں گھسے ہوئے ہوئے، غلاظت اٹھاتے ہوئے اس کی مونچھیں غالباً سفید ہیں. کیونکہ جو کام وہ کرتا ہے اس میں سفیدی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی. جسم فرعونوں کی سوکھی ہوئی ممیوں کی طرح ہے اور وہ اتنی دیر سے جھاڑو پر جھکا رہا ہے کہ اب سیدھا نہیں ہو سکتا. اسی طرح جھکا جھکا چلتا ہے. ظاہر ہے میں نے اس کے ساتھ گفتگو بھی نہیں کی اس کے سلام کا جواب نہیں دیا..... لیکن وہ میرے سامنے رہتا ہے. آج صبح وہ اپنا ابتدائی کام نپٹانے کے بعد سامنے والے تھڑے پر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا..... میں نے اسے دیکھا اور سر جھکا کر اپنے کام میں محو ہو گیا.

"سلام باؤجی۔" میں نے سر اُٹھایا وہ باہر فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔
"سلام باؤجی!"

"کیا بات ہے؟"

"بھلا ہووے خیر ہووے آپ سے بات کرنی ہے باؤجی۔"

"اندر آجاؤ۔"

وہ..... جھجکتا..... ہوا اندر آیا اور فرش پر بیٹھ گیا۔ میں نے اُسے کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا تو وہ شرما سا گیا۔ "نہیں باؤجی....."

"کچھ نہیں ہوتا کرسی کو..... بیٹھ جاؤ....." وہ بیٹھ تو گیا لیکن بالکل کنارے پر جیسے ابھی فرش پر بیٹھ جائے گا۔ "کیا بات ہے؟"

خیر ہووے باؤجی آپ اخبار میں مضمون لکھتے ہو..... مجھے اچھو نے بتایا تھا جی۔ اس نے بتایا تھا جی کہ آپ نے لکھا ہے کہ اس بازار میں صفائی نہیں ہوتی۔"

اچھو کہنے لگا باؤجی نے لکھ دیا ہے کہ تم صفائی نہیں کرتے اس لئے کارپوریشن والے تمہیں جواب دے دیں گے..... باؤجی! میں غریب آدمی ہوں۔" اس نے ہاتھ جوڑے اور کھڑا ہو گیا۔ "میں نے کبھی حرام نہیں کھایا جی..... پوری صفائی کرتا ہوں، صبح جھاڑو دیتا ہوں، نالیاں صاف کرتا ہوں، کیچڑ اٹھاتا ہوں..... بیس بائیس سال ہو گئے جی اس بازار میں مجھے..... باؤجی میں غریب آدمی ہوں"..... میں اسے بیس بائیس برس سے دیکھ رہا تھا اور مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ بولتا بھی ہے اور اس کی مونچھیں سفید ہیں اور وہ ایک انسان ہے میری طرح کا..... "بیٹھ جاؤ..... آرام سے....."

"نہیں جی!" وہ ہاتھ جوڑے کھڑا رہا۔ "باؤجی اس بازار میں میں اکیلا صفائی کرتا ہوں باقی سب لوگ گند ڈالتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں صفائی رکھنا صرف میرا کام ہے۔ بڑا بڑا صاحب کیلے کھا کر چھلکے سڑک پر پھینکتا ہے جی..... سبزی والے اپنی گلی سڑی سبزیاں نالیوں میں پھینک

دیتے ہیں، قصائی لوگ اوجھڑیاں پھینک دیتے ہیں اور وہ پھول کر بجلکانا ہو جاتی ہیں اور نالی بند ہو جاتی ہے۔ میں تو جی نالیوں میں گھسا رہتا ہوں سارا دن آپ نے بھی دیکھا ہوگا..... گٹر بند ہو جائے تو سردیاں گرمیاں میں ہی اس میں غوطے لگا لگا کر کھولتا ہوں..... صبح آتا ہوں اور رات کو جاتا ہوں اللہ بھلا کرے..... اچھو کہہ رہا تھا جی۔"

"اچھو غلط کہتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یار تم بیٹھ جاؤ کرسی پر..... بیٹھ جاؤ" میں نے مصنوعی غصے سے کہا اور وہ بیٹھ گیا۔

"نام کیا ہے تمہارا؟"

"بجا!"

"پورا نام کیا ہے؟"

"بجا ولد مولا۔"

"لیکن بجا تو کوئی نام نہ ہوا..... کچھ اور ہوگا۔"

"یہی ہے جی بجا..... شناختی کارڈ پر بھی یہی لکھا ہے۔ بجا ولد مولا مذہب عیسائی..... پہلے ہم بالمیکی ہوتے تھے....."

"رہتے کہاں ہو؟"

"موچی دروازے کے اندر پتھراں والی حویلی میں....."

میں نے اسے ایک سگریٹ پلایا کہ ذرا تو وہ رواں ہو گیا۔" میں نے باؤجی ہوش سنبھالی تو ماں باپ کا بڑھاپا دیکھا۔ بہن کو جوان دیکھا۔ بڑے بھائی شادیاں کروا کر علیحدہ ہو گئے۔ ماں باپ کی خدمت کی کو ٹھے اتار اتار کر بہن کا بیاہ کیا پھر میری شادی ہو گئی۔ اللہ پاک نے آگے پیچھے چھ بیٹیاں بخش دیں۔ میں انہیں سنبھالتا رہا بیٹے کی خواہش تھی۔ بیوی کو لے کر داتا صاحب پیر مکی اور مادھو لال کے مزاروں پر جا کر بیٹا مانگا اور صاحب آپ کے پاؤں کی خیرات بیٹا مل گیا۔ پھر باؤجی بیوی کو کینسر ہو گیا۔ میں نے کہا بھلی لوک میں گھر کے برتن بیچ دوں گا، فقیر ہو جاؤں گا لیکن تیرا علاج کرواؤں گا۔

وہ مانی ہی نہیں۔ کہنے لگی چھ پہاڑ گھر میں ہیں اُن کو کیسے نکالو گے..... پھر وہ مر گئی..... اور میں باؤ جی کام کر کر کے ماڑا ہو گیا۔ میرا اَب نکل آیا ہے اُن کی شادیاں کرتے کرتے..... وہ جب تک زندہ تھی تو میرا خیال رکھتی تھی۔ روٹی بڑی پکا کر دیتی تھی..... بچے کی مونچھیں تھر تھرانے لگیں اور نظر چرا کر باہر دیکھنے لگا۔ بس جی زندگی اس طرح ہی گزر گئی..... عمر؟ نہیں جی! پتہ نہیں میری عمر کیا ہے..... ؟ میں تو جی سائیکل چلانا بھی نہیں جانتا۔ گھڑی دیکھنی نہیں آتی مجھے..... جی! لاہور سے باہر ایک مرتبہ گیا تھا ڈیرہ غازیخان سخی سرور کے دربار میں سلام کرنے..... پچھلے ہفتے بیٹے کی شادی کر دی ہے۔ بڑا بے نیاز ہے قادر کریم ہے اس نے مجھ غریب کو بیٹا دیا دنیا کے ساتھ ملا دیا..... باؤ جی میں غریب آدمی ہوں میرا خیال رکھنا!" اُس نے پھر ہاتھ جوڑ دیئے۔

"اوئے نجے"! باہر ایک دکاندار کھڑا تھا۔ "اوئے دکان کے نیچے کی نالی بند ہو گئی ہے وہ تیرا پیو کھولے گا چل"

"بسم اللہ جی..... تسی چلو میں آیا..... بھلا ہووے، خیر ہووے باؤ جی مولا آپ کو زندگی دے....." اور نجا اُٹھ کر چلا گیا.....

ہاں باقی سب لوگ گند ڈالتے ہیں اور نجا اکیلا صفائی کرتا ہے۔

"بیگمات اور سیلاب

"بیگم برقان"

"ہائے بیگم فرقان"

"میں نے سوچا ہمارے خاوند تو ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں کیوں نہ ہم بھی سہیلیاں بن جائیں"۔ "ہائے بیگم فرقان آپ کتنی سویٹ ہیں۔ میں بھی کئی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ آپ کے ہاں آؤں اور ملاقات کروں۔ لیکن آج کتنی خوش قسمتی کی بات ہے کہ یہاں دریائے راوی کے پل پر ملاقات ہو گئی"

"جی ہاں میں نے آپ کو فوراً پہچان لیا کہ آپ ہی بیگم برقان ہیں کیونکہ آپ دور سے ہی کچھ زرد زرد سی نظر آ رہی تھیں"

"تو آج ادھر کس طرح آنا ہوا؟"

"بس ایسے ہی انجائے منٹ کے لئے آ گئی..... گھر میں بور ہو گئی تھی۔ کوئی نئی انڈین فلم بھی نہیں تھی کہ آرام سے وی سی آر پر دیکھتی۔ چنانچہ یونہی اخبار دیکھ لیا اور ہائے کتنی خوفناک خوفناک خبریں تھیں اس میں کہ ہمارے ملک میں فلڈ وغیرہ آ گیا ہے....."

"میں بھی کچھ نہیں کر رہی تھی اس لئے ڈرائیور کو کہا کہ کسی اچھی سی جگہ لے چلو تو وہ کہنے لگا کہ بی بی جی ان دنوں راوی کے پل پر بڑی رونق ہوتی ہے۔ لوگ وغیرہ ڈوب رہے ہوتے ہیں تو ذرا وقت اچھا گزر جاتا ہے اس لئے ادھر آ گئی....."

"تو پھر مزا آیا؟"

"ہاں بہت...... دیکھو ناں یہاں اور بند کے اوپر جو ہزاروں لاکھوں غریب لوگ بیٹھے ہیں اور شاید بھوکے وغیرہ بھی ہیں تو ان کو دیکھ کر میرے دل کو کچھ ہوتا ہے۔"

"بس یہی تو انسانیت ہے۔"

"تو یہاں آنے سے پہلے میں نے کچھ پرانے کپڑے اور جوتے وغیرہ کار میں رکھ لئے اور لوہاری گیٹ سے کچھ نان اور ایک دیگ چاول خرید لئے......"

"ہاؤ سویٹ...... لیکن آپ نے ابھی تک نان اور چاول ان غریب لوگوں میں تقسیم کیوں نہیں کئے؟"

"ادھر کوئی فوٹو گرافر ہی دکھائی نہیں دے رہا......"

"ہاں تصویر کے بغیر سوشل ویلفیئر کا کیا فائدہ...... آپ کی تصویر اخبار میں چھپے گی کہ بیگم برہان سیلاب زدگان میں چاول تقسیم کر رہی ہیں تو پورے ملک کو پتہ چلے گا کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے ہوئے بلکہ اپنے بہن بھائیوں کے دکھ درد میں ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔"

"تو اور کیا...... ورنہ تصویریں تو ہماری اترتی رہتی ہیں۔"

"ویسے پل پر سے پانی کتنا خوفناک لگ رہا ہے؟"

"جی ہاں...... ویسے ایک بات کہوں؟ اور چاہے بھئی کوئی ناراض ہی کیوں نہ ہو جائے ضرور کہوں گی کہ یہ لوگ جو سیلاب کی وجہ سے اپنے گھروں کی چھتوں پر بیٹھے ہوئے ہیں تو بہت خوش قسمت لوگ ہیں اپنے گھر کی چھت پر بیٹھ کر ان کو کتنا زبردست منظر نظر آتا ہوگا...... ہر طرف پانی ہی پانی......"

"اور وہ چھتوں پر بیٹھ کر وہ گانا گا سکتے ہیں کہ ہر طرف پانی ہی پانی ہے لیکن پینے کے لئے پانی کا ایک قطرہ نہیں......"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن ان بیچاروں کو ویسٹرن میوزک کا کیا پتہ؟"

"ویسے آپ نے ادھر کوئی لاش وغیرہ پانی میں بہتی ہوئی دیکھی؟"

"نہیں۔"

"اور کوئی بچہ یا بوڑھا ڈوبتا ہوا؟"

"نہیں۔"

"کتنی زیادتی ہے...... اخباروں میں تو یہی لکھا ہوتا ہے اور یہاں کچھ بھی نہیں ہے...... میری بڑی خواہش تھی کہ کوئی لاش واش وغیرہ تیرتی ہوئی دیکھوں......"

"ہاں...... اور کوئی ڈوبتا ہوا شخص بھی...... وہ بھی تو خوب منظر ہوتا ہے۔"

"مجھے یہاں آکر بہت مایوسی ہوئی ہے۔ اب اتنا بڑا سیلاب بھی نہیں جتنا شور مچایا جاتا ہے اور اس سیلاب سے ہم لوگ ان کی نسبت زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔"

"ہاں اصل سیلاب زدگان تو ہم ہیں۔ مثلاً یہ کہ میرے کچھ سرونٹس ادھر سے آتے تھے محمود بوٹی کی طرف سے تو وہ پچھلے تین دن سے نہیں آئے کیونکہ ان کے گھر پانی میں گھرے ہوئے ہیں......"

"تو پھر آپ نوکروں کے بغیر کیا کرتی ہیں؟"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ ہمیں زیادہ تکلیف ہوئی ہے سیلاب سے تو وہ نوکر نہیں آئے تو میں نے گھر کا سارا کام دوسرے نوکروں سے کرایا اور بہت تھک گئی......"

"میرا بھی یہی حال ہوا۔ پھل خریدنے گئی تو دوکاندار کہنے لگا کہ بی بی جی صرف سیب ہیں اور کوئی پھل نہیں کیونکہ راستے بند ہیں...... تو مجھے گرما بہت پسند ہے تو وہ بھی نہیں تھا تو میں نے پچھلے تین دن سے گرما نہیں کھایا سیلاب کی وجہ سے۔"

"ہائے بیگم فرقان مجھے تو آپ پر ترس آتا ہے آپ نے تین دن سے گرما نہیں کھایا سیلاب کی وجہ سے اور پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ ہم ان کے دکھ نہیں بانٹتے۔ اور میری سنیئے۔ آپ کو پتہ ہے لاہور کے اردگرد جو گاؤں اور کھیت ہیں تو ان سے سبزی آتی تھی تو مجھے باسی سبزی ملی اور بہت مہنگی۔"

"دراصل سب سے زیادہ تو ہم لوگوں کو مصیبت پڑتی ہے ناں..... جو لوگ گھر بار کھاتے ہی نہیں تھے ان کو تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ یا جن کے نوکر نہیں ہیں۔"

"اور یہاں دیکھئے گرداوی کے آس پاس کتنی رونق ہے۔ سیاسی جماعتوں نے جھنڈے لگا رکھے ہیں۔ کرسیاں میز سجا رکھے ہیں اور لاؤڈ سپیکر پر متاثرین کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا جا رہا ہے تو ان سیلاب زدگان کو اور کیا چاہیے۔"

"ہم لوگ بھی تو اتنے آرام دہ گھروں سے نکل کر خاص طور پر ادھر آئے ہیں۔ ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنے کے لئے..... ہم سے کوئی اظہار ہمدردی نہ کرائے تو اس سے بھلا کیا قصور.....؟"

"جی ہاں اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ سیلاب وغیرہ بہت دردناک ہے۔ حالانکہ بیگم برقان ادھر ہندوستان سے اس میں تین سکھ بہتے ہوئے آ گئے تو کیا یہ مزیدار بات نہیں۔"

"ہاں یہ تو سیلاب کا پازیٹو پہلو ہے..... دردناک پہلو یہ بھی ہے کہ ایک آدمی کے بچے مر گئے تو وہ انہیں دفن نہیں کر سکا اور ان کو پانی میں بہا دیا۔"

"ہاؤ سٹوپڈ..... حالانکہ اسے چاہیے تھا کہ اسی وقت ایمبولینس وغیرہ کے لئے فون کر دیتا....."

"ہو سکتا ہے کہ اس کے گھر کے چاروں طرف پانی ہے اور وہ پچھلے کئی دنوں سے مکان کی چھت پر بھوکا پیاسا بیٹھا رہا ہو....."

"ہاں تو ہو سکتا ہے..... لیکن یہ بچوں کی لاشیں پانی میں بہا دینا بہت ہی ظلم ہے..... ہم اس بارے میں پروٹسٹ کریں گے....."

"بیگم فرقان آپ کتنی دیر یہاں کھڑی رہ کر نظارہ وغیرہ کریں گی۔"

"بیگم برقان نظارہ کیا خاک کرنا ہے کوئی لاش وغیرہ تو دکھائی نہیں دیتی۔ اگر پانی میں سے ابھرتا ہوا کسی بچے کا ہاتھ وغیرہ ہی دکھائی دے جاتا تو یوں وقت ضائع نہ ہوتا..... آپ کے نان اور چاول پروگرام کا کیا ہوگا۔!"

"فوٹو گرافر ہی نہیں آیا ابھی تک..... اس لئے میں تو گھر چلتی ہوں اور اولمپکس کی جھلکیاں دیکھنے....."

"ایک بات ضرور بتاتی جائیں..... یہ لوگ جو شور مچاتے ہیں کہ لاہور سے راولپنڈی جانے والی جی ٹی روڈ بند ہے اور ریلوے لائن پر پانی ہے اس لئے ٹرینیں بھی نہیں چل رہی تو یہ سب لوگ بائی ایئر کیوں سفر نہیں کرتے؟"

"بالکل..... اور بائی ایئر سفر کرنے سے سیلاب دکھائی دے گا اور آپ چھ ہزار میٹر کی بلندی سے متاثرین کے ساتھ اظہار ہمدردی کر سکتے ہیں۔"

"خدا حافظ بیگم برقان....."

"بائے بائے بیگم فرقان....."

"ایک لنگوری کالم"

اگر لاہور کے چڑیا گھر سے ایک عدد لنگور فرار ہو گیا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے اگر ڈارون کی تھیوری کو مان لیا جائے تو وہ تو میرا بھی اتنا ہی قریبی ہے جتنا کہ پاکستان کے باقی لوگوں کا..... لیکن اس کے باوجود جس دن سے وہ لنگور فرار ہوا ہے اور پھر تھانہ سول لائن میں اس نے اپنی گرفتاری پیش کی ہے لوگ میری طرف عجیب عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے انہیں شک ہو کہ جس لنگور نے تھانے میں گرفتاری پیش کی ہے وہ دراصل وہ لنگور نہیں جو فرار ہوا تھا وہ لنگور کوئی اور لنگور ہے اور ہو سکتا ہے کہ میں بھی کہیں سے فرار ہو کر ادھر آ نکلا ہوں.....

اس لنگوری سلسلے میں مجھے دو تین خطوط بھی موصول ہوئے ہیں۔ ان میں سے دو خط تو بے حد غیر سنجیدہ انداز میں تحریر کئے گئے ہیں اور ان میں مجھے طرح طرح کے القابات سے نوازا گیا ہے؟..... ان میں سے ایک لقب چاچا لنگور کا بھی ہے..... یہ بھی لکھا گیا ہے کہ جی آپ جانوروں کے بارے میں بہت ٹچی ہیں اور ہمیشہ انسانوں کی نسبت بھالوؤں، بندروں اور کتوں وغیرہ کے بارے میں زیادہ کالم لکھتے ہیں اسی لئے ہمیں شک ہے کہ کہیں آپ بھی..... لیکن ان میں سے ایک خط نہایت بردباری سے تحریر شدہ ہے۔ پاکستان کے کس شہر سے آیا ہے اس کا کچھ پتہ نہیں اور لکھنے والے نے اپنا نام "انیمل لور" یعنی جانوروں سے محبت کرنے والا لکھا ہے..... یہ صاحب لکھتے ہیں..... میں آپ کے کالم احتیاط اور پیار سے پڑھتا ہوں۔ احتیاط سے اس لئے کہ کبھی کبھار آپ کا کوئی بے حد معصوم سا کالم اپنے معانی میں انتہائی زہرناک ہوتا ہے اور پیار سے اس لئے پڑھتا ہوں کہ آپ میں محبت کا جو جذبہ ہے وہ صرف انسانوں کے لئے ہی مخصوص نہیں بلکہ آپ

قدرت کے تمام تر مظاہر اور درندوں، چرندوں اور پرندوں سے بھی محبت کرتے ہیں۔ آپ کا وہ کالم جس میں آپ نے ایک بھالو کی شان میں ایک آزاد نظم تحریر کی ہے بہت پسند آیا..... پچھلے دنوں لاہور کے چڑیا گھر کے ایک لنگور کے فرار ہونے کی خبر چھپی تھی مجھے حیرت ہے کہ آپ نے ابھی تک اس غریب کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ وہ کون سے عوامل تھے جن کی بنا پر لنگور چڑیا گھر سے بھاگ گیا اور پھر خود ہی گرفتاری پیش کر دی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اگر آپ بھالو کی طرح لنگور کی شان میں بھی ایک آزاد نظم تحریر کریں..... میں شکر گزار رہوں گا..... آپ کا انیمل لور.....

جانوروں سے محبت کرنے والے اس شخص نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں اس لنگور پر ایک لنگوری کالم ضابطہ تحریر میں لے آؤں۔

دیکھنا یہ ہے کہ لنگور چڑیا گھر کی تمام تر راحتوں کو چھوڑ کر انسانوں کی دنیا میں کیوں بھاگ کر آیا! آخر چڑیا گھر میں اسے شکنے کے علاوہ کیا کام تھا..... کیا اسے یہ غلط فہمی تھی۔ کہ چڑیا گھر کے باہر دراصل ایک جنگل ہے اور وہاں لنگور ہی لنگور ہیں اور وہ اپنے لنگور برادران میں شامل ہونے کے لئے چڑیا گھر سے نکلا تھا اور جب اس نے باہر آ کر دیکھا کہ وہاں تو لنگوروں کی بجائے انسان ہیں تو اس نے مایوس ہو کر گرفتاری پیش کر دی۔ وہ انسانوں سے کیوں مایوس ہوا؟ یقیناً اس نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ہو گا اور وہ کچھ دیکھا ہو گا جو انسان کرتے ہیں۔ اسی لئے اس نے اسی میں بہتری سمجھی کہ چڑیا گھر واپس چلا جائے۔

ویسے چڑیا گھر میں انسان خود اپنے پلے سے رقم خرچ کر کے اسے اپنی شکلیں دکھانے آجاتے تھے! شاید اس نے یہ محسوس کیا ہو کہ باہر کی دنیا اور چڑیا گھر میں کوئی فرق نہیں سوائے اس کے کہ وہاں کوئی قتل نہیں ہوتا یا بھوکا نہیں مرتا اور چڑیا گھر میں بچوں کے بیگار کیمپ بھی نہیں ہیں..... یقیناً اس نے چڑیا گھر کو باہر کی دنیا سے بہتر پایا ہو گا..... تبھی تو واپس آ گیا..... سوال تو یہ ہے کہ اگر لنگور چڑیا گھر سے تنگ آ کر جاتا ہے تو وہ فرار ہو کر انسانوں کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے اگر انسان اپنی دنیا سے تنگ آ جائے تو کیا وہ چڑیا گھر جا سکتا ہے..... رہائش اختیار کرنے کی

غرض سے ...... یہ بہت اہم سوال ہے اور اس کا ایک متوقع جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کا کیا خیال ہے کیا ہم فی الوقت ایک چڑیا گھر میں رہائش پذیر نہیں جو اسے چھوڑ کر کسی اور چڑیا گھر میں جانے کی کوشش کریں ...... ! پنجرے تو یہاں بھی ہیں اور طرح طرح کی بولیاں بھی سننے میں آتی ہیں ...... اخباری اطلاع کے مطابق لنگور نے اپنی مرضی سے سول لائن تھانے میں گرفتاری پیش کر دی۔ اس میں ظاہر ہے کہ زیب داستان کا عنصر بھی شامل ہے۔ لنگور نے اگر گرفتاری ہی پیش کرنی تھی تو گلبرگ تھانے میں کیوں نہ پیش کی ! ظاہر ہے کہ وہ غریب کا بال چڑیا گھر سے نکلا اور اس کی دیوار سے ملحقہ تھانے میں جا نکلا۔ جہاں دھر لیا گیا ! اور شاید تھانے والوں کو بہت بعد میں احساس ہوا ہو کہ جو انہوں نے گرفتار کیا ہے وہ کوئی انسان نہیں بلکہ ایک لنگور ہے ...... کیونکہ گرفتار کرتے ہوئے وہ انصاف کے ترازو کو پکڑتے ہیں اور ان کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی ہے اور انہیں کیا پتہ کہ وہ کس کو گرفتار کر رہے ہیں۔ بس یہ کہ گرفتار شدہ کوئی غریب غربا ہو تو اگلے روز اس کے نام پتے، تصویر اور تفصیل بہت اخبار میں خبر لگ جاتی ہے اور اگر کوئی صاحب ثروت کا بیٹا ہو تو اسے ایک اہم شخصیت کا بیٹا کہہ کر چپکے سے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب وہ گرفتار کئے جانے والے "مجرم" کی تصویر اتارنے لگے ہوں گے تب انہیں پتہ چلا ہو گا کہ ادھو یہ تو لنگور ہے ......

ویسے ایک قیاس یہ بھی ہے کہ لنگور کو پولیس نے گرفتار نہیں کیا بلکہ وہ اپنے چاروں پاؤں اور دم کے ساتھ چلتا ہوا خود لائن حاضر ہو گیا وہاں تھانیدار صاحب کرسی پر بیٹھے ہوں گے اور ان کے ساتھ اس کی کچھ اس قسم کی گفتگو ہوئی ہو گی ......

"جناب تھانیدار صاحب میں ایک مفرور ہوں مجھے گرفتار کریں ......"

"تو خواہ مخواہ گرفتار کر لیں ...... بھلا مجھے اور کوئی کام نہیں ...... ابھی ابھی صاحب کا آرڈر آیا ہے کہ ...... تمام دیگیں ڈرائیوروں کو انعام دیا جائے کہ ......"

"جناب میں بہت دور سے آیا ہوں مجھے گرفتار کر لیا جائے ......"

"اچھا ... تو تم ہو کون ؟"

"میں لنگور ہوں جی ......"

"اچھا کس کے لنگور ہو ؟"

"میں اپنا خود ہی لنگور ہوں جی ...... اور یہ دم بھی میری اپنی ہے"

"دیکھو لنگور بھائی جان ...... اب پتہ نہیں کہ قانون کے مطابق ہم آپ کو گرفتار کر بھی سکتے ہیں یا نہیں ...... اس کے لئے ذرا تفتیش کرنی ہو گی کیا پتہ آپ کسی اہم شخصیت کے کچھ لگتے ہوں تو پھر ......

"میں جی چڑیا گھر سے بھاگ کر آیا ہوں اور کسی اہم شخصیت کا کچھ نہیں لگتا ...... میرے بھی تو کچھ لنگوری حقوق ہیں جن کی ہر جگہ خلاف ورزی کی جا رہی ہے ...... مجھے گرفتار کیا جائے ......"

اس دوران ایک سپاہی لنگور کو غور سے دیکھتا ہے اور پھر تھانیدار کے کان میں کچھ کہتا ہے۔ تھانیدار کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں اور وہ اپنی پتلون سنبھالتا ہوا اپنی کرسی سے اٹھتا ہے اور دونوں ایڑیاں بمشکل جوڑ کر لنگور کو سلوٹ کرتا ہے ...... "سر مجھے معاف کر دیں"

" لنگور بیحد حیران ہوتا ہے کہ میں ایک عام اور سادہ سا لنگور ہونے کی بجائے سر لنگور کیسے ہو گیا ...... تھانیدار ابھی تک سلوٹ کی حالت میں ہے اور دوسرے ہاتھ سے پسینہ پونچھتا جاتا ہے۔ اسی دوران ایک سپاہی آتا ہے اور تھانیدار کے کان میں کچھ کہتا ہے ...... تھانیدار صاحب ایک گہری اور غصیلی سانس لیتے ہیں اور دھڑام سے کرسی پر گر جاتے ہیں۔ پھر میز پر مکا مار کر کہتے ہیں ...... "او ئے تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا لنگور کے بچے ؟"

"کیا نہیں بتایا ؟" لنگور لرز کر کہتا ہے۔

"یہی کہ تم پیر پگارو کے لنگور نہیں ......"

"جی میں تو چڑیا گھر کا لنگور ہوں ......"

"خواہ مخواہ تراہ نکال دیا ہے لنگور کی اولاد نے..... تھانیدار گرجتا ہے۔" چلو اوئے گرفتار کرلو اس..... لنگور زادے کو...."

اس حکم پر سپاہی آگے آتے ہیں اور لنگور کی دم قابو کرکے اُسے گرفتار کر لیتے ہیں - یہ لنگور اب تک آخری خبریں آنے تک واپس چڑیا گھر پہنچ چکا ہوگا..... میں بھی واپس پہنچ چکا ہوں اور ہاں لنگور کی شان میں ایک مختصر آزاد نظم .....

"میں بھی اک لنگور ہوں .....

"تو بھی اک لنگور ہے.....

میرا کیا قصور ہے......

تیرا کیا قصور ہے؟